پانی مر رہا ہے
آمنہ مفتی

"پانی مر رہا ہے"

آمنہ مفتی

الفیصل
ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

(۱)

بھوریوں والی زمین سے جنگلی بلا باہر نکلا، اگلے پنجے ویران بھبھل میں گاڑے، کمر کو کمان کیا، زبان باہر نکال کے لمبی سی جمائی لی۔ سڑک دور دور تک خالی تھی۔ آسمان پہ مٹی کی یہ موٹی بھوری تہہ جمی ہوئی تھی اور کھیتوں میں دھان کی اگیتی پنیری اُگ رہی تھی۔ اس بار ایسی گرمی پڑی تھی کہ انسان، جانور، چرندے، پرندے سب زبانیں نکالے ہانپ رہے تھے۔ دھوپ نکلتی تھی تو اتنی بے حیا کہ ابھی صبح ہی ہوتی تھی مگر دھوپ کا جوبن، مخاردوپہر کو مات کرتا تھا۔

بلا تھوڑی دیر بے مقصد ہی سڑک پہ کھڑا رہا۔ یوں بھی اس کی زندگی کا مقصد گندی پلی، بدذائقہ چھچھوندریں، چوہے اور لالا ئیکنیں کھا کے کسی سایے میں اونگھنے کے سوا تھا ہی کیا؟ بہت تیر مارتا تو کسی اپنے جیسی جھبری، نوکیلے کانوں والی بلی پہ عاشق ہو جاتا اور مرنے سے پہلے ایک جھول چتکبرے بچوں کا اپنے پیچھے چھوڑ جاتا جو اس فانی دنیا میں اس کے ہونے کا تسلسل برقرار رکھتے۔

سڑک ویران تھی کیونکہ اس طرف والے سب کلوں میں پنیری لگ چکی تھی۔ نہری پانی کے کھالوں کے کنارے، بٹیر اور بگلے اپنی لمبی لمبی ٹانگیں جھلاتے پھر رہے تھے، جن میں بہتی ننھی منی مچھلیاں من وسلویٰ کی صورت ان کا بھوجن بننے کو چلی آتی تھیں۔

بلے نے اپنی نندرائی ہوئی آنکھوں سے دور سڑک پہ اڑتے غبار کو دیکھا اور کسی نامعلوم ارتعاش نے ایک لحظے کے لیے اسے ایسا جھنجھوڑا کہ وہ گھریلو بلی کی طرح 'کھیں' کر کے پشم کی بھاری گیند کی صورت پھول گیا اور زقند بھر کے بھوریوں پہ اگی کوڑتومبے کی بیلوں اور اکانہہ کی جھاڑیوں کے پیچھے اپنی کمین گاہ میں جا چھپا۔

نئی جاپانی کار جب اپنے پیچھے دھول کا جسیم بادل چھوڑتی گزری تو بلے کو لگا، اس کی نو زندگیوں میں سے ایک تو ابھی ختم ہو گئی ہے اور باقی ماندہ آٹھ بھی خطرے میں ہیں۔ وہ خوف سے اصلی باگڑ بلا بنا اور اکانہہ کے مڈھ میں دبک گیا۔

میاں اللہ یار کا ڈیرہ، کسی زمیندار کا روایتی ڈیرہ نہیں تھا، جہاں لال پایوں والے پلنگ بچھے ہوں اور سر کی کے مونڈھوں پہ طرے والی پگڑیاں لپیٹے جیالے زمیندار بیٹھے، اپنی معشوقاؤں اور شکار میں مارے گئے جانوروں کا ذکر

کرتے ہوں۔ یہ تو ایک بڑا دو نمبر سا، سستا سا ڈیرہ تھا۔ اکھڑی احاطہ دیوار تک کچا صحن، جس میں جگہ جگہ مرغیوں کی بیٹوں اور سبزی کے چھلکوں کی گلکاری تھی۔

مکان کی عمارت بھی معمولی زرد رنگ میں رنگی ہوئی تھی، نیچی چھت کا برآمدہ، پیچھے دالان اور اس کے پیچھے کوٹھڑیاں جو صحن کی نسبت اتنی نیچی تھیں کہ چھ سیڑھیاں اتر کے کہیں پیر فرش کو لگتے تھے اور ان کوٹھڑیوں میں فرش پہ ریت کی موٹی تہہ بچھا کر اس کے اوپر پرالی کی موٹی تہہ جمائی جاتی تھی۔ اس پرالی پر اینٹیں رکھ کر، پلنگڑیاں اور صندوق، جوڑے جاتے تھے۔ جن میں، چھینٹ کے لحاف اور سوت کے مجنوں رکھے ہوئے تھے۔

روشندانوں میں چڑیلیں اور ابابیلیں رہتی تھیں اور مکان کی بنیادوں میں گھونسیں اور کالے ناگ رہتے تھے، جو چاندنی راتوں میں سڑک کی بھسل میں لوٹ لوٹ کر 'ناگن اور نگینہ' کا رقص کرتے تھے۔ مکان کے پچھلے صحن میں شہتوتوں کے پیڑ تھے اور ٹاہلی کے اونچے درخت، جن پہ لگی زرد پھلیاں، گرم خشک ہوا میں چھن چھن بولا کرتی تھیں۔

جاپانی کار دروازے پہ آ کے رکی تو میاں اللہ یار، جو دھوتی کا لانگڑ کسے، ایک گھنی کوٹھڑی میں اوندھے لیٹے کمر اور کندھے دبوا رہے تھے جنگلی بلے کی طرح 'خیں' کر کے اٹھے اور باہر کو لپکے۔

بند کمروں اور کوٹھڑیوں کے دروازے کھلے اور میاں اللہ یار کی پہلی بیوی کے آدھی درجن لڑکے، ان کی بیویاں اور آل اولاد، ٹاہلی کی پھلیوں کی طرح چھنچھناتے ہوئے باہر نکلے۔

احاطے میں چگتی ہوئی مرغیاں، گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر ہو گئیں اور لالی تو ایسا ڈری کہ اڑ کے شہ نشین پہ جا بیٹھی، جہاں سے اسے بڑی مشکلوں سے اتارا گیا۔ گاڑی سے اترنے والا نہ کوئی شہری بابو تھا نہ اجنبی مہمان۔ وہ تو اپنا اسرار باؤ تھا، جسے سب نے مشترکہ فیصلے کے تحت، قانون پڑھنے بھیجا تھا۔ باوجودیکہ، ڈیرہ ہذا کوئی، دبنگ، عالی شان، دل دہلا دینے والا ڈیرہ نہیں تھا مگر پھر بھی مکان کی شہ نشین پہ کھڑے ہو کے نظر ڈالیں تو زمین کے تھال میں، تا حدِ نظر جو سبز اور سنہری کھیت، کھالوں کے نقرئی اور نسواری، حاشیوں سے سجے ہوئے نظر آتے ہیں، سب میاں اللہ یار کی ملکیت تھے۔ اور ملکیت کی بات تو یہ ہے کہ پھر جھگڑا، کھڑاگ، مقدمہ، کچہری، تھانہ، ڈانگ سوٹا، سب چلتا ہے، چنانچہ میاں اللہ یار نے اپنے سب سے لاڈلے سپوت کو وکیل بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔

اسرار سے پہلے، بڑے پہلی بیوی کے چھ کے چھ لڑکے، کن بڑاؤ اور پھسڈی تھے۔ انہیں اپنی ننھی منی زمینداری میں غلیل لے کر گھومنا، آتی جاتی رعیت کی لڑکیوں سے آنکھ مٹکا کرنا اور راتوں کو کچے ٹھرے کے گلاس پی کے شہتوتوں کے نیچے بیٹھ کر بلا وجہ ہنسنا زیادہ پسند تھا۔ پڑھنا پڑھانا تو، سکول ماسٹروں اور پٹواریوں کے بچوں کا کام تھا، چنانچہ اسرار جو کہ اللہ یار کی دوسری اور مرحوم بیوی کی واحد اولاد تھی، سترہ سال کی عمر میں ہاسٹل بھیج دیا گیا۔ مسمی اسرار وہاں جماعتوں پہ جماعتیں پاس کرتے گئے اور اتنے پڑھاکو ہو گئے کہ چھٹیوں میں بھی گھر نہ آتے بلکہ وہیں ہاسٹل میں بڑے بڑے نامی گرامی وکیلوں سے ٹیوشن لیتے۔ میاں اللہ یار اپنے ہونہار سپوت سے اتنی اُمیدیں لگائے ہوئے تھے کہ آج اچانک اسے اپنے سامنے اس حال میں دیکھ کر ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ گردن کے مہروں میں

سے چنک چنک کی آوازیں نکلیں اور پسینہ دھاروں کی صورت میں جسم پہ بہنے لگا۔

سیاہ کار سے نکلنے والا شخص اسرار نہیں تھا۔ کار تو وہی تھی، ساہیوال نسل کی دودھیل بھینس کی چمکدار کھال کے رنگ کی سیاہ کالی کار، جس کے سب کنارے، کونے اور نوکیں، ہوا کی مزاحمت کو کم کرنے کے لئے ایک لٹو کی طرح چکنے اور پھر کنے بنا دئے گئے تھے۔ اور جس کی ہیڈ لائیٹس ایسی چکیلی اور اتنی ترچھی تھیں کہ میاں اللہ یار کو بے ساختہ، کمو نائین کی نشیلی آنکھیں یاد آ جاتی تھیں۔

اور یہ ہی وہ کار تھی، جسے اسرار کو لانے کے بعد، ان کو یقین کامل ہو گیا تھا کہ اب ان کا بیٹا کالا کوٹ پہن کے سنہری فاؤنٹین پن، جیب میں لگا کے پکا پکا وکیل بن جائے گا۔ مگر، کار سے نکلنے والا اسرار، ایک عجیب پر اسرار، اسرار نظر آ رہا تھا۔ سر پہ لمبی لمبی جٹائیں، جو بالوں میں قدرتی کنڈل ہونے کی وجہ سے میڈوسا کی سپنولیا صفت لٹوں کی طرح بل کھا کھا جا رہی تھیں۔ بر میں بسنتی کرتا، جس پہ گیروے رنگ سے ہاتھی، سانپ، ترشول اور دیگر بہت سے نامانوس نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ میاں اللہ یار جاہل سہی، انگوٹھا چھاپ سہی، مگر اتنا تو کسی بھی عقل کے اندھے کو نظر آ رہا تھا کہ یہ کرتا، نہ صرف، باؤ اسرار، بلکہ دیگر جملہ اہلِ خانہ کے ایمان کے لئے بھی زبردست خطرہ ہے۔

سب لوگوں کی نظریں اسرار کے کرتے اور زلفوں میں ایسی الجھیں کہ کسی نے ابھی اس کے گلے میں پڑے مٹھا بھر تعویذوں کی طرف نظر ہی نہ کی۔ سارا گھر دھم کھڑا تھا۔ پھر میاں اللہ یار کا لڑکا جو ایک آنکھ سے کانا مگر بڑا ہی سیانا تھا، زور سے کھنکھارا۔

''اوفو جاں آئیاں، اسرار آیا، واہ جی واہ، موج ہو گئی، لو بئی بجیو! چاچا جی آ گئے، چاچا وکیل۔''

اور آگے بڑھ کے اسرار کے شرمناک کرتے والے جثے کو گلے لگا لیا۔

(۲)

دن بڑی جلدی ڈھل گیا۔ اسرار کو اپنے کمرے میں جانے کی جلدی تھی اور میاں اللہ یار کو اس سے بھی زیادہ جلدی تھی۔ کار سے اڑنے والی دھول ابھی گاؤں کی گلیوں میں غبار بن کے چھائی ہوئی تھی، مگر میاں اللہ یار نے اسرار کو اس کے کمرے میں آرام کرنے بھیج دیا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا بڑی بہو کی آنکھوں پہ کھوپے چڑھا دیں یا اسرار کو گھنی کوٹھڑی کے سب سے نچلے صندوق میں لپیٹ لپاٹ کر دبا دیں۔

اسرار کے استقبال کو باہر نکلے بچے، ماں باپ سے بے بہرہ ہو کے گلیوں میں نکل گئے اور بہوئیں، جمائیاں لیتی ہوئی، واپس اپنے نیم تاریک کمروں کے کسے کسائے پلنگوں پہ لیٹ کر دیور کے حلیے پہ غور کرتی کرتی اونگھ گئیں۔

میاں اللہ یار وہیں صحن میں پلنگ ڈلوا کر بیٹھ گئے، ماتھے پہ شکن تھی۔ کمو، حقہ تازہ کر کے لائی مگر آج لگ رہا تھا خوشبودار تمباکو میں کسی نے اپلے کوٹ کر ملا دیے ہوں اور حقے کی نے میں گھونس کی بدبو ٹھہر گئی ہو۔

محمد امین عرف کانا بیٹا جو باپ کا مزاج آشنا تھا، وہیں بیٹھ گیا۔ تفکر کا بھاری گدھ جو میاں اللہ یار کے کلیجے میں پنجے گاڑے پڑا تھا، بیٹے کے سینے پہ بھی چڑھا آ رہا تھا۔ ذرا دیر کی بات تھی، سارا گاؤں آس پاس کے لوگ، برادری، کامے، شریکے، سب جمع ہو جائیں گے، پھر کیا ہوگا؟

"ابا جی! یہ اسرار کو کیا ہوا ہے؟" بیٹے نے ڈرتے ڈرتے باپ سے پوچھا جیسے یہ سب ان کا کیا دھرا ہوا۔ "میں بھی سوچ رہا ہوں، کہ بھئی آیا، سلام کیا، گلے لگا اور کہنے لگا کہ میں آرام کروں گا، بڑا آدمی جو ہو گیا ہے، ہم ٹھہرے سیدھے سادھے دیہاتی لوگ۔"

میاں اللہ یار نے حقے کی نے پرے کرتے ہوئے بالکل غیر متوقع جواب دیا۔ بیٹا چونکا، سامنے چگتی، لالی، کار کے ٹائر کے پاس پڑے دانے تک پہنچی اور پھر نہ جانے کیا سمجھ کے زور سے کڑکڑائی اور پر جھاڑتی ہوئی، میاں اللہ یار کے پلنگ کے نیچے چھپ گئی۔

"میرا مطلب ہے ابا جی، یہ بال اور کپڑے؟ ایسے کپڑے تو ادھر جو سانپ پکڑنے کے لئے جوگی آتے ہیں انہوں نے پہنے ہوتے ہیں۔"

''اوئے پاگل خانے ابھی مجھے کیا پتا؟ یہ فیشن ہے، نیا فیشن۔ میں نے کل ٹی وی پہ دیکھا تھا ایسے ہی ایک موٹا سا بندہ، ایسا ہی کرتا پہنے گانا گا رہا تھا۔''

میاں اللہ یار کا دیہاتی ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ بینا لاکھ سمجھدار سہی لیکن تھا تو اسرار کا سوتیلا بھائی۔ اگر وہ اس کے سامنے، اسرار کی بات کرتے تو یہ ایک گری ہوئی بات ہوتی۔ یعنی ان کا منتخب فرزند، جس پہ پیسہ پانی کی طرح لٹایا گیا، وہ سپوت کپوت ہو گیا تھا اور ایسا واہیات لباس پہن کے لمبے لمبے بال جھلاتا ان کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ جیسے ان کی ناانصافیوں کا بھوت جو انہوں نے دانستہ یا نادانستہ اپنی پہلی بیوی کے بچوں سے روا رکھی تھیں۔

''تو ابا جی! کہیں۔۔۔۔ اپنا اسرار گانے والا تو نہیں بن گیا؟'' کانے بینے کی اکلوتی آنکھ میں فہم و دانش کی اتنی چمک تھی کہ میاں اللہ یار کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں اور دھوئیں کا بڑا سا گولا ان کے نرخرے میں ایسا پھنسا کہ انہیں لگا کہ اب دوسرا سانس نہیں آئے گا۔ کھانستے، کھانستے، بے حال ہو گئے۔ بینے نے بہتیری پیٹھ ٹھونکی، تالو دبایا، سینہ سہلایا مگر اچھو کسی طرح ٹلتا ہی نہیں تھا۔ کمو نائین گڑ کی بھیلی لے کر دوڑی، بینے کی ماں خاتون اول، جنت بی بی، اپنے بوڑھے گھٹنے چٹخاتی، شہد اور کالی مرچ لے کر آئی۔ تب کہیں جا کے اچھو ٹھیک ہوا۔

میاں اللہ یار نے اچھو رکنے پہ دو بڑی بڑی ڈکاریں لیں اور چھنگلی سے آنکھ میں آیا پانی پونچھا۔ ساتھ ساتھ انکھیوں سے، جنت بی بی کے چہرے کا بھی بغور جائزہ لیا کہیں انہیں سوتیلے بیٹے کی ہیئت کذائی سے کسی طرح کا قلبی اطمینان تو حاصل نہیں ہوا؟

مگر جنت بی بی کے آبنوسی چہرے پہ ہمیشہ کی طرح کوئی تاثر نہ تھا۔ ناک کے دونوں نتھنوں کے درمیان گھنگھروؤں والی بالی، اونٹ کی نکیل کی طرح لٹکی ہوئی تھی اور موٹے موٹے ہونٹوں پہ چپ کا وہی ناگ کنڈل مارے پڑا تھا جو سالوں سے وہاں براجمان تھا۔ مکان کی بنیادوں میں رہنے والے کوڑیالے سانپوں کی طرح۔ نہ تو وہ سوتن کے آنے پہ روئی اور نہ اس کے مرنے پہ ہنسی۔ اسرار کے کاندھوں پر میڈوسا کا کاسۂ سر اس نے بھی دیکھا تھا بلکہ بڑھ کر ان قاتل لٹوں کو بوسہ بھی دیا تھا۔ اس کے سخت کافر کرتے کے باوجود گلے بھی لگایا تھا۔ مگر اس کے چہرے پہ کسی تاثر کی کوئی تتلی، بھنبھیری کہیں اڑتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

''گھنی، ماں کی۔۔۔'' میاں اللہ یار نے دل ہی دل میں جنت بی بی کو موٹی سی گالی بکی اور دھوتی کا پلو اٹھا کر ٹانگ کھجانے لگے۔

بینا کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن ذرا دیر پہلے بپا ہونے والی پلمونری ایکٹویٹی نے سب کو وقتی طور پہ شل کر دیا تھا۔ ماسوائے میاں اللہ یار کے جو دھیرے دھیرے اپنی ران کھجا رہے تھے اور ان کا دماغ بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔

(۳)

شام ہونے سے پہلے مینے کی بیوی شاماں نے دیور کے لئے صاف ستھرا واش اینڈ ویئر کا جوڑا نکالا اور میاں کی ہلاشیری پہ پردیسی دیور کے کمرے میں چلی آئی۔ شاماں، دیہات کی عام معمولی لڑکی نہیں تھی۔ شاملات دیہہ (جسے کثرت استعمال کے باعث لوگ شاملاٹ کہتے تھے) کے آس پاس کئی آبادیوں میں اس کے جوڑ کی زنانی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ شائد کسی جینیٹک میوٹیشن سے وہ ایک درمیانے درجے کے زمیندار کے گھر پیدا ہوگئی تھی۔ گوری، اونچی، لمبی، آنکھیں جیسے آم کی پھانک اور بال جیسے ساون کی امنڈتی گھٹائیں جو آملے کے جھنڈوں پہ جھکی کھڑی ہوں۔

شکل وصورت کی تو خیر ایسی کوئی بات نہیں، شاماں کو خدا نے جرأت اور ذہانت، جی بھر کے دی تھی۔ جب برادری میں اس کے جوڑ کا لڑکا نہ ملنے کی وجہ سے ابے نے فیصلہ کیا کہ شاماں کو کنوار کوٹھا آباد کرنا ہے تو اس نے اپنی زندگی کا راستہ خود ہی چن لیا۔

میاں اللہ یار، ان دنوں شاملات دیہہ میں کچھ لاٹوں پہ قابض تھا۔ اور پھر قبضے قائم رکھنے کے لے معمولی قسم کی بدمعاشیاں، مثلاً ہوائی فائرنگ، بڑھکیں اور ناکہن لوگوں پہ چوری کے پرچے کرا کے ان کی چھترول کرانا وغیرہ اس کا معمول تھا۔ اپنی ان گوناگوں صفات کے باعث آس پاس کے علاقوں میں اس کی ٹھیک ٹھاک دہشت قائم ہو چکی تھی۔ اپنی کھلی جیپ میں جب وہ اپنے چھ جوان ہوتے، لڑکوں کے ساتھ نکلتا تو ان کے ہتھیاروں اور جوان خون سے چمکتے چہروں کی ڈلک راہ چلتوں کی آنکھیں خیرہ کر دیتی تھیں۔

راتوں کو جب ساری عورتیں کھیلنے کے بہانے سے باہر بیٹھنے جاتی تھیں اور کماد کے کھیتوں کے کناروں یا دھان کے پھڑوں پہ اکٹھی ہو کر ''یوسف زلیخا'' کھیلتی تھیں، تو گفتگو موڑ مڑتی مڑاتی میاں اللہ یار پہ آرکتی تھی۔ میاں اللہ یار، جو بڑا جیالا تھا، جس کے چھ جوان لڑکے تھے اور دوسری جنگِ عظیم کی متروکہ جیپ تھی۔ لڑکیاں بالیاں، ایک دوسری کی پسلیوں میں انگلیاں کھبوتیں اور طعنے دیتیں، ''تجھے تو اللہ یار اٹھا کر لے جائے گا چھ منڈوں کا باپ''۔ دوسری جوابی چٹکی توڑتی، ''اور تجھے تو جیسے چھوڑ جائے گا ناں؟ روز اس کی لاٹ سے گھاس کاٹ کے لاتی ہے۔''

شاماں سے ایسے مذاق کرنے کی جرأت کون کرتا؟ اس کے مستقبل کا فیصلہ تو ہو چکا تھا۔ مگر شاماں اندر ہی اندر ولور کی بیل کی طرح بل کھاتی اور میاں اللہ یار کی لاتوں میں اگے خاردار کیکروں سے لپٹتی جاتی۔

چاندنی راتوں میں اللہ یار اپنے ڈیرے میں محفل جما تا اور، میراثیوں کی موج ہو جاتی۔ ایک ایسی ہی رات، جب میاں اللہ یار، سب لوگوں کو رخصت کر کے اندر سونے جا رہا تھا تو کسی نے بڑے زور سے ٹین کے حرمئی گیٹ پہ دستک دی۔ سارا گیٹ لرز گیا۔ ساتھ ہی ساتھ اللہ یار بھی۔ لونڈوں کو ساتھ لے کر غنڈہ گردی کرنا اور بات ہے مگر آدھی رات کو جب چاند عین آسمان کے درمیان جگمگا رہا ہو اور ہوا میں بکائن کے پھولوں کی نشہ آور خوشبو پھیلی ہوئی ہو، اس لمحے ایک اجنبی دستک کو سن کر نارمل رہنا دوسری بات۔ دروازے پہ شاماں تھی۔ مردوں کی طرح ان جھک، بے خوف، اللہ یار نے اس کی بڑی منت سماجت کی، لال پایوں کے پلنگ پہ بٹھا کے بتیرے پیر پکڑے، اپنی پگڑی اس کے پیروں میں ڈالی، بڑا گڑگڑایا کہ جن قدموں پہ آئی ہے، ان ہی پہ لوٹ جا۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا، چغل خور سورج ابھی بڑی دور ہے، ابھی لوٹ جا۔

مگر شاماں پتھر کے تھم کی طرح وہیں گڑ گئی۔ جنت بی بی اپنے گونا گے گھکھرے کی پروا نہ کرتے ہوئے، ڈیرے کے کچے برآمدے میں آ بیٹھی۔ دونوں عورتوں میں جانے کیا مسکوٹ ہوئی کہ اگلے دن سارے گاؤں میں خبر اڑ گئی کہ شاماں کانے مینے کے ساتھ بھاگ آئی ہے۔ مینا جو ابھی سترہ اٹھارہ سال کا پچھیرا سا لڑکا تھا، اس اعزاز پہ ایسا دڑ بڑایا کہ اپنی عمر کی حدیں پھلانگ کے گاؤں کے بڑے بوڑھوں کی صف میں سب سے آگے جا کھڑا ہوا۔

پنچائت میں اس نے شاماں کے فرار کے حق میں اتنے مضبوط دلائل دیئے کہ ایک دفعہ تو بڑے بوڑھوں نے بھی انگلی منہ میں ڈال لی۔ شاماں اور مینے کا نکاح کرا دیا گیا۔ شاماں کے گھر والے اس ہتک کو بھول گئے اور مینے کے خاندان کو اپنی برادری کی طرح سمجھنے لگے۔ مینے کی باتیں گاؤں کی گلیوں اور چوپالوں میں دہرائی جانے لگیں۔ مگر ایک شخص تھا جو اس ہتک کو برداشت نہ کر سکا، میاں اللہ یار۔

جنت بی بی نے ایسا کون سا بس گھولا تھا کہ شاماں جو خود بھاگ کے اس کے پاس آئی تھی، مینے جیسے مینکے کے پیچھے لگ گئی؟ غصے کا کالا ناگ، ان کے وجود کی بنیادوں سے نکلتا اور کلیجے پہ لوٹنے لگتا۔ شاماں، لال چنی کا داجی سا گھونگھٹ کاڑھے، بالوں کے گچھے نمایاں کئے، مینے کے لئے، لسی کا گلاس لے کے اندر جاتی تو یہ ناگ اپنا پھن کاڑھے سامنے آ جاتا۔ اسے لگتا شاماں ان کے بڑھاپے اور مینے کی منہ زوری کا اعلان ہے اور اس اعلان کی تشہیر کنندہ جنت بی بی ہے۔

پھر انہوں نے جنت بی بی سے بدلہ لیا اور ایک سولہ سالہ خوبصورت لڑکی سے شادی کر لی جو شاماں سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ اتنی حسین کہ میاں اللہ یار خود بھی اسے دیکھ کر بس گھگھیا کر رہ گئے۔

لیکن بات یہ تھی کہ شاماں کے فرار نے اس کے وجود میں جو دلکشی اور اسرار پیدا کیا تھا وہ فضل بی بی کے معصوم حسن اور نو عمری سے کہیں بھاری تھا۔ جب اسرار پیدا ہوا تو میاں اللہ یار کی گردن فخر سے اتنی تن گئی کہ دور سے ان پہ

ایک اصیل مرغے کا گمان ہوتا تھا۔ شاماں اور امین ہنوز بے اولاد تھے۔

فضل بی بی بے چاری پریوں کے دیس سے آئی تھی وہیں سدھار گئی۔ چلہ پورا ہوا، چاندنی رات تھی۔ اسرار کے سوکھے پوتڑے اتارنے شہتوتوں والے صحن میں گئی اور اسے ایک سانپ نے ڈس لیا۔ وہ ناگ جو اللہ یار کے کلیجے سے رینگ کر جنت بی بی کے ہونٹوں پہ جا بیٹھا تھا، جیسے دوبارہ واپس آ گیا۔ میاں اللہ یار لنڈورے سے ہو گئے۔ چند دن کی ننھی سی جان کو شاماں نے ماں بن کے پالا۔ مگر جوں ہی اسرار سکول جانے کے قابل ہوا، میاں اللہ یار نے ندیدے بچے کی طرح اسے شاماں سے چھین لیا۔ مگر شاماں اسی طرح آدھا گھونگھٹ الٹائے، اپنے کاموں میں لگی رہی۔ شائدا سے پانے اور کھونے اور پھر پا کے کھونے کا اسرار سمجھ آ گیا تھا جو اسرار سے بھی زیادہ سوہنا تھا۔

تو شاماں جب اسرار کے کمرے میں داخل ہوئی تو اسرار اپنے پلنگ پہ آدھا جیا، آدھا مرا، آدھا اوپر، آدھا نیچے، پڑا تھا۔ منہ کے کونے سے جھاگ بہہ رہی تھی۔ اسرار کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔

(۴)

مکان میں اور احاطے کے باہر، کھیتوں سے پرے دور دور تک کہرام مچ گیا۔ کھیتوں میں دور حدِّ سماعت تک کوکیں گونجنے لگیں۔ ہو، ہو، ہلا، ہلا، سایوں میں سوئے ہوئے کتے گھبرا گھبرا کے بھونکنے لگے۔ ٹیوب ویلوں پہ نہاتے مرد، آدھے ننگے، آدھے ڈھکے، گیلے پیروں میں مٹی کچکچاتے، میاں اللہ یار کے گھر کی طرف دوڑے۔ جن لوگوں کو اسرار کی آمد کی خبر نہیں ملی تھی، انہیں بھی علم ہو گیا کہ اسرار کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔

نیم اندھیرے کمرے میں شاماں نے جب اپنے دیور کو زہر کے اثر میں بے ہوش پڑے پایا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ اپنی ساری ذہانت اور جرأت بھول گئی اور دروازے میں کھڑی ہو کے دونوں ہاتھوں سے کلیجہ پیٹنے اور بین کرنے لگی۔

سب سے پہلے میاں اللہ یار جائے حادثہ پر پہنچے۔ شاماں راستہ روکے، بغیر دوپٹے کے کھڑی دوہتڑوں سے اپنا کلیجہ کوٹ رہی تھی۔ سامنے پلنگ پہ اسرار بے ہوش پڑا تھا اور میاں اللہ یار کو لگا، شاماں وہ ناگن ہے جو مکان کی بنیادوں میں کئی سو سال سے رہ رہی ہے اور آج پھر اس کے لاڈلے کو ڈس کے یہاں کھڑی جھوم رہی ہے۔

"ہٹ جا، راستہ چھوڑ، جا، پیاز کا عرق نکال کر لا۔" انہوں نے ڈرتے ڈرتے اس کے کاندھے کو چھوا۔ شاماں تڑپ کر بھنڈار کی طرف دوڑی۔

میاں اللہ یار آگے بڑھے۔ اسرار کے گال تھپتھپائے، گھبرا کے جسم ٹٹولا، مگر ہاتھ پاؤں صاف تھے، سانپ نے کہاں کاٹا تھا؟

ذرا ہی دیر میں کمرہ لوگوں سے بھر گیا۔ سب اونچی آوازوں میں بول رہے تھے، سانپ ڈھونڈھ رہے تھے، سانپ کے کاٹے کا نشان تلاش کر رہے تھے۔ مینا بھیڑ کو چیرتا ہوا اندر آیا۔

"اوہو ہو، کیا کر رہے ہو سارے؟ مر جائے گا یہ، اسپتال لے کر چلو سارے، چلو۔"

اجتماعی پاگل پن کا شکار سب لوگ جیسے ہوش میں آ گئے۔ اسرار کو تو تھمبو کر کے باہر لایا گیا۔ شاماں تانبے کے لمبے گلاس میں پیاز کا عرق نکال کر لائی تھی۔ جب تک امین سے چھوٹا محسن گاڑی سٹارٹ کرتا، چار ایک جی داروں

نے کسی نہ کسی طرح سارا عرق، بے ہوش اسرار کے حلق میں اتار دیا۔
گھبراہٹ کے مارے محسن سے کلچ چھوٹا جا رہا تھا اور پچھلے سیٹ پہ مینے کی گود میں رکھے اسرار کے چہرے کا رنگ جامنی پڑتا جا رہا تھا۔

ڈسٹرکٹ اسپتال کے برآمدے میں نیم گنجے ڈاکٹر صاحب دھوتی پہ بنیان پہنے ایک جھلنگا سی کھاٹ پہ آرام فرما رہے تھے۔ ان کا سرکاری کوارٹر پچھلے ساون میں ڈھے گیا تھا اور اب ان کی بیوی بچے اسپتال کے جنرل وارڈ میں رہتے تھے۔ نرسیں ان کی بیوی کے ساتھ مل کر کدو اور کریلے چھیلتیں اور سویٹروں میں نمونے ڈالا کرتی تھیں۔ قسمت کا مارا مریض جو یہاں آتا اسے آپریشن تھیٹر میں لٹا کر معائنہ کیا جاتا۔ مریض بے چارہ اپنے سر سے چند فٹ کے فاصلے پر لگے عجیب ہیئت کے بلبوں اور دیگر آلات سے اتنا دہشت زدہ ہوتا، جیسے بڑے بڑے سیاستدان اور صحافی شاہی قلعے کے ٹارچر سیل کو دیکھ کر ہوتے تھے۔ فوراً ہی بیماری سے مکر جاتا اور ڈاکٹر کی ایک ہی دوا سے بھلا چنگا ہونے کی نوید سنا کے آئندہ اس مذبح خانے میں جانے سے توبہ پکڑتا۔

شنید تھا کہ ڈاکٹر صاحب، اسپتال کے جمعداروں کے ساتھ مل کے پوسٹ مارٹم بھی یہیں کیا کرتے تھے۔ کیونکہ پوسٹ مارٹم کے لئے مخصوص کمرے میں ان کی بکریاں بندھا کرتی تھیں۔

اسرار کو آپریشن تھیٹر کے پھونسڑے نکلے سٹریچر پہ لٹایا گیا تو ڈاکٹر صاحب بھی ایک لمحے کو سناٹے میں آ گئے۔ اتنے حسین اتنے جوان آدمی کے پاس آتے موت کو ذرا حیا نہ آئی؟

اسرار اگر مرا نہیں تھا تو زندہ بھی نہیں تھا اور نہ ہی اس کے بچنے کی کوئی امید نظر آ رہی تھی۔ سٹیتھوسکوپ پہ مدھم پڑتی، ڈوبتی دھڑکنیں، ایسے سنائی دے رہی تھیں جیسے کسی بند کمرے سے گاہے گاہے ابھرتی کلاک کی مدھم ٹک ٹک۔ مگر اس آواز میں کلاک کا ردھم مفقود تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے مایوسی سے کانوں سے سٹیتھوسکوپ الگ کیا اور بڑی دلسوزی سے محسن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ محسن اشارہ سمجھ کے بھاں بھاں رونے لگا۔ امین ذرا دیر تو بھونچکا سا کھڑا رہا پھر ایک دم آگے بڑھا اور اسرار کے لحظہ لحظہ بے جان ہوتے وجود کو بازوؤں میں بھر کے باہر بھاگا۔

''چھنے! اوئے محسن، جلدی چل، بھوریوں والے ٹکلوں کی طرف، جلدی چل۔''

محسن اپنا رونا دھونا موقوف کر کے مینے کے پیچھے دوڑا۔

بھوریوں والے ٹکلوں کی داستان بھی عجیب ہے۔ میاں اللہ یار کا ڈیرہ، بلکہ ایک وہ ڈیرہ ہی کیا؟ سارا پنجاب دریاؤں کا میدان ہے۔ دریاؤں کی پھینکی ہوئی ریت، ٹوبے، ٹیلے، ٹبکریاں، ڈھکیاں، بے، ہر ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ تو یہ بھوریاں بھی دریائے بیاس کی پرانی گزرگاہ پہ، ایک دو سے ڈھائی ایکڑ چوڑا اور تقریباً اٹھارہ سے انیس کلومیٹر لمبا ریتلا ٹکڑا تھا۔ ان بھوریوں میں ایک خاص بات یہ تھی کہ بلندی سے دیکھنے پر یہ ریتلا سلسلہ ایک عظیم الجثہ ناگ دکھائی دیتا تھا جو کسی مستی میں لہرایا ہوا پڑا ہو۔

خودکا نے میبنے نے ماسٹر صاحب کے لڑکے کے ساتھ کوٹھے پہ چڑھ کے دوربین سے اس جناتی ناگ کو دیکھا تو جانے کس خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور جسم کے سارے مساموں سے پسینہ پانی کی طرح بہنے لگا۔

بہر طور بھوریوں والی زمین سالہا سال سے غیر آباد پڑی تھی۔ اس ریتلے سانپ کا آخری سرا، سرحد کے پار ستلج سے جا ملتا تھا۔ ساری زمین خودرو کانٹے دار جھاڑیوں اور کشیدہ قامت درختوں سے پٹی پڑی تھی۔ ریت میں پناہ لینے والی مخلوق اور ان کے شکاری جانور از قسم نیولے، باگڑ بلے، سؤر، گیدڑ اور خال خال بھیڑیئے، جھاؤ چوہے وغیرہ، یہاں بکثرت پائے جاتے تھے۔

ایک زمانے میں جب میاں اللہ یار کے ڈیرے میں شاماں اور فضل بی بی دونوں موجود تھیں تو جانے شاماں پہ رعب ڈالنے کے لئے یا فضل بی بی کے ساتھ ہونے کی خوشی اور جوش میں وہ ہر وقت کسی نہ کسی جھگڑے، فساد یا مقدمہ بازی میں ملوث ہونے کے لئے تیار رہتے تھے۔ انہیں دنوں اسرار پیدا ہوا تھا اور ان کے دل میں، ان بھوریوں کو کاشت کرنے کا نادر خیال آیا تھا۔ اور خیالوں کا تو یہ ہے کہ میاں اللہ یار جیسے آدمی کے دل میں ہوں تو فوراً حقیقت میں بدلنے کو بے چین ہو جاتے ہیں۔

اب دن رات میاں اللہ یار کے تصورات میں ایک ریتلے جسم والا ناگ، لہرایا پڑا رہتا۔ جس کے چمکتے ہوئے بدن پہ بڑے بڑے روسی ٹریکٹر اپنے آہنی ہل کھبوئے، گھیں گھیں کرتے ادھر سے ادھر پھرتے، ریت کی ٹالیاں بھر بھر کے بچھ جاتیں اور پھر اس ناگ کی ریتلی کینچلی کے نیچے سے اس کا جسم نمودار ہوتا۔ سوندھا، خوشبودار، جس پہ کوڑتوبے، جنگلی کیکروں، اکانہہ اور آک کے پودوں کی جگہ، امریکن نرمے اور ہالینڈ کی مکئی کے کھیت کے کھیت اگ رہے ہوتے اور ان کھیتوں میں وہ ایک مطلق العنان بادشاہ کی سی بے نیازی سے پھرتے۔

علاقے کے لوگوں نے اس زمین کے بارے میں عجیب و غریب روایات گھڑ لی تھیں اور سینہ بسینہ چلتی چلتی جب یہ میاں اللہ یار کے کانوں تک پہنچیں تو انہوں نے جملہ راویان کی اگلی پچھلی سات نسلوں کے بارے میں نہائت نادر افکار کا اظہار کیا اور ان کی ماں بہنوں کے ساتھ اپنے خفیہ تعلقات کے مختلف پہلوؤں پہ جی بھر کے روشنی ڈالی۔

اس رجز خوانی سے فراغت پاتے ہی انہوں نے پٹواری کو بلوایا اور اس زمین کی ملکیت کے بارے میں پوچھا۔

وہ لگا آئیں بائیں شائیں کرنے۔ جیسے جانتا تو سب کچھ ہو، مگر بتانا کچھ بھی نہ چاہتا ہو۔ کبھی کہتا یہ دریا کی گزرگاہ ہے، سرکاری زمین ہے۔ کبھی کہتا ہندوستان بھاگ جانے والے چودھری مول چند کی زمین ہے جو امر دہہ کے ایک آبادکار کے کلیم کے جواب میں دی گئی۔ آبادکار ایک دفعہ آیا، ریت اٹھا کر سونگھی، مسلم لیگ، نہرو، کانگریس اور قائدِ اعظم کی شان میں نازیبا کلمات کہتا ہوا ایسا گیا کہ آج تک نہ پلٹا۔

''تو لاوارث ہوئی؟'' میاں اللہ یار نے اعلان کیا۔ تس پہ اس مردک نے ایک پلٹا کھایا اور اپنی کرنجی آنکھوں کو سانپ کی آنکھ کے سے زیرے بنا کر بولا کہ سن ساٹھ کے معاہدے کے مطابق دریاؤں کی گزرگاہیں کبھی آباد نہیں کی جا سکتیں۔

میاں اللہ یار کو پٹواری پہ بڑا غصہ آیا۔ جی تو چاہتا تھا کہ پاؤں سے دیسی جوتا اتار کے ٹانٹ پہ اتنی جوتیاں لگوائی جائیں کہ سب کھتونیاں، کھیوٹ نمبر گڈ مڈ ہو جائیں۔ لیکن سمجھدار تھے، غصہ ضبط کر گئے۔ شام ہونے سے پہلے مینے کو ساتھ لیا اور اپنی جیپ لے کر بھوریوں کے معائنے کو چل دیئے۔

بھوریوں نے بہت سے لوگوں کے رقبوں کو دو دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ میاں اللہ یار کے چھیاسٹھ ایکڑ بھوریوں کے اس طرف تھے اور چوالیس ایکڑ اس طرف۔ درمیان میں کم و بیش، چھ ایکڑ کا ریتلا ٹکڑا اگر کسی طرح قابلِ کاشت بنا لیا جاتا تو یہ ایک خوبصورت ترین قطعۂ اراضی بن سکتا تھا۔

مینے کے ساتھ پہلے ایکڑ سے گزرتے ہوئے انہیں اپنی اور اپنے پرکھوں کی کم عقلی پہ بہت رونا آیا۔ کیا تھا اگر اس ریتلی زمین کو پہلے ہی قابلِ کاشت بنا لیا جاتا؟ اور اپنے اس پچھتاوے کا اظہار انہوں نے مینے سے بھی کر دیا۔ مینا خاموش رہا اور اپنے لال نری کے جوتے کو دیکھنے لگا جس پہ ریت کے باریک باریک ذرے چڑھتی دھوپ کی ٹھنڈی روشنی میں کبھی کبھی چمک سے جاتے تھے۔

"اگر ایسا ہے کہ آپ کے اور میرے بڑوں نے بھی ایسا نہیں کیا تو پھر ابا جی، اس میں کوئی بڑی حکمت ہی ہو گی ہمیں کیا ضرورت ہے وہ کام کرنے کی جو پہلے کسی نے نہ کیا ہو۔" گو مینے سے اس قسم کے جواب کی توقع کی جا سکتی تھی لیکن ایک ادھیڑ عمر زمیندار جس کے سات بیٹے بھی ہوں اور سب سے چھوٹے برخوردار کے عقیقے کو ابھی ایک ہفتہ ہی گزرا ہو، اس قسم کے جوابات کو خاطر میں نہیں لاتا۔ میاں اللہ یار کو بھی اپنے جوان بیٹے کے منہ سے اس قسم کا ٹھنڈا اور بزرگانہ جملہ سن کے بہت مایوسی ہوئی، انہوں نے لاپروائی سے ہاتھ چلایا۔

"اونہیں، اونہیں، ایسی کوئی جادوئی بات نہیں، جو تو مجھے اتنا چبا چبا کے بتا رہا ہے۔ بات ساری اتنی ہے کہ اس وقت ٹریکٹر نہیں تھے اور ٹریکٹر جب تک نہیں آئے تھے، زمیندار ٹنڈا تھا۔ کتنی جوڑیاں لگاتا ان ٹبوں کو سیدھا کرنے کے لئے؟ اور ٹوبے دیکھے ہیں؟ میرے، میرے جتنے تو گہرے ہیں۔ اتنی ریت کون کھینچتا؟ ورنہ عقل کی بات یہ ہی ہے کہ بھئی پاگلو! زمین دو حصے کر رکھی ہے کیوں؟"

مینا خاموش رہا اور میاں اللہ یار کو اس سے اسی قسم کی نفرت محسوس ہونے لگی جو شاماں اور اسے اکٹھا دیکھ کر ہوتی تھی۔ ٹھٹھا اڑانے والے انداز میں کنکھیوں سے اس کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر بولے، "تو نہ ڈر کا کا! تجھے تو کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ یہ ساری محنت میں کروں گا۔ مجھے معلوم ہے میرے بیٹے اپنی بیویوں کی عقلوں سے سوچتے ہیں اور عورت کی تو ذات ہی گندی ہے۔" یہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا سی گئی اور منہ میں جیسے کوئی کرکرا سا ذائقہ آ گیا ہو۔ انہوں نے نفرت سے ایک طرف تھوکا۔ کوڑ تومے کی بیلوں میں کچھ سن سے ہوا جیسے سارا ٹبہ چشمِ زدن میں ہل کے واپس آ گیا ہو لیکن ہوا کیا تھا دونوں میں سے کوئی نہ سمجھ سکا۔

"کچھ ہوا ہے، ہے ناں ابا جی؟" مینے نے ذرا سہمے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"سور کی ماں کا۔۔۔" انہوں نے حقارت سے ایک موٹی سی گالی بکی اور ریت میں پیر کھبوتے، اونچے نیچے

ٹبوں کو پھلانگتے مینے کے آگے آگے تیزی سے چلنے لگے۔ مینا ساتھ دینے کے لئے چل تو رہا تھا لیکن ہر قدم پہ رک کے پیچھے ضرور دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دور اور چلنے کے بعد میاں اللہ یار ذرا تھک سے گئے سانس تیز چلنے لگا اور شلوار کے پائینچوں کے اندر پسینے کی ننھی ننھی دھاریں چل پڑیں۔ میاں اللہ یار چاہتے تھے کہ کسی کیکر یا جنڈ کے نیچے رک کے ذرا سستا لیں لیکن ابھی ابھی مینے کے سامنے اپنی برتری کا جو زبانی دعویٰ وہ کر چکے تھے اس کے بعد یہ فرمائش بجائے خود ایک ہتک تھی، چنانچہ وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ مینا ان کے پیچھے ایک سدھے ہوئے جانور کی طرح پیروں پہ پیر رکھتا چلا آ رہا تھا۔ بھوریاں تھیں کہ کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہی تھیں۔ ایک کے بعد ایک ٹیلہ، چھوٹے چھوٹے پوکھر، جن میں گئی برسات کا پانی ابھی تک کھڑا تھا اور اس پانی میں خدا جانے کہاں سے عجیب وغریب مچھلیاں آ جاتی تھیں اور ان کو کھانے کے لئے نیل کنٹھ اور بگلے۔ مینا چلتے چلتے انہیں ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''ڈڈوؤں کے بچے ہیں۔ دور سے دیکھو تو لگتا ہے مچھلیاں ہیں۔'' مینا خاموش رہا، حالانکہ اسے ان ٹوبوں میں ایسی ایسی حسین مچھلی نظر آ رہی تھی کہ دنیا کی خوبصورت ترین کورل فش بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی مینا سوچتا تھا کہ کیا جو چیز ایک آدمی کو جیسی نظر آتی ہے دوسرے کو بھی ویسی ہی نظر آتی ہوگی؟ کموتائین کی سبز آنکھوں سے کیا اسے ہر طرف ہریالی نظر آتی ہوگی؟ اور حد تو یہ ہے کہ شادی کے بعد اس نے شاماں سے پہلا سوال بھی یہ ہی کیا تھا کہ اتنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے کیا چیزیں بڑی نظر آتی ہیں؟ شاماں ایک لمحے کو تو چکرائی تھی پھر اس کی بند آنکھ پہ انگلی رکھ کے بولی تھی۔ ''اگر تجھے اس آنکھ کے نہ ہونے پر بھی مجھ میں وہ بات نظر آ گئی جو تیرے ابے کو آدھے سفید سر کے ساتھ نہ نظر آئی تو پھر نظر کیا ہوئی؟''

مینا لاکھ سیانا سہی لیکن آدھی رات کو بکائن کے پھولوں کی نشہ آور خوشبو کے جلو میں کی جانے والی اتنی گہری باتیں ابھی اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں، سو آج بھی چپ چاپ چلتا رہا۔ ایک ذرا گہرے ٹوبے میں تو اس نے ایک ایسی مچھلی بھی دیکھی، جس کی مونچھیں تھیں اور ایک آنکھ پہ مینے کی آنکھ کی طرح سفیدی سی چڑھی ہوئی تھی اور یہ مچھلی ٹوبے کی کسی گہرائی سے لحہ بھر کو نکلی تھی اور باہر بیٹھے نیل کنٹھ کو دیکھ کر غڑاپ سے واپس چلی گئی تھی۔ پانی کا چھپاکا یقیناً میاں اللہ یار نے بھی سنا تھا کیونکہ تھکے ہوئے گھوڑے کی چال چلتے چلتے اس نے ایک ہنکارہ سا ابھرا تھا اور تضحیک آمیز انداز میں بڑبڑایا، ''ہنہہ! ڈڈوؤں کے بچے۔''

مینا چپ رہا تھا۔ چلتے چلتے اب وہ ایسی جگہ آ پہنچے تھے جہاں بھوریاں اپنی سب سے زیادہ چوڑائی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ کھیتوں کا جو حاشیہ ابھی تک انہیں ساتھ ساتھ نظر آ رہا تھا اب غائب ہو چکا تھا۔ دونوں طرف دور دور تک ریت تھی اور عجیب قسم کے نباتات۔ جو اصل میں تھے تو وہی جو ایسی زمینوں میں ہوتے ہیں لیکن شاید بہت عرصے سے یہاں کسی انسان نے قدم نہیں رکھا تھا (کیوں نہیں رکھا تھا؟ یہ بات مینے کے لئے بھی اتنی ہی محیر العقول تھی، جتنی آپ کے اور میرے لئے۔) اس لئے یہ پیڑ پودے، اپنی اقلیم میں ایستادہ قلعوں اور محلات کی طرح، پرشکوہ نظر آ رہے تھے۔

اکانہہ کے درخت اتنے گھنے اور ان کے تنے اتنے سیدھے تھے کہ دور سے چیڑ کے جھنڈ معلوم ہوتے تھے۔ مصیبت یہ تھی کہ مینے نے چیڑ کے درخت بھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے تھے ورنہ اس کے دل پہ اس قدر دہشت طاری نہ ہوتی۔ ٹاہلیوں کے درخت اتنے بڑھ گئے تھے کہ ان کی چوٹیاں، کہیں بادلوں میں چھپی معلوم ہوتی تھیں۔ گو بادل بہت دور تھے اور ان میں سمٹا، پہلی تاریخوں کا چاند، دن میں بھی دھندلا سا نظر آرہا تھا۔ دب کی جھاڑیاں اور ان میں کھلے دب کے وہ روپہلی پھول، جن سے لوگ پھول جھاڑو یں بناتے ہیں، ون کی جھاڑیوں کے غیر مختتم سلسلے اور ریت پہ اس وقت کہیں سایوں میں ستاتے جانوروں کے پیروں کے نشان اور ان نشانوں کو کاٹتی، رینگنے والے جانوروں کے جسموں کی رگڑ سے بنی جھریاں اور لکیریں۔ یہ سب اتنا حیرت انگیز اور اجنبی تھا کہ مینے سے کوئی سوال، کوئی جواب نہ کیا گیا۔

''کیا خیال ہے ابا جی، بہت سیر ہو گئی واپس نہ چلیں؟'' مینے نے آنکھوں میں ٹپکتے پسینے کو کندھے پہ رکھے انگوچھے سے پونچھا۔ لیکن مثل مشہور ہے کہ آنے والا آتا اپنی مرضی سے ہے، لیکن جاتا گھر والوں کی مرضی سے ہے اور ابھی گھر والوں کی مرضی نہیں تھی۔

اسے دب کی جھاڑیوں میں بیٹھے، پہلے مینے نے دیکھا یا میاں اللہ یار نے، دونوں نہیں بتا سکتے تھے۔ لیکن وہ وہاں تھا، شائد بہت پہلے سے یا شائد ان کی باتوں کی آواز سن کر اپنی کمین گاہ سے نکلا تھا۔ کالا سیاہ جسم اور باہر کو نکلی خمدار کچلیاں، جن میں سے داہنی کچلی کا سرا ٹوٹا ہوا تھا۔ جانے اسے میاں اللہ یار کے پسینے سے اٹھتی، بارودی بو، بری لگی تھی یا وہ اپنے گھر کے اتنے قریب ان دو اجنبی انسانوں کو دیکھ کر اتنا برافروختہ ہوا تھا کہ اس کے پورے جسم پر بال تیروں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے اور اس سے پہلے کہ میاں اللہ یار اور مینا اس کے عزائم کا کچھ اندازہ لگا سکتے، جنگلی سؤر نے سر نیچے جھکایا اور اگلے کھروں سے مٹی پیچھے اچھالی اور چشم زدن میں میاں اللہ یار کے پہلو کو چیرتا ہوا دب کے جھنڈ میں جا گھسا۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر دوسرا حملہ کرتا، جیسے کسی غیبی ہاتھ نے میاں اللہ یار اور بت بنے مینے کو جنڈ کے جھنڈ میں گھسیٹ لیا۔ سؤر اپنی جھونک میں آگے نکل گیا۔

اب یہ بتانا کہ میاں اللہ یار کے پہلو سے خون کی تللیاں جاری ہو گئیں اور مینے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے وغیرہ تو یہ فضول تفصیلات ہوں گی۔ جن میں جائے بغیر میں آپ کو بتا دوں کہ ان کو بچانے والا ان کے زخم پہ کس کے ہاتھ رکھے رکھے انہیں اپنی کٹی میں لے گیا۔ جانے وہ کٹیا تھی یا مینے کو وہم ہی ہوا تھا؟ جنڈ کے پستہ قامت درختوں کا ایک مختصر سا جھنڈ جو شائد دو سے تین کنال کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس جھاڑ کو غالباً قدرت کے ہاتھ نے اس صفائی سے ایسی شکل دے دی تھی کہ اس جھنڈ کے اندر ہی اندر بیئے کے گھر کی طرح ایک خوب کشادہ انسانی رہائش گاہ بن گئی تھی۔ جس میں کمروں سے ملحقہ بیت الخلاء تو نہیں تھے البتہ ایک دوسرے کو علیحدہ کرتی ہوئی شاخوں کی دیواریں سی بن گئی تھیں اور ہر خانہ ایک الگ کمرہ تھا۔ ان کمروں کے درمیان راہداریاں، صحنچیاں اور ایک ننھا سا برساتی پانی کا تالاب بھی تھا۔ اس تالاب میں شائد مینے کا وہم تھا یا واقعی دریائی جھینگوں کا ایک جھلر، تیرتا پھر رہا تھا اور خدا جانے اروی

یا سنگھاڑے کے ہرے ہرے پتوں نے تالاب کو آدھا چھپا رکھا تھا۔ جنڈ کی کسی کسی جھاڑی کے ساتھ گکر ونڈے اور ون ایسے الجھ کر اُگے تھے کہ ان کمروں، صحنچوں اور راہداریوں میں گکر ونڈے، ون اور لسوڑے کے پھل قمقموں کی طرح جگہ جگہ چمک رہے تھے۔

مینا اپنی اکلوتی آنکھ کھولے اس جہانِ حیرت کو تک رہا تھا اور اس کے دل میں بجا طور پر یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ دونوں آنکھیں رکھنے والوں کو یہ سب کس قدر خوش نما محسوس ہوتا ہوگا۔ اس دوران دو ایک بار میاں اللہ یار کے کراہنے کی ہلکی سی آواز بھی آئی لیکن مینا اس جادو گھر کو دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ اس نے اس آواز پر کان نہ دھرے۔ چونکا وہ اس وقت جب اسے یہاں گھومتے گھماتے بڑی دیر ہوگئی اور میاں اللہ یار نظر نہ آئے۔

"کوئی ہے؟ کوئی ہے؟ وہ پکارتا ہوا صحنچی تک گیا اس نے دیکھا کہ میاں اللہ یار ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور ان کے قریب ایک کنالی میں، گھاس پھونس کو آگ لگائے ایک عجیب وضع کا آدمی بیٹھا ہے۔ کالا سیاہ، بالائی جسم برہنہ اور اتنا سوکھا سڑا کہ ایک ایک پسلی بآسانی گن لی جائے۔ ستر پوشی کو ایک معمولی سی چادر باندھی ہوئی تھی۔ کان میں مندری تھی جس سے مینا فوراً تاڑ گیا کہ ہو نہ ہو یہ جوگی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی، اس کے چہرے کے رونگٹے، گھبرائی ہوئی بلی کی دم کی طرح کھڑے ہوگئے اور اس کو رستے میں ٹیلے پہ ہونے والی پراسرار نقل و حرکت کی وجہ سمجھ آ گئی۔ تو وہ سانپ تھے۔ سینکڑوں یا پھر ہزاروں۔

جوگی نے نظر اٹھا کے مینے کو دیکھا اور پھر ناگواری سے بڑبڑایا، "تم لوگوں کو چین نہیں ہے؟ کیا مصیبت تھی یہاں آنے کی؟" مینے کو جوگی کی بات بالکل سمجھ نہ آئی۔ چپ چاپ کھڑا رہا۔ جوگی بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور جانے کہاں سے سندوری رنگ کا ایک لمبا سا ریشمی کپڑا لے آیا اور اس سے پہلے کہ مینا اس کپڑے کے بارے میں کچھ اندازہ لگاتا، جوگی نے کپڑا آگ میں جھونک دیا۔ اپلوں کی آگ پہ اصلی ریشم لمحوں میں راکھ ہوگیا۔ جوگی نے (یا جو بھی وہ تھا) تاسف سے سر ہلایا، "جل گئی ناں؟ تم کو کیا پتا، اب بے چاری کے پاس پہننے کو کچھ بھی اچھا لباس نہیں رہ گیا۔"

میاں اللہ یار ہولے سے کراہا تو مینے کو جیسے اچانک ہوش آ گیا۔ لپک کے باپ کے قریب پہنچا۔

"ابا جی! ابا جی!"

میاں اللہ یار نے بمشکل آنکھیں کھول کر لڑکے کو دیکھا۔

"میری نظر ہی نہیں پڑی، اپنی ماں کے بھائی نے چیر کے رکھ دیا۔"

"چپ کرو، چپ کرو، خون رک گیا ہے، لو۔۔۔۔۔ اب یہ صبح تک ٹھیک ہو جائے گا، ایسے عورتوں کی طرح نہ کراہو۔" جوگی تالاب میں ہاتھ دھوتے ہوئے بولا۔

مینے نے دیکھا کہ، میاں اللہ یار کے پہلو میں لگے قریباً آدھا بالشت کے زخم سے خون رسنا بالکل بند ہو چکا تھا۔ جوگی نے ریشم کی راکھ زخم پہ چھڑک دی تھی۔ کئی اور مرہم اور لیپ بھی لگائے تھے اور اللہ جانے وہ مرہم تھے بھی یا نہیں؟ تالاب سے اٹھتی کھڑے پانی اور گلتے ہوئے پتوں کی بو کے ساتھ، کافور، نیم، تل اور ہلدی کی تیز خوشبو بھی

پھیلی ہوئی تھی۔

''یہاں پہلے اتنے برے نہیں رہتے تھے، جب سے لوگوں نے کماد لگانی شروع کی ہے بے شمار ہو گئے ہیں۔''
جوگی جیسے اپنے آپ سے بولا۔

''اور سانپ؟'' مینے کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

جوگی نے نظر اٹھا کے مینے کو دیکھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی، جیسے دو انگارے سلگ رہے ہوں۔ بلکہ نہیں انگارے نہیں۔ یہ آگ نہیں تھی یہ تو سلگن تھی۔ دھیمی دھیمی جیسے اپلوں پہ راکھ کی ہلکی سی تہہ اور اس کے نیچے دہکتے کوئلے، اوہو! پھر وہی کوئلے۔ ارے نہیں بھائی کوئلے نہیں۔ وہ آنکھیں تو ایسے سلگ رہی تھیں جیسے دو مدھم آب دیتے یاقوت جو اپنے اندر دبی ابدی آگ سے روشن ہوں۔ مینا مزید سہم گیا۔

''سانپ؟''۔ جوگی جب بولا تو اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ''سانپ یہاں تو نہیں رہتے۔ وہ تو میاں اللہ یار کے مکان کی بنیادوں میں رہتے ہیں۔ صدیوں پرانی بانبی ہے۔''

مینے نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا اس کی نظر باپ پہ پڑی، آنکھوں آنکھوں میں میاں اللہ یار نے لڑکے کو چپ رہنے کا حکم دیا۔ جوگی نے دھوتی سمیٹی اور تالاب کے کنارے اکڑوں بیٹھ گیا۔

''میں نے سنا کہ اس بانبی میں ایک ناگن بھی رہتی ہے جس کی عمر کئی سو سال ہے اور جب اس کا دل چاہتا وہ بھیس بدل کے انسانوں کی جون میں آجاتی ہے۔ اس جون میں وہ امیر کبیر لوگوں سے شادی کرتی ہے، ان کی دولت سمیٹتی ہے اور یہ سب لے کے پھر واپس ناگن کی جون میں اپنی بانبی میں چلی جاتی ہے، جاتے جاتے وہ اس گھر کے ایک بندے کی جان بھی لیتی ہے۔ سنا ہے کہ اسی نے میاں اللہ یار کی دوسری بیوی کے مرنے کے بعد اس کے لڑکے کو چھپ کے دودھ پلایا''۔

جوگی خاموش ہوا تو جنڈ کی اس کٹیا میں ذرا دیر کو خاموشی چھا گئی۔ اتنی خاموشی کہ تالاب میں تیرتے گھانگھٹوں کے زیرِ آب تیرنے سے ابھرنے والی نہایت لطیف آواز بھی سنی جا سکتی تھی، جیسے تتلی کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ۔

''جھوٹ، بالکل جھوٹ، لوگ بڑے اپنی ماں کے بھائی ہوتے ہیں۔'' میاں اللہ یار ہنسے۔ ''عورت تو ہوتی ہی ناگن ہے اسے کیا ضرورت ہے ناگن بن کے گندے سے بل میں رہنے کی، تو جھوٹ بولتا ہے اور اسرار کو تو۔۔ شاماں نے۔۔'' اللہ یار خاموش ہو گیا اور ایک ہاتھ سے گدی سہلانے لگا۔ جوگی کا رنگ اگر اتنا کالا نہ ہوتا اور کٹی کے اندر ابر کا سا سماں نہ ہوتا تو یقیناً اس وقت اس کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا ہوتا۔ مینے نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

''نہیں ابا جی! ایسا ہوتا ہے، میں نے خود سنا ہے۔ اس دن ماسٹر صاحب اخبار سے پڑھ کے سنا رہے تھے کہ ہندوستان میں ایک جگہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں ایک عورت اکثر ویران سڑکوں پہ آدمیوں کو ملتی ہے اور پھر وہ مردہ پائے جاتے ہیں۔ جسم پہ سانپ کے کاٹے کا نشان ہوتا ہے۔''

''اوئے ایسے بے غیرت آدمی، جو عورت کو دیکھ کے پاگل ہو جائیں انہیں تو سانپ کاٹنا ہی چاہئے ۔ پر ہمارے خاندان میں آج تک کوئی آدمی سانپ کے کاٹے سے نہیں مرا اس لئے یہ جھوٹ ہے۔'' تھوڑی دیر پہلے ہائے ہائے کرتا میاں اللہ یار اب بات کے جوش میں اٹھ کے بیٹھ گیا۔ مینے کو معلوم تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

''تم میاں اللہ یار کے کیا لگتے ہو؟'' شائد جوگی بھی جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ دونوں کیوں جھوٹ بول رہے تھے؟ مینے کو الجھن سی ہونے لگی۔

''میں اللہ یار ہوں'' ۔ جب وہ بولا تو اسی لمحے چھپی کے کونے والی شاخوں میں بڑے زور کی کھڑ بڑ ہوئی اور ایک ہریل عجیب طرح سے شور مچاتا ہوا باہر اڑا، صحنچی کا آدھا سا چکر کاٹا اور کھلے میں پرواز کر گیا۔

جوگی یہ بات سن کر ہنس پڑا اور بڑی دیر ہنستا رہا۔ میاں اللہ یار اسے دیکھتا رہا، جب وہ خاموش ہوا تو اس نے پوچھا۔

''تم ہنسے کیوں؟''

''یا تو تم اللہ یار نہیں ہو اور یا جھوٹ بول رہے ہو او۔ چونکہ میاں اللہ یار جھوٹ نہیں بولتا اس لئے تم میاں اللہ یار نہیں ہو۔''

''چل نہیں ہوں اللہ یار، پھر؟'' مینے نے حیرت سے باپ کو دیکھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی پرانا قرض خواہ راستے میں مل جائے تو انسان اس سے خوہ مخواہ الجھ کے اس کے سامنے اپنی جھوٹی عزت بنانے کی کوشش کر رہا ہو۔ جوگی کی شکل اسے دیکھی دیکھی لگ رہی تھی۔ لیکن بھوریوں کے اس جہانِ حیرت میں، اس کے ذہن میں ہمیشہ سے قائم نقشے اور شکلیں جیسے کسی دھند میں ڈوبتی جا رہی تھیں۔

جوگی اور میاں اللہ یار کے درمیان کوئی تعلق تھا۔ بڑا عجیب سا تعلق، جو وہ اس کے سامنے چھپانا بھی چاہ رہے تھے اور دو جنگلی جانوروں کی طرح جو ایک دوسرے پہ اپنی اپنی برتری قائم رکھنا چاہتے ہوں اور اپنی اپنی کمزوریوں سے بھی آگاہ ہوں، ایک دوسرے کو کینہ توز آنکھوں سے گھور بھی رہے تھے۔ کوئی گڑ بڑ تھی۔ اس تعلق میں کوئی گڑ بڑ تھی۔

''ہاں نہیں ہوں اللہ یار، تو بتا، کیا کرے گا؟''

جوگی نے کچھ دیر ٹکٹکی باندھ کر اپنی چمکیلی آنکھوں سے میاں اللہ یار کو دیکھا۔ میاں اللہ یار بھی پھرتی سے اٹھا۔ مینا ڈرا کہ اس کے پہلو کا زخم نہ کھل جائے۔ لیکن میاں اللہ یار تو ایسے اٹھ کر کھڑا ہو گیا جیسے اسے کبھی کچھ نہ ہوا ہو اور سؤر کی کچلی کسی اور کو لگی ہو، وہ ویسا ہی جوان ہو جیسا جنت بی بی سے شادی کے وقت تھا اور چھلانگ مار کے دوڑتے ہوئے گھوڑے پہ سوار ہو جایا کرتا تھا۔

''نہیں ہوں اللہ یار، بتا کیا کرے گا؟'' اللہ یار پنجوں پہ تن کے غرایا۔

عین اسی وقت، جانے مینے کو وہم ہوا یا واقعی، کچھ قدموں کی چاپ اور سرگوشیاں، کسی جانوں بھرے جسم کے ریت پہ گھسٹنے کی آواز اور کچھ سرسراہٹیں سی ابھریں۔ جیسے جنڈ کی اس بھول بھلیاں میں جانے کون کون سی مخلوق

موجود تھی۔ مینے کو لگا، ٹہنیوں اور پتوں کے درمیان سے کئی آنکھیں انہیں جھانک رہی ہیں۔

مینے نے اپنی جبلت کے تحت میاں اللہ یار کا ہاتھ پکڑا اور اسے قریباً گھسیٹتے ہوئے وہاں سے باہر بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے اس نے دو آنکھیں ایسی بھی جھانکتی دیکھیں جن پہ پلکیں نہیں تھیں اور وہ کسی ابدی و ازلی حیرت میں چری ان دونوں کو جنڈ کے پتوں کے درمیان سے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ مرتے دم تک مینے نے ان آنکھوں کا ذکر کسی سے کیا اور نہ اس خوف کا جس کے باعث اس کا پیشاب نکل گیا تھا۔

(۵)

اس رات جب مینا سونے کے لئے بستر پہ لیٹا تو اس کے ذہن میں سوال تھے۔ جیسے ننھے ننھے سنپولئے، اور یہ سنپولئے کلبلاتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔

شاماں نے آج بڑے پیر کی نیاز دلوائی تھی۔ صبح سے نیاز کا سامان منگانے، نیاز پکانے اور برتانے میں اتنی مصروف تھی کہ مینا کب گیا اور کب آیا اسے علم ہی نہ ہو سکا۔ ڈھلتی راتوں کا چاند جو دن بھر آسمان پہ کہیں ٹنگا نظر سے پوشیدہ رہا تھا، اب بکائنوں کے اوپر چمک رہا تھا۔ ہوا میں گرد اور گوبر کی بو ٹھہری ہوئی تھی اور سوائے جھینگروں کی سنسناہٹ کے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مینے نے کروٹ بدلی تو اس کا پاؤں لگ کے پائنتی سے تھوڑی سی دہر ہٹ گئی۔ ادوائین شائد چھوٹی پڑ رہی تھی، اس لئے کچھ حصے میں نیا سخت بان باندھ کر پورا کیا گیا تھا۔

بان کی ننھی سی پھانس، مینے کے انگوٹھے میں چبھی اور ایک میٹھا سا درد پورے جسم میں پھیل گیا جیسے نوعمری کا عشق۔ وہ پھانس ڈھونڈھ ہی رہا تھا کہ شاماں اندر داخل ہوئی اس کے جلو میں لونگ اور الاچی کی خوشبو کا تیز بھبکا تھا، مینے کا پھانس نکالتا ہاتھ کانپ گیا۔

''کیا ہوا؟'' شاماں نے اپنی پوپٹوں اور پھندنوں والی چادر اتار کے کھونٹی پہ ٹانگتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ چبھ گیا ہے شائد، نیا بان تھا'' مینا، شاماں کے چھلکتے وجود کو دیکھ سہم گیا۔ پیازی ریشمی کرتے میں سے دیسی گھی اور بھنی ہوئی سوجی کی مہک اٹھ رہی تھی۔ شاماں کے بال چٹیا سے نکل کے اس کی گوری گردن سے لپٹے ہوئے تھے اور موٹی موٹی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔

''دکھا، کہاں چبھا ہے؟'' وہ مینے کے انگوٹھے پہ جھکی تو مینے کو ٹوبے میں تیرتی، سیاہ دھبوں والی پیازی مچھلی یاد آ گئی، جس کی دم فرانسیسی جالی کی بنی ہوئی معلوم ہو رہی تھی اور گول سنہری آنکھیں ایک ابدی حیرت میں، جڑی ہوئی تھیں۔

''میں اور ابا آج بھوریوں کی طرف گئے تھے''۔ شاماں نے پھانس کھینچی تو نا جانے کیوں بھل بھل خون بہنے لگا۔ شاماں نے گھبرا کے ہاتھ سے دبایا۔

''بھوریوں کی طرف، مگر کیوں؟'' شاماں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے بالکل ظاہر نہ ہونے دیا کہ اسے اتنی چھوٹی سی پھانس سے اتنا خون بہنے پہ شدید حیرت ہے۔

''جانتی ہے ناں ابے کو شوق چڑھا ہوا ہے، بھوریوں کو آباد کرنے کا۔''

''ہاں سن رہی ہوں میں بھی، کہتا ہے زمین دوحصے ہوئی وی ہے، مل جائے گی تو آسانی ہوگی''۔

شاماں نے ہاتھ اٹھایا تو خون رک چکا تھا، لیکن شاماں کی ہتھیلی پہ سرخ خون کے دھبے روشندان سے آتی چاندنی میں بڑے نمایاں ہو رہے تھے۔

''میں ہاتھ دھو آؤں۔'' شاماں اٹھی تو مینے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''نا جا شاماں نا جا، رات بہت ہوگئی ہے، نہ جا۔۔۔''

شاماں جو اماوس کی راتوں کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھی، رک گئی، مینے کے لہجے میں اتنا خوف تھا۔

خون آلود ہتھیلی سمیت وہ مینے کے برابر بیٹھ گئی۔ اکانہہ کار نگلے پایوں والا پلنگ ڈیوڑھا تھا لیکن شاماں بھی تب بھر جوان تھی۔ مینا سینک سلائی تھا لیکن شاماں کے وجود سے سارا پلنگ بھر گیا۔

''میں نے آج بھوریوں میں عجیب چیزیں دیکھیں۔'' مینا جھجکتے ہوئے بولا۔

''تجھے وہاں نہیں جانا چاہیے تھا مینے، اتنا سیانا ہو کے بھی ابے کی باتوں میں آ گیا؟'' شاماں کے لہجے میں تاسف تھا۔

''وہاں ہمیں ایک جوگی ملا، وہیں رہتا ہے جنڈ کے رکھ میں'' ۔ مینا جو کچھ سن کے آیا تھا وہ بتانے سے پہلے اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ شاماں نے اٹھ کر کونے میں رکھی صراحی سے تانبے کا منقش گلاس بھرا اور مینے کی طرف بڑھایا۔ مینا مشکور نظروں سے اسے دیکھ کر پانی پینے لگا۔

''جوگی نے تو رہنا ہے وہاں اس کی روزی جو ہے۔'' شاماں نے آدھا سا جملہ بولا۔ مینے کے ہاتھ میں گلاس کانپا۔

''جوگی کی روزی کا بھوریوں سے کیا تعلق؟'' شاماں نے کوئی جواب نہیں دیا اور گلاس میں بچے ذرا سے پانی سے ہاتھ دھوتی رہی۔

خون آلودہ پانی کے ہلکے گلابی قطرے پیال کے فرش سے ہوتے ہوئے نیچے ریت اور پھر مٹی میں جذب ہو گئے۔

''جوگی کہہ رہا تھا ابا، ابا نہیں ہے۔'' مینے کی بے تکی بات پہ شاماں ہنسی اور اپنی چوٹی کے بل کھولنے لگی۔ کمرے میں آملے اور ریٹھے کی مہک کے ساتھ شاماں کے بال کھولنے سے چھچھڑ سے لدی ہوائیں گھس آئیں۔

''جوگی کہہ رہا تھا کہ وہ میاں اللہ یار کو جانتا ہے اور وہ جھوٹ نہیں بولتا اور اگر ابا اللہ یار ہے تو پھر جس اللہ یار کو وہ جانتا ہے وہ کوئی اور ہے۔''

شاماں اچک کر پلنگ پہ بیٹھی۔

''ابا، ابا نہیں ہے، یہ تو مجھے بھی پتا ہے، اس کے لئے جوگی ہونا ضروری تو نہیں۔'' شاماں زور سے ہنسی۔

''ابے کو وہاں ایک برے نے زخمی بھی کر دیا، لیکن جوگی نے ایسی دوائی لگائی کہ ابا اپنے پیروں پہ چل کے آیا''۔

''وہ یہ بھی کہتا ہوگا کہ اس گھر کے نیچے سانپوں کی بانبی ہے، صدیوں پرانی''۔ شاماں کروشیئے کے سرخ اور زرد غلاف والے تکیے پہ سر رکھتے ہوئے شرارت سے بولی۔

''ہاں ہاں کہتا تھا۔''

''اور یہ بھی کہ اس بانبی میں ایک ناگن رہتی ہے، جو سو سال بعد عورت بن کے باہر نکلتی ہے اور اس گھر کے ایک فرد کو ڈس کے اور اس کی سب دولت سمیٹ کے بانبی میں چلی جاتی ہے۔''

مینے کے سر سے پسینہ پھوٹ نکلا اور کمر میں خوف کی ننھی ننھی کرچیاں کھب گئیں۔

''تجھے کیسے پتا؟'' وہ بولا تو اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ شاماں نے دیوار کی طرف کروٹ لی اور بالوں کا ریشمی سرسراتا ڈھیر مینے کے منہ پہ گرا۔

''یہ کوئی نئی کہانی ہے؟ شاملاٹ میں ہر لڑکی یہ ہی بتاتی تھی کہ میاں اللہ یار کے ڈیرے کے نیچے بہت بڑی بانبی ہے اور وہ اتنے بڑے خزانے پہ ہے کہ اگر میاں اللہ یار کو معلوم ہو جائے تو پاگل ہی ہو جائے''۔

''تو جب سب کو پتا ہے، تو ہمیں کیوں نہیں معلوم۔۔۔؟'' مینا بمشکل آنولے کے جنگل سے نکلا۔

شاماں نے اب کی بار مینے کی طرف کروٹ لی۔ اس کی چوڑا چوڑا کاجل لگی آنکھوں میں نیند کے سرخ ڈورے تھے اور کالے بالوں کے ہالے میں اس کا سرخ و سفید چہرہ اتنا خوبصورت لگ رہا تھا کہ مینے کو سب سوال بھول گئے۔ باہر ہوا سرد ہو چکی تھی اور رات کے دوسرے پہر کی اوس درختوں اور فصلوں پہ ہلکی ہلکی دھند کی شکل میں اترتی آ رہی تھی۔

(۶)

اگلی صبح میاں اللہ یار اسی طرح اکڑ کے بیٹھا تھا جیسے اسے کوئی زخم لگا ہی نہ ہو۔ فضل بی بی دوری میں اس کے لئے سردائی گھوٹ رہی تھی اور جنت بی بی، نیلے سوت کے پلنگ پہ بیٹھی کوڑیاں اور لونگ ٹنکا پنکھا جھل رہی تھی۔ جھل تو وہ خود کو ہی رہی تھی لیکن اس کی شدید خواہش تھی کہ یہ جھونکے میاں اللہ یار کی طرف مڑ جائیں۔

مینا نہا کر آیا تھا اور اس کے گیلے بالوں سے گرتے پانی کے قطرے اس کے سفید کرتے میں جذب ہو رہے تھے۔ میاں اللہ یار مینے کو دیکھتے ہی گندا سا منہ بنا کے بک بک کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ مینا کمزور اور زن مرید ہے اور اسی زن مریدی کی وجہ سے وہ اسے ڈرا رہا ہے کہ بھوریوں کو کاشت نہ کیا جائے۔

میاں اللہ یار کو غصے میں دیکھ کے فضل بی بی سردائی کا گلاس لے کے دوڑی۔ میاں اللہ یار نے دو بڑے بڑے گھونٹوں میں گلاس خالی کیا اور بادام، مصری، خشخاش کے بارے میں اتنے نادر خیالات کا اظہار کیا کہ گریس اناٹومی میں بھی اتنی باریک تفاصیل بیان نہیں کی گئی ہوں گی۔

مینے کے کان لال ہو گئے اور جنت بی بی نے پنکھے میں منہ چھپا لیا۔ اس کے بعد میاں اللہ یار نے ٹریکٹر ڈرائیور کو جیپ نکالنے کا حکم دیا اور مینے کو شاماں کے گھگھرے میں چھپ کے سوتے رہنے کا مشورہ دیتے ہوئے بھوریوں کی طرف نکل گیا۔

مینا ذرا دیر تو اپنی سگی اور نئی سوتیلی ماں کے سامنے شرمندہ سا بیٹھا رہا، پھر کھنکھار کے بولا کہ میاں اللہ یار یہ ٹھیک نہیں کر رہا۔

''کیا ٹھیک نہیں کر رہا؟ یہاں تو ساری زمین ہی ایسی تھی، اگر سب لوگ اسی طرح ڈر کے بیٹھے رہتے تو آج سارے میں ٹوبے اور ڈھکیاں ہوتیں۔''

فضل بی بی شوہر سے جتنا مرضی دبے، لیکن سوتیلے رشتوں کو ذرا خاطر میں نہ لاتی تھی۔ جوانی اور چاہے جانے کا غرور اس کی ریڑھ کی ہڈی کو اکڑائے رکھتا تھا۔ اتھری گھوڑی کی طرح ابھی وہ پنجوں کے بل چلتی تھی۔

''بات یہ نہیں چھوٹی بے بے!'' مینا نظر جھکا کے تحمل سے بولا۔

(۷)

میاں اللہ یار کی جیپ جب بھوریوں کے پہلے کلے پہ پہنچی تو ٹھس ٹھس کر کے اس کے پچھلے دونوں پہیے سیدھے ہو گئے۔ ٹریکٹر ڈرائیور نذیر احمد نے اتر کے دیکھا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے، درجن در جن بھر سیہ کے کانٹے پیوست تھے۔ نذیر کا رنگ اڑ گیا، لیکن میاں اللہ یار کے ماتھے پر پڑے بلوں کو دیکھ کے وہ غریب چپ، بس ہاتھ باندھ کے کھڑا رہا۔ میاں اللہ یار نے نیچے اتر کے اپنے قدموں کو تولا اور سامنے دور تک پھیلے بھوریوں کے سلسلے کو دیکھا۔ پہلو میں نہ درد تھا نہ ٹیس، لیکن ابھی زخم ہرا تھا۔

بڑھاپے میں اولاد پیدا کرنا اور بات ہے لیکن میلوں میل ریت کے کھوبے میں پاؤں گاڑ گاڑ کے چلنا اور بات ہے۔ چنانچہ میاں اللہ یار بکتے جھکتے کسی کی ماں بہن کو یاد کرتے گاؤں کی طرف پیادہ پا روانہ ہوئے۔

راستے میں ایک جگہ گھنی فصل کی اوٹ میں وہ پیشاب کو بیٹھ گئے۔ ابھی کے لانگڑ کس ہی رہے تھے کہ شاں شاں کر کے پتوں کے اندر کچھ ہوا اور پھر خاموشی۔ میاں اللہ یار ہوا میں ایک گالی اچھال کر مڑے، سامنے وہی جوگی کھڑا نظر آیا۔

جوگی چپ کھڑا تھا، ذرا دیر تو میاں اللہ یار بھی ویسے ہی کھڑے رہے، پھر جوگی کو گھور کے دیکھا۔ جو کچھ ان کو چاہیئے تھا وہ لے چکے تھے۔ اب یہ جوگی بار بار ان کے راستے میں کیوں آ رہا تھا؟

''راستے میں نہ آ میرے''۔ وہ بولے تو جوگی مسکرایا۔ ایک ایسے شناسا کی مسکراہٹ جو بہت کچھ جانتا ہو مگر کسی بڑے مقصد کے لئے فی الحال خاموش ہو۔ میاں اللہ یار کو اس بڑے مقصد سے خوف آیا۔ مگر جوگی وہیں بیٹھ گیا اور دونوں گھٹنوں کے گرد دونوں بازوؤں کا حلقہ بنا کر بڑے سکون سے بولا۔

''کاش تم، میاں اللہ یار ہوتے''۔

اللہ یار کا رنگ غصے سے جینگنی پڑ گیا۔ پہلو کا زخم ابھی بھرا نہیں تھا ورنہ جوگی کو وہ پھینٹی دیتے کہ بڑا یاد کرتا۔

''کس کے راستے میں؟ اور اگر میں اللہ یار نہیں تو میں کون ہوں، کسی کی ماں کا یار ہوں؟ کون ہوں؟''

جوگی ٹکٹکی باندھ کر افق کو تاکنے لگا جہاں ایک ترمتی ہوا میں اپنی جگہ معلق تیز تیز پر ہلا رہی تھی۔

"چوہا ہوگا"۔ جوگی نے لاتعلقی سے کہا جیسے ابھی ابھی اس نے میاں اللہ یار کے ہونے کو چیلنج نہ کیا ہو اور وہ وہاں ترمتی کے روزمرہ مشاغل پہ گفتگو کرنے کے لئے آئے ہوں۔ میاں اللہ یار کی نظر بھی ترمتی کی طرف اٹھ گئی۔

"چوہا؟"

"ہاں! وہ دیکھو، اسے چوہا نظر آ رہا ہے، لیکن چوہے کو تو کسی اور نے کھانا ہے۔"

"کس نے کھانا ہے؟" میاں اللہ یار جوگی کے لہجے کی پراسراریت پہ سہم گئے۔ انہیں یوں بھی اس جوگی سے سخت خوف محسوس ہوتا تھا۔ ایک اجنبی، جو بہت کچھ جانتا تھا، ایسے شخص سے کم سے کم واسطہ رکھنا چاہیئے، اور اب اس نے جو ایک نئی رٹ لگائی تھی، اس منحوس سے جان چھوٹنا بہت ضروری تھا۔

جوگی نے اپنا سر گھمایا اور لال لال آنکھیں میاں اللہ یار کی آنکھوں میں ڈال کر بولا، "اسی نے"۔

میاں اللہ یار اپنی جگہ سن ہو گئے۔ سامنے پودوں میں سنک سے کچھ ہوا اور ترمتی آگے اڑ گئی۔ میاں اللہ یار اس بکواسی، پراسرار اور رازدان جوگی سے کترا کے آگے نکلے۔

"دریا جب کہیں سے گزرتا ہے تو پیچھے اپنی لکیر چھوڑ جاتا ہے۔ سیانے کبھی سانپ کی لکیر اور دریا کے راستے پر پاؤں نہیں دھرتے۔"

میاں اللہ یار تیزی سے آگے بڑھے اور بڑی وٹ کی بھسل سے بچ بچا کے چلتے ہوئے واپس ڈیرے کی طرف روانہ ہوئے۔ جہاں فضل بی بی گھنی کوٹھڑی میں اسرار کا جھولا پلنگ سے باندھے سو رہی تھی۔

باہر صحن میں کمو نائین پرات میں آٹا گوندھ رہی تھی۔ لیکن میاں اللہ یار کو یہ نظارہ بھی ذرا متاثر نہ کر سکا۔ چپ چاپ جا کر اندر پلنگ پہ لیٹ گئے۔ پھر کچھ خیال آیا تو اٹھ کر بیٹھے کمو کو آواز دی۔ وہ آٹے سے سنے ہاتھوں کو اولو سا اٹھائے سامنے آئی۔

"بتا تو بھلا کمو، میں کون ہوں؟" کمو کے چہرے پہ پہلے تو حیرت آئی پھر سونف کے رنگ کی آنکھوں میں ہنسی چھلکی اور ایسا چھلکی کہ کالے ڈھیلے کرتے میں اس کا جسم، گندم کی پکی ہوئی بالی کی طرح لرزنے لگا۔

"میاں اللہ یار ہو، اور کون ہو؟"

"تو پھر وہ جوگی، ماں اپنی کا یار!۔۔ وہ۔۔" میاں اللہ یار خود سے مخاطب تھے۔ کمو کو بھی اب اندازہ ہوا کہ معاملہ ہنسی کا نہیں کچھ اور ہے۔ اصیل گھوڑی کی طرح مالک کے ماتھے کے بل دیکھ کر اس کی کنوتیاں کھڑی ہو گئیں۔

"خیر ہے مائی باپ؟ خمیرہ لاؤں جنت بی بی سے آپ کے لئے؟"

لیکن میاں اللہ یار کو خمیرہ مروارید کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے ایک ہی سوال کا جواب درکار تھا، کیا وہ واقعی وہ میاں اللہ یار ہے یا آج تک کسی دھوکے میں رہا ہے؟ اسی دنیا میں اس جیسے لوگ ہی ایسی حرکتیں کرتے تھے۔ اسے شدید خوف محسوس ہوا۔ یوں بھی اس نے کیا ہی کیا تھا؟ جوگی تو خود جھوٹا تھا۔ بھلا وہ میاں اللہ یار کے بارے میں کیا جانتا تھا؟

کمو نائین کی انگلیوں سے آٹے کا دودھ ٹپک ٹپک کر کچے صحن میں جذب ہو رہا تھا، اور ایک ایسی ہوا چل رہی تھی جس میں گہری نیند اور بے فکری گھلی ہوئی ہوتی ہے۔ آک کے پودوں کی کاسنی اور دودھیا کلیوں جیسی زہریلی نشیلی ہوا۔ میاں اللہ یار کی پلکیں آپ سے آپ مندنے لگیں اور وہ بے وقت سو گیا۔

(۸)

آج میتے کے سر میں درد تھا اور اکلوتی آنکھ لال ہو رہی تھی۔ باہر صحن میں پٹس پڑی ہوئی تھی کیونکہ نذیر ڈرائیور، بیبی کے کاٹنے اپنے صافے میں باندھ کر گھر لے آیا تھا۔ میتے کے پانچوں بھائی جو ابھی غیر شادی شدہ تھے حیرت اور تجسس سے اس کے گرد حلقہ باندھے کھڑے تھے۔

جنت بی بی اپنا گوٹا لگا، گھگھر اسنبھالے لونگ اور کوڑیوں سے سجا پنکھا لئے صحن میں آئی تو یہ منظر دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ نمک حرام نذیر اس کے بچوں میں پھوٹ ڈلوانے کے لئے یہ کاٹنے لے کر آیا ہے۔ نہ نہ کرتے نذیر پہ اس نے اپنی لال زری کی دیسی جوتی توڑ ڈالی اور سونے کے کڑوں میں کلائی کا گوشت آجانے سے اپنے ہی ہاتھوں پہ نیل پڑ گئے۔

نذیر تو کاٹنے سمیت کر رفو چکر ہوا، لیکن جنت بی بی کو حال پڑ گیا۔ اتنا روئی، اتنا روئی کہ سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کموں نے خمیرہ چٹایا، کسی نے کہا پرانا چمڑا سنگھاؤ، کوئی ٹھنڈا پانی لے کر دوڑا۔ لیکن جنت بی بی کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ بے ساختہ نکلتی آہوں اور بینوں کے درمیان سننے والوں نے سنا ہے کہ وہ اپنے باپ کی ناوقت موت پہ روئی، جس کی جواں مرگی نے اسے اس وقت یتیم کر دیا جب لڑکیاں بے فکری سے تتلی کی طرح اڑتی پھرتی ہیں۔ اپنی بہشتن ماں کو پکارا، جو اسے سخت مزاج اللہ یار کے سپرد کر کے مر گئی۔ زچگیوں کی تکلیفوں پہ روئی اور اس دن پہ روئی جب اللہ یار فضل بی بی کو اس پہ سوت بنا کر لایا۔

وہ رات بڑی بھیانک تھی۔ ہوا زوروں میں چل رہی تھی۔ بڑی نہر میں سرخی مائل مٹیالا پانی اپنی اندھی طاقت کے نشے میں گھماں گھماں بہہ رہا تھا۔ ذخیروں پہ باگلیں چکر کاٹ رہی تھیں اور گیدڑ اپنی بھٹوں کے دہانوں پہ کھڑے دلدوز آوازوں میں بین کر رہے تھے۔

اس رات جنت بی بی نے فضل بی بی کو بد دعا دی، اسرار کو کوسا اور میاں اللہ یار کو توم کے رکھ دیا۔ کسی میں جرأت نہ تھی کہ وہ اس بپھری ہوئی شیرنی کے سامنے آتا۔ میاں سلطان محمود کی اکلوتی بیٹی جس کے جہیز میں سو پلنگ پیڑھا تھا اور بارات پہ جانے والے سب لوگوں کو اصلی ریشم کی نو نو گز کی پگڑیاں دی گئی تھیں۔ اس جنت بی بی کو جس

نے کبھی سادہ پانی نہیں پیا تھا، جو کیوڑے میں بسے گھڑے کا پانی پیتی تھی۔ اس لاڈوں پالی پہ میاں اللہ یار نے سوت لا کے بٹھا دی تھی۔ دکھ سا دکھ؟ آج سبھی کے کانٹوں نے اس کھولتے، پکتے پھوڑے کا منہ پھوڑ دیا تھا۔ اتنے برسوں کا غبار نکلا تھا۔ آندھی آئی۔ شاملات میں کھڑا ایک بڑا پرانا درخت گرا اور اپنے ساتھ کتنے ہی درختوں کے موٹے ٹہنے توڑتا ہوا لے گیا۔

اس رات جو کچھ ہوا اس کی توجیہہ پیش نہیں کی جا سکتی چنانچہ سب نے متفقہ طور پہ تسلیم کر لیا کہ فضل بی بی کو سانپ نے ڈس لیا۔

(۹)

جس وقت جنت بی بی غیر انسانی آوازوں میں میاں اللہ یار کو کتے کی موت مرنے اور بے گور و کفن چیل کووں کی خوراک بننے کی بددعا دے رہی تھیں، فضل بی بی نے اسرار کا پوتڑا بدلنے کو ٹوکری میں ہاتھ مارا تو ٹوکری خالی تھی۔

اس وقت باہر صحن میں جس قسم کی ہل چل مچی ہوئی تھی اس میں کسی ملازمہ کو پکارنا اور پوتڑے منگوانا، اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ حالانکہ موت کو دعوت دو نہ دو، وہ تو اپنے وقت پہ خود بخود چلی آتی ہے۔ کوئی بکتر بند گاڑی، کوئی تعویز، کوئی گنڈا، کوئی دم، کوئی درود کچھ کام نہیں آتا۔ آتی ہے اور چھپرا کھاڑتی، جوڑیاں توڑتی، گودیں اجاڑتی، خاک اڑاتی، اپنی بھینٹ لے کے چلتی بنتی ہے۔

خیر فضل بی بی اسرار کو گدیلے پہ ہاتھ پاؤں مارتے، آغوں، آغوں کرتے چھوڑ کے عجلت میں پچھلے صحن میں گئی، کہ الگنی سے سوکھے پوتڑے اتار لائے۔

وہاں اس نے کیا دیکھا یہ ایک الگ کہانی ہے۔ لیکن جب بہت دیر تک ماں نہ آئی تو شیر خوار اسرار کو جبلت نے اکسایا کہ رو، وہ رویا، حلق پھاڑ پھاڑ کے چلایا، لیکن صحن میں جاری دھما چوکڑی میں اس کی آواز دب گئی۔ کافی دیر بعد جب جنت بی بی اپنی توانائی ختم ہونے پہ بے ہوش ہوئی تو کمو کو اسرار کی ٹیاں ٹیاں سنائی دی۔ وہ بے قرار ہو کر بھاگی۔ دیکھا تو اسرار اکیلا ننگا پتنگا، پڑا رو رہا ہے۔ فضل بی بی غائب۔ پہلا خیال جو اس کے ذہن میں آیا وہ یہ ہی تھا کہ حوائج ضروریہ کو گئی ہوگی، لیکن بچے کو ننگا چھوڑ کر تو نہیں جا سکتی۔ کمو نے جلدی سے اسرار کو کندھے سے لگایا اور پچھلے صحن کی طرف دوڑی۔

وہاں صحن کے بیچوں بیچ، فضل بی بی چاروں خانے چت پڑی تھی۔ آنکھیں کسی حیرت میں کھلی ہوئی تھیں اور بھنچے ہوئے ہونٹوں کے کونے سے خون کی ایک پتلی سی لکیر بہہ کر مٹی میں جذب ہو رہی تھی۔

کمو کی دلدوز چیخ پہ سارا گھرانہ وہاں جمع ہو گیا۔ شاماں نے اپنی پیٹی سے پیٹرو میکس نکالا اور میدے نے کانپتے ہاتھوں سے پمپ کیا، نیا مینٹل چڑھایا اور ساں ساں کرتے ہنڈے کی روشنی میں سب نے غور سے دیکھا، کچے صحن میں کوئی نشان نہ تھا، کسی کے قدموں کا نہ ہی کسی کے رینگنے کا، ٹاہلیوں پہ چھلیاں تھیں اور تاروں کی روشنی بے کسی سے

تھی فضل بی بی کی آنکھوں سے منعکس ہو رہی تھی۔

میاں اللہ یار آج بھی قسمیں کھاتا ہے کہ اس نے اوپر ایک ترمتی کو اڑتے دیکھا تھا۔ عین صحن کے اوپر، وہ معلق تھی اور پر پھڑ پھڑا رہی تھی اور پھر ایک دم کہیں اڑ گئی تھی۔ اندھیری رات میں اس کا سایہ بھی اوجھل ہو گیا تھا۔

لیکن یہ ایک ایسی غیر ضروری تفصیل تھی کہ کسی نے توجہ نہ دی۔ یوں بھی جوان بیوی کی اچانک موت کے بعد اسے کچھ بھی نظر آ سکتا تھا۔ جنوں کے جلو میں تختِ سلیمان بھی اور اڑتے ہوئے ہنومان جی بھی اور اڑن طشتری بھی۔

خیر اس کالی اور منحوس رات میں فضل بی بی بے چاری کو نئی کھٹولی پہ ڈال کے اگلے صحن میں لایا گیا تو جنت بی بی کے سناٹے بیت گئے۔ زبان جو تالو کو چپٹی تو سالوں گزر گئے، ہوں ہاں سے آگے کسی نے اسے بولتے نہیں سنا۔

ہنڈے کی روشنی میں فضل بی بی کا چہرہ تیزی سے جامنی پڑتا جا رہا تھا، کسی کو کچھ بھی کہنے، بتانے کی ضرورت نہ تھی، یہ اسی بدذات ناگن کی کارستانی تھی۔

لوگ کہتے ہیں کہ اس روز جنت بی بی کے واویلے نے زمیں آسمان ہلا کر رکھ دیئے تھے اور اس کی آہ و بکا پہ مکان کی بنیادوں میں رہنے والی ناگن گھبرا کے نکل آئی تھی۔

فضل بی بی بے چاری کو کیا خبر تھی کہ پچھلے صحن میں سوکن کی بددعا اس کا انتظار کر رہی ہے۔ لیکن لوگوں کا کیا ہے؟ ان کو تو کرنے کو بکواس چاہیئے۔ فضل بی بی اپنی جان سے گئی اور ننھا اسرار بے چارہ مسکین، بے ماں کا ہو گیا۔

راتوں رات قبر کھودی گئی، جیسا تیسا غسل دے کے، روسی ٹریکٹر کی روشنیاں جلا کے، فضل بی بی کو دفن کر دیا گیا۔ میاں اللہ یار کو لگا پہلو کا زخم چر گیا ہے اور ایک پوری پسلی ہی کوئی نکال کرلے گیا ہے۔

(۱۰)

فضل بی بی کی موت کے بعد آنے والے دن بڑے اداس تھے۔ اسرار دن بھر ٹیھوں ٹیھوں روتا تھا اور کمو نائین اسے بہلاتے بہلاتے نڈھال ہو جاتی تھی۔ اسرار کے لئے ایک کالی چیتل بکری منگائی گئی۔ بکری کے دودھ میں پانی سونف اور بڑی الائچی ڈال کے ابالا جاتا اور پھر کوسا کوسا کنکنا یہ دودھ پلاسٹک کی بوتل میں ڈال کر اسرار کو پلا یا جاتا۔ لیکن دو دو بوتلیں پی کر بھی اس کا پیٹ نہ بھرتا اور وہ منہ پھاڑ پھاڑ کے روتا۔

سب گھر والے بے بسی سے یہ رونا سنتے، لیکن کوئی کیا کر سکتا تھا؟ جنت بی بی کی نظریں جھکی رہتیں اور ہونٹ سختی سے بھنچے رہتے۔ میاں اللہ یار نے پورے چالیس دن ڈاڑھی نہ مونڈی، نہ ہی بال رنگے۔ سب حیران تھے میاں اللہ یار اتنا بوڑھا تھا؟ کیا اس کا سر پہلے بھی سفید تھا یا فضل بی بی کی موت کے غم نے اسے وقت سے پہلے برفا دیا تھا؟

دس دن یہ ہی سلسلہ چلا، گیارہویں دن جب کمو نائین دودھ کی بوتل لئے اسرار کو اٹھانے گئی تو وہ اپنے گدے پہ نہیں تھا، کمو کے ہاتھ سے بوتل گر گئی اور وہ سرپٹ باہر بھاگی۔

میاں اللہ یار کو بتا کے جب وہ شاماں کی کوٹھڑی میں پہنچی تو اس نے دیکھا اسرار شاماں کے ڈیوڑھے پلنگ پہ مینڈک کی طرح پیٹ پھلائے پڑا کلکاریاں مار رہا ہے۔

''اسے یہیں رہنے دے''، شاماں نے چوٹی میں بل ڈالتے ہوئے کہا۔

''اور بکری کھول کے شاملاٹ میں چھوڑ دے اسرار کو نہیں پچتا اس کا دودھ۔'' کمو نے کچھ پوچھنا چاہا، لیکن اسرار کی شکل میں جو ناپسندیدہ ذمہ داری اس کے گلے پڑ گئی تھی، اس سے جان چھٹنے پر اس نے سکھ کا سانس لیا اور کچھ بھی پوچھے بغیر باہر نکل گئی۔

میاں اللہ یار کو علم ہوا تو مرا ہوا اپنے موڑھے پہ بیٹھا رہا۔ شاماں اس کی آنکھوں کے سامنے اسرار کو صحن میں لائی اپنی اوڑھنی کی آڑ میں اس کے کپڑے اتارے، کنک کا تیل منگا کر مالش کی۔ وہیں لکڑیوں پہ، پیتل کی نئی بلٹوہی میں پانی گرم کیا اور جست کے بیضوی ٹب میں اسرار کو شہر سے منگائے کیوٹی کو را سے خوب مل مل کے نہلایا۔

نیا صاف جھبلا پہنا کے، آنکھوں میں کاجل اور تھن متھنے بازوؤں اور گل گوتھنی کلائیوں پہ کالے ڈورے باندھ

کے جب اسرار کو میاں اللہ یار کی گود میں ڈالا گیا تو اس کا دھڑ دھڑ کرتا دل جیسے ٹھہر گیا۔ اسرار رلے گا نہیں، شاماں اسے پال لے گی۔ کسی کی گود اجاڑنے کا احساسِ جرم بڑی حد تک کم ہو گیا۔

میاں اللہ یار فضل بی بی کی موت کا غم بھول گئے۔ کسی سیانے سے کہا، پھر بہت سے سیانوں نے دہرایا کہ بیوی کی موت تو کہنی کی چوٹ ہوتی ہے۔ میاں اللہ یار تو ایسے شیر تھے کہ پہلو میں لگے کاری وار کو سہہ گئے تھے تو کہنی کی چوٹ کو بھلانا کون سی مشکل بات تھی؟

شاماں کو اسرار ملا تو وہ مینے کو بھول گئی۔ مینے کے کپڑے ایک ایک کر کے سب میلے ہو گئے۔ سفید کرتے، نیلی قمیصیں اور خاکی چولا۔ کمو نائین صبح جو روٹیاں تھوپ جاتی تھی، وہی کسی دال ساگ کے ساتھ کھا لیتا تھا۔ رات کو سونے آتا تو شاماں اسرار کو جھجھو جھونٹے کرا رہی ہوتی۔ دونوں مل کر ہنستے، اسرار اور شاماں۔

مینا پلنگ کے ایک کونے میں سکڑا سمٹا پڑا رہتا، آنولے اور بالچھڑ سے لدی ہوائیں، پرے پرے خوشبو بکھیرتیں اور وہ چپ چاپ پڑا سوچتا، فضل بی بی کو کس نے مارا؟ جوگی کو دیکھتے ہی میاں اللہ یار خوفزدہ کیوں ہو جاتے ہیں؟ یہ سوال اس کی عقل و دانش سے کہیں بڑے تھے اور شاماں سے اب کون پوچھتا؟ اسے تو اب اسرار مل گیا تھا، کھانڈ کا کھلونا، چابی کا باوا۔ دنوں، دنوں میں اسرار تو ایسا نکھرتا گیا کہ اس پہ نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ رنگت میں گلابیاں گھل گئیں، آنکھیں کنچوں کی طرح چمکتیں اور اتنا صحت مند کہ کمو نائین گود میں لیتی تو شطرنج کے گھوڑے کی طرح ڈھائی گھر کی چال چلتی۔

شاماں کی اسرار کے لئے دیوانگی بڑھتی جا رہی تھی اور مینے کی مجذوبیت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جنت بی بی ڈھی ہوئی دیوار سے ٹیک لگائے سب دیکھتی تھی اور انہونی کے خوف سے زرد پڑتی جاتی تھی۔

یہ ان ہی دنوں کا ذکر ہے جب بکری والا واقعہ پیش آیا۔

باڈاسرار کے لئے جو بکری لائی گئی تھی، اسے شاملاٹ کے ذخیرے میں چھوڑنے والے سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ بکری کے ساتھ اس کے دو میمنے ایلی من اور لیلی من بھی تھے۔ دونوں سارا دن ذخیرے میں اچھلتے پھرتے تھے۔ پھر شام کو سورج ڈھلتے ہی کسی گرے ہوئے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے تھے اور ماں کے پہلو میں ہی اونگھتے چونکتے رات بتا دیا کرتے تھے۔

دیہات کی معیشت میں بکری ایک بلینک چیک سے کم نہیں ہوتی۔ خاص طور پہ مشکی رنگت والی بیتل بکری، جس کے کان اتنے لمبے اور منہ لاما جیسا معصوم اور کسی حد تک احمق ہو اور جس کے ساتھ دو میمنے، میمنے کیا اچھے خاصے پٹھورے، بن چکے تھے اب تو دونوں۔

بکری کا سارا دودھ اور ذخیرے میں اگی ہر طرح کی موہی گیاہ، صرف ان ہی کے لئے تو تھی۔ دن بھر کی اچھل کود نے ان کو خوب چست اور مضبوط بنا دیا تھا۔

خیر تو بکری کو ذخیرے میں پھرتے دیکھنے والوں کی کمی نہ تھی۔ لوگوں کی نیت اسے دیکھتے ہی خراب ہونے لگتی۔ غفور آرے والا ایک دن پیشاب کے بہانے سے نکلا۔ سیروی گڑوی اس نے تہہ بند کے پلو میں چھپائی اور بے پروائی سے ذخیرے کی طرف روانہ ہوا۔

راستے میں اسے آما موچی ملا۔ بظاہر آما آنے والے جاڑے کے بارے میں بات کر رہا تھا، لیکن بات پوری نہیں کر پا رہا تھا۔ آدھی پونی ٹکڑی بول کر کان کھجانے لگتا یا ہاتھ کی پشت سے گدی سہلانے لگتا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بے چینی تھی۔

آرے کی چھوٹی سی دکان قریبی قصبے میں بس اڈے کے پاس تھی۔ جہاں وہ دن بھر چڑے کو بھگونے، کاٹنے، فرمے پہ چڑھانے، سینے اور چمکانے میں مصروف رہتا تھا۔

اس محنت شاقہ سے جو چار پیسے ہاتھ آتے ان سے وہ گھر کے لئے سودا سلف خریدتا۔ کبھی کبھار اس کا دل چاہتا کہ اس کے پاس بکری ہو۔ چھوٹی سی ہی سہی۔ نہ سہی بیتل، ٹیڈی ہی سہی، لیکن ایک بکری ہو۔ دن بھر کی مشقت

کے بعد جب وہ گھر جائے تو اس بکری کو اپنی نانی کے جہیز کی پیتل کی گڑوی میں دوہے، اور اس سنہری کلسے میں اترے آب حیات کو اپلوں کی مدھم آنچ پہ کڑھنے دے، پھر اس شیر گرم مشروب میں مٹھی بھر کھانڈ گھول کر سہتا سہتا پی جائے۔

اس خیال سے ہی اس کے حلق، تالو اور زبان میں ناریل جیسے دودھ کی مٹھاس خود بخود اتر آتی تھی، اور جسم کی سوکھی رگوں میں یہ تصور امرت بن کر دوڑنے لگتا تھا۔ کیسا ظلم تھا کہ ایک جتل بکری شاملات میں آوارہ پھر رہی تھی۔ دونوں میمنے جو کہ اب پٹھورے بن چکے تھے، اس دودھ پر مستائے ہوئے سانڈ بنے جا رہے تھے اور کسی انسان کو ایک قطرہ دودھ بھی دوہنے کی اجازت نہ تھی۔

یہ پابندی شاماں نے لگائی تھی۔ بکری کو شاملات میں چھوڑنے سے پہلے مینے نے گاؤں کے چیدہ چیدہ افراد کو بلا کے سمجھایا تھا کہ یہ بکری چونکہ باؤ اسرار کے لئے منگائی گئی تھی، جس کی ماں فضل بی بی مبینہ طور پہ سانپ کے ڈسنے سے مر گئی تھی۔ اب بوجوہ اس بکری کی ضرورت نہیں رہی، تو گاؤں والوں کو ہوشیار کیا جاتا ہے کہ اس بکری سے دور رہیں۔ اس کے میمنوں اور دودھ پر کسی کا حق نہیں۔

گاؤں والے کچھ تو خاموش رہے، کچھ نے اسے حکمت جانا اور کچھ دبے لفظوں میں خفگی کا اظہار کر گئے کہ بھئی ہم کوئی سیر بھر دودھ کے بھوکے ہیں؟ ہماری بھینس تو ایک وقت میں بالٹی بھر کے دودھ دیتی ہے۔ دودھی کو بیچنے کے بعد بھی اتنا بچ جاتا ہے کہ سارا گھر پیالہ پیالہ پی لیتا ہے۔ دودن کا بچا ہوا دودھ چائی میں جما بھی لیا جاتا ہے۔ گو لسی کھٹی نکلتی ہے لیکن پیڑہ مکھن کا بھی ہاتھ آتا ہے، تو ہمیں کیا پڑی ہے کہ کسی فالتو سی آوارہ بکری پہ نظر رکھنے کی؟

لیکن غفور آرے والے کی نظر تو بکری پہ تھی اور کیوں نہ ہوتی؟ وہ خود تو سارا دن ٹال پہ رہتا۔ آندھیوں میں کبھی کبھار گر جانے والے پیڑوں اور لوگوں کے رقبوں میں کھڑے درختوں کے سوکھ جانے یا پھر خود ہی ضرورتاً کٹوائے جانے والے درختوں کی کٹائی کراتا۔ آزو بازو کے گٹکے الگ کراتا۔ درمیان کی پکی گیلی دھیان سے الگ کر کے چھ چھ انچ کے شہتیر چروا تا اور برادہ تک ضائع نہ ہونے دیتا۔ لیکن آمے کی طرح اس کی بدنصیبی یہ تھی کہ اس کی بیوی پردہ کرتی تھی۔ مولوی کی بیٹی نے کبھی گھر سے قدم باہر نہیں نکالا تھا، اگر بکری یا گائے خرید بھی لاتا تو اس کی ٹہل سیوا کون کرتا؟ ملازم رکھتا تو سونے سے گھڑ اون مہنگی پڑتی۔

چنانچہ چپ چاپ، آمے کی دکان کے ساتھ والی دودھ دہی کی دکان، جس پہ جلی حروف میں "سپریٹا دودھ بیچنے والے پر خدا کی لعنت" لکھا ہوتا تھا، سے ایک کلو، پتلا پانی دودھ خرید کر گھر لے جاتا تھا، جسے لاکھ اوٹایا جاتا تھا مگر مجال ہے جو جھلی برابر بھی ملائی آجائے۔

دونوں بڑی دیر ادھر ادھر کی ہانکتے رہے۔ بتے ملاتے، جب سات آٹھ منٹ گزر گئے تو آمے کا ضبط جواب دے گیا اور وہ بلند، چیخ نما سرگوشی میں بولا "اس طرف!"

آمے کے سوکھے سے ہاتھ کا اشارہ ذخیرے میں اگی دب کی اونچی جھاڑیوں کی طرف تھا، جن میں آج کل بٹیروں کے غول سائبیریا سے آکر مقیم تھے۔

غفور آرے والے نے دلچسپی سے آمے کی انگلی کے تعاقب میں دیکھا۔ دور جھاڑیوں کے پس منظر میں کچھ کالا سا جانور کھڑا تو تھا لیکن اتنی دور سے کیا پتا چلتا تھا کہ بکری ہی ہے۔ کیا خبر کوئی سرکاری سانڈ ہی نہ ہو، الٹا لینے کے دینے پڑ جائیں۔ لیکن وہ بکری ہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ غفور نے تہہ بند کے پلو سے گڑوی نکالی تو آمے کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ایک طرف تھوک کے میاں اللہ یار کے انداز میں چہک کر بولا، 'ماں کے بھائی! بکری نہ دوہنا، بکری نہ دوہنا! کیوں نہ دوہنا؟ منت کی بکری ہے؟ دولے شاہ کے مزار پہ چڑھائی ہے؟'' اس بھونڈے مذاق پہ دونوں مردِ منہ پھاڑ کے ہنسے اور پھر کسی ان کہے سمجھوتے کے تحت ایک دائیں سے بڑھا اور دوسرا بائیں سے۔

بکری جھاڑیوں کے عقب میں کھڑی، نرم نرم تلہ کھا رہی تھی اور ایسا کرتے ہوئے خوشی سے اس کے نتھنے پھول اور پچک رہے تھے۔ ایلی من، بلیلی من کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

غفور اور آما، قدم بہ قدم ایسے بڑھ رہے تھے جیسے پارسا آدمی کے دل میں بدی۔ غفور کا پاؤں ایک خشک پتے پر آیا اور کچھ ٹہنیاں چر چرائیں۔ بکری پالتو رہ چکی تھی، بے خطر کھڑی گھاس چرتی رہی۔

غفور چپکے سے آگے بڑھا، بکری کی کمر پہ ہاتھ پھیرا۔ اس نے خوشی سے کھال جھرجھرائی اور مزید شوق سے چرنے لگی۔ ''وہ دونوں کہاں ہیں؟'' اس نے آمے سے پوچھا۔

''ان کو جہاں وہ دفع ہیں، وہیں دفع ہوا رہنے دو، تم دودھ دوہو، یہ جتل بکری ہے، آرام سے دودھ لو گے''۔ غفور نے گڑوی بکری کے نیچے رکھی ہی تھی کہ جھاڑیوں میں گویا بھونچال آ گیا۔ دونوں میمنے دوار نے بھینسوں کی طرح، زمین کھودتے، مٹی اچھالتے، ناک سے پھنکاریں مارتے غفور پہ حملہ آور ہوئے۔

غفور پہلے تو ذرا پھر ٹھٹھا مار کے ہنسا کیونکہ میمنے اس سے کچھ فاصلے پر رک گئے تھے۔ غفور نے لاپروائی سے ان کو دیکھا اور بکری کو دوہنا شروع کیا۔ ابھی گڑوی میں دودھ کی دو چار دھاریں ہی اتری تھیں کہ دونوں میمنوں نے سچ مچ حملہ کر دیا اور غفور کو اپنے ماتھوں سے ٹکر ماری۔ غفور کچھ لڑکھڑایا اور پھر ہنسنے لگا میمنے پھر پینترا بنا رہے تھے۔

غفور نے ان ذرا ذرا سے پٹھوروں کو دیکھا اور زور سے ہنسا۔ ''ماں اپنی کے بھائی!'' اس نے گالی بکی اور آمے کو بکری دوہنے کا اشارہ کر کے تہہ بند کا لانگڑ کستے ہوئے ان کی خبر لینے کو لپکا۔

آما ہنستے ہوئے پیروں کے بل بیٹھ گیا۔ غفور نے زمین سے نرم مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھایا اور انہیں دھمکانے کو حلق سے تخ تخ کی آواز نکالی۔

''ہت تیری کتی کے او بچیو!'' غفورے کی آواز بمشکل دب کے جھنڈ تک پہنچی ہو گی کہ دونوں میمنوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس ٹکر میں اتنی شدت تھی کہ غفور، کمر کے بل گرا اور اس کا تہہ بند کھل گیا۔ آمے کو یہ تماشا دیکھ کر بے طور ہنسی آئی۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں کے کویوں سے پانی بہہ نکلا۔ گڑوی آدھی بھر چکی تھی اور پھر اس نے دیکھا کہ دونوں میمنے دانت نکوستے ہوئے غفور کے سینے پہ چڑھ گئے اور ان میں سے جس کے ماتھے پر سفید داغ تھا، منہ کھول کے غفور کی گردن پہ لپکا جیسے وہ ہری ہری گھاس کا گٹھا ہو اور اس سے پہلے کہ غفورا اسے جھٹک کے پرے پھینکتا، اس نے غفور

کی گردن میں دانت گاڑ دے۔

آمے کو پہلے تو اپنی بصارت پہ شبہ ہوا، پھر جب دوسرا امیسنا اس کی طرف لپکا تو آمے نے بجلی کی سی تیزی سے گڑوی اٹھائی اور زقندیں بھرتا ہوا گاؤں کی طرف بھاگا۔ وہ اس قدر خوف زدہ تھا کہ اس کے حلق سے نہ تو کوئی چیخ برآمد ہوئی اور نہ ہی اس نے غفورے کو بچانے کی کوئی کوشش ہی کی۔

دوڑتے ہوئے اس کے دائیں طرف میاں اللہ یار کے کھیت بھی آئے اور ان کے درمیان جھلکتا بھوریوں کا ناگ بھی گزرا۔ وہ ادھ بھری گڑوی کو سینے سے لگائے دوڑتا رہا اور جب وہ رکا تو گاؤں کے سرے پہ واقع پیپل کے نیچے کھڑا تھا۔

لمحہ بھر کو اس نے سوچا کہ ہوا کیا ہے؟ اور پھر گزرے ہوئے خونیں واقعے کو یاد کر کے اس کے حلق سے بے ساختہ چیخیں نکلنے لگیں۔ ان چیخوں کو سن کر گاؤں کے کتے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور جس کا جس طرف منہ اٹھا، اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔ وہ راہب کتے جو گاؤں کی زندگی چھوڑ کر کھیتوں میں سکونت اختیار کر چکے تھے اور کبھی کبھار شوقیہ کسی راہگیر پہ بھونکنے کے علاوہ ترکِ دنیا پہ عمل پیرا تھے، بھی اس افتاد سے گھبرا کر بھونکنے لگے۔

کتوں کے اس شور کو سن کے گاؤں کی بڑھیوں نے کوٹھوں پہ چڑھ کے کوکیں دینی شروع کر دیں اور کھیتوں میں کام کرتے مرد، درانتیاں اور کسیاں چھوڑ کے گاؤں کی طرف لپکے۔

اس وقت تک چلا چلا کے آمے موچی کے پھیپھڑے جواب دے چکے تھے اور اس کے حلق سے سوائے، ''ایں، ایں'' کی گھٹی گھٹی آوازیں کے کچھ برآمد نہیں ہو رہا تھا۔ جو لوگ پہلے وہاں پہنچے ان کے بیان کے مطابق آمانہ سے کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ ہاں اشاروں سے اس نے اتنا ضرور بتا دیا کہ ذخیرے میں کوئی حادثہ پیش آیا ہے اور بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے آخری لفظ ''غفور'' کہا تھا۔

گاؤں کی عورتوں نے آمے کو پلنگ پہ ڈالا، کسی نے اس کے ہاتھ سے گڑوی لے کر وہیں پلنگ کے نیچے رکھ دی اور کوئی اسے پنکھا جھلنے اور کوئی پانی کے چھینٹے مارنے میں مصروف ہو گئی۔ کسی نے بھی نہ دیکھا کہ گڑوی میں کیا ہے۔

آمے کو ہوش تو آ گیا لیکن اس کی زبان اب بھی بند تھی اور وہ ٹر ٹر سب عورتوں کے چہرے دیکھے جا رہا تھا۔ کمو تائین نے جو یہ تماشا دیکھا تو اپنا سینہ کوٹ ڈالا کہ ہائے ہائے، آما موچی گونگا ہو گیا اور اب وہ کبھی بھی کچھ نہیں بول سکے گا۔ اس کے اس بین میں ایک دھمکی آمیز تیقن تھا، جیسے وہ چاہتی ہو کہ اگر آما گونگا نہیں بھی ہوا تو ہو جائے اور جو کچھ اس نے ذخیرے میں دیکھا اس کو بیان نہ کر پائے۔

قریب کھڑی عورت نے جانے کس جھونک میں کہہ ڈالا کہ آمے کے گونگے ہونے سے کمو کو کیوں تکلیف ہو رہی ہے؟ ایسی کون سی بات تھی جو کمو نے اس سے سنی تھی اور اب وہ اشاروں میں بتائے گا تو کمو کو برا لگے گا۔ نہ تو موقع تھا اور نہ ہی بات اتنی بڑی تھی مگر جانے کمو کو کیا ہوا کہ اس نے جواباً اس عورت کی سات پشت کو توم ڈالا۔

عورت نے جھلا کے اس کے بال جھکول ڈالے۔ آدمی اس کو پکڑنے کو دوڑیں آدمی اس پہ لپکیں اور آما خوفزدہ نظروں سے عورتوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اتنی بلند اور دلدوز چیخ ماری کہ فضل بی بی کے غم میں نڈھال میاں اللہ یار اپنی چارپائی سے ہڑبڑا کے گرتے گرتے بچا۔ جوتے پہن کے وہ باہر کی طرف لپکا، جہاں عورتیں اب پھر سے حلقہ باندھے، چلاتے ہوئے آمے کے چاروں طرف کھڑی تھیں جیسے کسی قبل از تاریخ رسم کی ادائیگی کو تیار ہوں۔

(۱۲)

جو لوگ ذخیرے کی طرف گئے تھے۔ وہ وہاں پہنچ کر دو ٹولیوں میں بٹ گئے۔ ایک ٹولی جس میں مینا بھی شامل تھا دائیں طرف بہنے والے سرکاری کھال کو، جو بارہ مہینے بہتا تھا عبور کر کے ذخیرے میں داخل ہوئی۔ دوسری ٹولی چکر کاٹ کے اس بڑی پگڈنڈی کی طرف چل دی، جسے عموماً گھاس کاٹنے والی عورتیں استعمال کرتی تھیں۔

ان کا خیال تھا کہ شائد کسی عورت کو کوئی حادثہ پیش آیا ہے، جو زیادہ سے زیادہ یہ ہی ہو سکتا تھا کہ جگہ جگہ لگے کسی بڑی مکھی کے چھتے کو جانے یا ان جانے میں چھیڑ دینے سے کوئی جھلر بھڑ گیا ہے۔ یا پھر؟ یہاں اس سے بڑا حادثہ کیا پیش آ سکتا تھا؟

مینے والی ٹولی نے جب کھال عبور کیا تو سامنے درخت ذرا چھدرے تھے، فرش پہ تلا تھا بیچ بیچ میں باتھو، اٹ سٹ، جنگلی جئی، کوار اور آک کے پودے بھی تھے۔ یہاں خاموشی اور سکون تھا۔ درختوں کے گرے ہوئے پتوں کے گلنے کی مدھم بو ہوا میں ٹھہری ہوئی تھی اور آتی سردی کی شیر گرم ہوا، لہر در لہر بہہ رہی تھی۔

مینے کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ غفور آرے والا، کوئی ایسا شریف آدمی نہ تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ پڑوس کے گاؤں کی ایک عورت سلمٰی سے اس کے ناجائز تعلقات تھے اور وہ عورت کسی فارسٹ آفیسر کے ساتھ بھی خراب تھی۔ غفور سرکاری ذخیرے سے اپنی پسند کے درخت چھانٹ کے غائب کر دیا کرتا تھا اور وہ فارسٹ آفیسر اپنی معشوقہ کی سفارش پہ یہ جرم دبا جاتا تھا۔

جب غفور اور سلمٰی کا معاشقہ کھلا تو کہا جاتا ہے کہ غفورے نے اس بے چارے کو اپنے آرے پہ چیر کے ٹکڑے، ٹکڑے کر ڈالا تھا اور ان ٹکڑوں کو سلمٰی اور غفور بڑی نہر میں بہا آئے تھے۔ تو ایسے آدمی کو کوئی بھی حادثہ پیش آ سکتا تھا۔

مینے کے ساتھ آنے والے، لاٹھیوں، کسیوں اور درانتیوں سے مسلح تھے۔ مینے کو ذرا افسوس ہوا کہ وہ آتے ہوئے گھر سے بارہ بور بھی اٹھا لاتا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟ سامنے دب کی گھنی جھاڑیاں تھیں اور ان میں کچھ ہل چل سی ہو رہی تھی۔ مینے نے ہاتھ کے اشارے سے وہیں رکنے کا کہا اور خود درختوں کی آڑ لیتے ہوئے جھاڑیوں کی طرف بڑھنے لگا۔

سامنے کی جھاڑیوں میں پھر کھڑ بڑ ہوئی اور پھر رے ایک بٹیرا اڑ کے دوسری طرف کی جھاڑیوں میں جا چھپا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی بٹیرے اڑے اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پیچھے ٹھہر جانے والوں کے مطابق شائد پانچ سو، یا اس سے بھی زیادہ بٹیرے اڑے اور ان جھاڑیوں کو چھوڑ کے دوسری جھاڑیوں میں گھس گئے۔

مینا اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ کچھ برا ہو چکا ہے۔ جھاڑیوں کے پار سے چھپاکوں کی ایسی آواز آرہی تھی جیسے ایک بڑی جسامت کی مچھلی کسی تنگ جوہڑ یا تالاب میں پھڑ پھڑا رہی ہو۔ اس کے تہہ بند کے اندر ٹانگوں پر پسینے کی دھاریں سی چل پڑی تھیں اور زبان تھوہر کے ٹھنٹھ کی طرح چرمرائی جا رہی تھی۔

ڈرتے ڈرتے وہ آگے بڑھا تو اس نے کسی انسان کو پشت کے بل زمین پہ گرے دیکھا۔ یہ غفور آرے والا تھا۔ بکری ایک طرف کھڑی لاتعلقی سے گھاس چر رہی تھی۔ جس منظر نے مینے کے ہوش اڑا دیے وہ یہ تھا کہ دونوں پھوڑے غفور آرے والے کے موٹے موٹے بازوؤں اور رانوں کو بھنبھوڑ بھنبھوڑ کر کھا رہے تھے۔ بالکل ایسے جیسے دو بھوکے شیر اپنے شکار کو بھنبھوڑ رہے ہوں۔

مزید کچھ دیکھنے کی نہ اس میں تاب تھی اور نہ یہ موقع دیر کرنے کا تھا۔ وہ پلٹ کر جس قدر تیز دوڑ سکتا تھا دوڑ کے اپنے ساتھیوں تک پہنچا۔ منہ پہ انگلی رکھ کے انہیں خاموش رہنے اور ذخیرے سے باہر نکلنے کا کہا۔ وہ اس وقت پسینے سے بھیگا ہوا تھا اور سرتاپا لرز رہا تھا۔ مینے کے چہرے پہ اس وقت اتنی وحشت تھی کہ کسی نے بھی کچھ بھی پوچھنے کی ہمت نہ کی اور جیسے اپنی جان بچانے کو تہہ بندوں کے پلوؤں میں الجھتے، شلواروں کے پانچے پھڑ پھڑاتے الٹے پیروں گاؤں کی طرف دوڑے۔

دوسری ٹولی، جس میں تین آدمی تھے، کبھی واپس نہیں آئی۔

(۱۴)

گاؤں والے نہ اتنے بودے تھے اور نہ ہی بے غیرت کہ گاؤں کے چار زندہ سلامت مردوں کے غیاب پہ خاموش ہو جاتے۔ نہ ہی میںنے میں سوائے عقل و دانش کے کوئی ایسی بات تھی کہ اس کے منع کرنے پر وہ ذخیرے میں جانے سے باز رہتے۔

لیکن واقعہ یہ ہوا کہ جب یہ سب پھولے سانسوں اور پیلے پھٹک چہرے لئے پیپل کے نیچے پہنچے تو آما دوسری بار غشی میں جا چکا تھا۔ چنانچہ سب کی توجہ کا مرکز یہ ہی ٹھہرے۔

''کیا ہوا، غفور کہاں ہے؟'' میاں اللہ یار کو معاملے کی سب سن گن مل چکی تھی۔ میںنے نے آگے بڑھ کے میاں اللہ یار کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی۔ جسے سن کے پہلے تو میاں اللہ یار کے چہرے پہ حیرت ابھری اور پھر اس حیرت کی جگہ حقارت نے لے لی ایک طرف تھوک کے واپس آنے والوں سے مخاطب ہوا، ''بھئی لعنت ہے تم ساروں کے مرد بن کے پیدا ہونے پہ۔ یہ کہتا ہے وہاں دو میںنے غفورے کا گوشت نوچ نوچ کے کھا رہے تھے، اس لیے یہ تم سب کو بھگا لایا تھا۔ اس نے جھوٹ بولا اور تم سب نے مان لیا؟ یہ کہہ دیتا کہ وہاں کھالے میں جل پریاں رہتی ہیں اور پریت پھرتے ہیں تو تم نے یہ بھی مان جانا تھا؟''

میاں اللہ یار کی بات سن کے ان سب کے چہروں پہ شدید خوف و ہراس پھیل گیا اور آما جو دوبارہ ہوش میں آ رہا تھا، اس کو سن کے چیخنے لگا۔ اس کی چیخوں سے سب کے دل جو پہلے ہی کانپ رہے تھے، دہل گئے۔

''ابا، بات وہ نہیں''۔

''اوئے تو پھر بات کیا ہے؟ ناک کو ادھر سے پکڑو، یا ادھر سے، بات تو ایک ہی رہتی ہے۔ بزدلی نہیں تو اور کیا ہے؟ کبھی میںنے بھی انسان کو کھا سکتے ہیں؟''

''یہ ہی تو ڈرانے والی بات ہے ابا! وہ دونوں میںنے جو ہمارے سامنے پیدا ہوئے تھے، غفور کی بوٹیاں کھا رہے تھے۔ میں نے خود دیکھا''۔

کمو کہتی ہے جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں، اس نے ایک کالے ناگ کو آمے کے پلنگ کے نیچے رینگتے اور

دودھ کی کڑاہی میں منہ ڈالتے دیکھا۔ لیکن وہ گوشت خور میمنوں کا ذکر سن کے اس قدر خائف تھی کہ نہ بول سکی نہ شور مچا سکی۔ ناگ دودھ پی کے لہراتا ہوا کسی طرف نکل گیا۔

میاں اللہ یار ابھی اتنا بزدل نہ ہوا تھا کہ اپنے ہی سامنے پلے بڑھے چار انسانوں کو کسی پر اسرار آفت کے ہاتھوں میں بے بس چھوڑ دیتا جو اس کے خیال میں کم سے کم گوشت خور میمنے نہیں تھے۔ اس نے گھر سے اپنی بارہ بور منگائی اور بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح اکیلا ہی ذخیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

دیہات کے لوگ یوں تو بہت بہادر ہوتے ہیں لیکن ان دیکھی آفات اور ان سنی کہانیوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ میمنوں کے گوشت خور ہونے کی خبر سن کے ان کے رہے سہے حوصلے بھی پست ہو گئے۔ جو ٹولی ابھی ذخیرے میں موجود تھی، اس میں موجود تینوں افراد کا تعلق، دوسرے گاؤں سے تھا۔ سب ایک دوسرے کو دیکھ کے خاموش تھے، جیسے یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ وہ تینوں اب کبھی زندہ واپس نہیں آئیں گے۔

میاں اللہ یار اپنی جھونک میں چلا جا رہا تھا کہ وہ اچانک اس کے سامنے آ گیا۔ سیاہ چہرے پہ اطمینان تھا اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں یاقوتوں کی طرح دہک رہی تھیں۔

''واپس ہو جاؤ'' وہ بولا تو میاں اللہ یار کو لگا کہ مسکراہٹ چھپا رہا ہے، جیسے اسے اس سب حادثے سے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔

''میرے راستے سے ہٹ جاؤ، ورنہ میں اس دن کے احسان کا بھی لحاظ نہیں کروں گا۔''

جوگی اسی طرح پنجوں پہ تنا کھڑا رہا۔ پھر مسکرایا، ''میاں اللہ یار، اگر تو اپنی اصل پہ قائم ہوتا تو تجھے اپنا وعدہ یاد ہوتا۔ اسی لئے تو مجھے لگتا ہے کہ تو میاں اللہ یار نہیں ہے۔'' وہ ایسے بولا جیسے بچے کی کسی حرکت پہ اسے سرزنش کی جاتی ہے۔

میاں اللہ یار کو دنوں بعد جوش آیا تھا اور قریب تھا کہ وہ اپنے ہوش کھو دیتے، انہوں نے ایک سانپ کو تیزی سے بھاگتے ہوئے دیکھا۔ اس کے تعاقب میں ایک بھورا چوہا تھا۔ سانپ بل کھاتا ہوا ذخیرے سے نکلا اور گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈی کی گھاس میں گم ہو گیا۔ پیچھے پیچھے چوہا۔ میاں اللہ یار کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

جوگی نے آگے بڑھ کے بڑے مربیانہ انداز میں ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور انہیں سکون سے اپنی بات سننے کا مشورہ دیا۔ سانپ اور چوہے کے اس عجیب و غریب تعاقب نے انہیں شل کر دیا تھا اور ان کی رگوں میں ہیجان برپا کرنے والے ایڈرینلین کا تناسب، دیگر شعور قائم رکھنے والے کیمیائی مادوں نے کم کر دیا، جو ابھی دیکھے جانے والے منظر نے ان کے جسم میں پیدا کر دئے تھے۔ وہ وہیں بھسل سے اسی سڑک کے کنارے پڑے ایک گھاس کے گٹھے پہ بیٹھ گئے۔

جوگی ان کے سامنے کھڑا تھا اور اس کا سیاہ فام جسم، دن کی مدھم روشنی میں کسی مجسمے کی طرح ٹھوس اور متناسب نظر آ رہا تھا۔

"یہ دیکھ رہے ہو، کیا ہو رہا ہے؟"

میاں اللہ یار چپ چاپ بیٹھا رہا، کبھی چوہا بھی سانپ کا تعاقب کرتا ہے؟ اور کیا کبھی بکری کے میمنے بھی آدم خور ہوتے ہیں؟ بولنے کو رہ کیا گیا تھا؟ وہ کہاں کے کسی سرکش قوم کے فرد تھے جو بار بار دکھائی گئی نشانیوں کی بھی پروا نہ کرتے؟ یہ دیہاتی تو اتنے خوش عقیدہ تھے کہ اگر کہیں چھ ٹانگوں والا بچھڑا پیدا ہو جاتا تھا تو اسے قیامت کی نشانی سمجھ لیتے تھے اور اپنی بھگائی ہوئی عورتیں تک ان کے ماں باپ کو لوٹانے پر تیار ہو جاتے تھے۔

میاں اللہ یار لاکھ دلیر سہی۔ لیکن تھا تو ایک دیہاتی ہی۔ ابھی وہ فضل بی بی کی موت کے صدمے ہی سے نہ نکلا تھا کہ یہ دوسرا محیر العقول واقعہ بلکہ یکے بعد دیگرے، دو واقعے پیش آ گئے۔

فضل بی بی کی موت اتنی سادہ نہ تھی جتنا لوگ سمجھ رہے تھے اور یہ بات یقیناً جوگی کو معلوم تھی۔ سانپ کے کاٹے سے مرنے والی وہ پہلی انسان نہیں تھی۔ صدیوں سے اور ان صدیوں سے پہلے کی تاریخ میں اور اس سے بھی پہلے کی تاریخ میں جو کسی کو معلوم نہیں۔ انسان مرتا رہا ہے، سانپ کے کاٹے سے۔ لیکن فضل بی بی کو سانپ نے نہیں کاٹا تھا۔

میاں اللہ یار نے جب ترمتی کو رات کے وقت عین آسمان کے بیچوں بیچ ٹنگے چاند کے درمیان دیکھا تھا تو وہ اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔ اور بات کیا تھی،، یقیناً جوگی کو معلوم تھی۔ قاعدہ ہے کہ اپنے پیاروں کے قاتلوں کا پتا لگائے بغیر چین نہیں آتا اور میاں اللہ یار کو فضل بی بی بہت پیاری تھی، اتنی پیاری کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

جنت بی بی سے جب اس کی شادی ہوئی تو وہ ایک عاقبت نا اندیش لونڈا تھا۔ ایک ان پڑھ شخص، جسے ہومر کی 'اوڈیسی' پڑھنے کے لئے دے دی جائے تو وہ کیا کرے گا؟ یہی نا کہ اس میں تصویریں تلاش کرے گا اور نہ پا کر اکتا جائے گا۔ سات لڑکے پیدا کرنے پر بھی جنت بی بی، جاہل کے طاق پر رکھی کتاب ہی رہی۔

لیکن فضل بی بی اسے اس وقت ملی جب وہ زندگی کے مدرسے میں اتنی کتابیں پڑھ چکا تھا کہ ایک ایک لفظ خوب سمجھ سکتا تھا۔ اسے وہ کسی عالم کی طرح جزدانوں میں لپیٹ کر بغل میں دابے پھرنا چاہتا تھا۔ ایک ایک زیر، زبر پہ قربان ہونا چاہتا تھا۔ اس فضل بی بی کی موت کا معمہ لاینحل رہتا تو ظاہر ہے اس کی تکلیف فزوں تر ہوتی جاتی۔

'اس رات کیا ہوا تھا؟' اس نے جوگی سے پوچھا۔ جوگی لاتعلقی سے قریب اگے اکانہہ کے درخت کے سوئی نما پتوں کو دیکھتا رہا۔

'بتاؤ کیا ہوا تھا؟'

جوگی نے گردن موڑ کے میاں اللہ یار کو دیکھا اور پھر اپنا دایاں ہاتھ ذخیرے کی طرف کر کے پھیلایا۔ ایسا کرنے سے دوپہر کا سورج اس کی ہتھیلی کی پشت سے چھپ گیا اور ان سیاہ فام انگلیوں سے سنہری روشنی کی شعاعیں سی پھوٹنے لگیں۔

ذخیرے میں چار موتیں ہو چکی ہیں، ایک موت تیرے گھر میں ہوئی، جانتا ہے نا موت بوڑھے لوگوں کے لئے ہوتی ہے جب جوان لوگ مرنے لگیں تو کیا ہوتا ہے؟ یا تو اتنا بھولا ہے کہ تجھے یہ بھی نہیں معلوم؟

میاں اللہ یار جانتا تھا اور کون نہیں جانتا؟ ہر انسان جانتا ہے کہ عورتوں کا بانجھ ہو جانا، زمین کا بنجر ہونا، صحراؤں میں فصلوں کا اگنا، دریاؤں کا سوکھ جانا، پہاڑوں کا زمین میں دھنس جانا، جوان لوگوں کا مر جانا، کس بات کی نشانی ہے؟ ماننے کا اختیار انسان کا ہے لیکن جاننا تو اس کی سرشت میں ہے اور انسان بہت ڈھیٹ ہے۔ نفی اور ڈھٹائی؛ یہ دو باتیں ایک دن اسے تباہ کر دیں گی۔ نفی یہ کہ جانتے ہوئے بھی مانتا نہیں اور ڈھٹائی یہ کہ جوان لوگوں کی موت کو بہادری اور شجاعت سمجھتا ہے، یہ نہیں جانتا کہ یہ کس بات کی نشانی ہے؟ عاقبت نا اندیش بوتا!

تو جب کسی جگہ عورتیں بانجھ، زمیں بنجر ہو جائے اور جوان مرنے لگیں تو ساری بات صاف ہو جاتی ہے۔ میاں اللہ یار سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ بھلا بنا بیٹھا تھا، یا شائد نہ سمجھا ہو۔ اس نے حیرت سے جوگی کو دیکھا۔

"جو تیرا ہے، وہ تیرا ہے۔ جو کسی کا ہے وہ تیرا کیسے ہو گیا؟ جو ہرا ہے اسے تو سکھا نہیں سکتا اور جو سوکھا ہے اسے ہرا نہیں کر سکتا۔ یہ بات میاں اللہ یار کو اچھی طرح پتا تھی اس نے تو کسی سے بحث نہ لگائی۔ اسے پتا تھی اور اچھی طرح پتا تھی، اور تو۔۔۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے اس نے سورج کے سامنے سے ہاتھ اٹھا لیا اور ایک انگلی سے میاں اللہ یار کی طرف اشارہ کیا۔

"۔۔۔تو میاں اللہ یار نہیں۔۔۔"

میاں اللہ یار جہاں بیٹھا تھا وہیں بیٹھا رہا۔ اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔

"بکریاں آدم خور کب ہوتی ہیں؟"

میاں اللہ یار چپ بیٹھا رہا۔

"چوہے زہریلے ناگ بن جاتے ہیں کب؟"

وہ بولا تو اس کے گلے کی رگیں تن گئیں۔

"ماؤں کے بغیر بچوں کو دودھ ملنے لگتا ہے، کب؟"

اس کی آواز میں ایک للکار تھی۔

"عجیب الخلقت بچے پیدا ہوتے ہیں کب؟"

اب کی بار اس کی آواز سے درختوں پہ بیٹھے پرندے گھبرا کے اڑ گئے۔ اور میاں اللہ یار تھر تھر کانپنے لگا۔

"جن ذخیروں میں بوڑھی عورتیں بھی بے دھڑک رات گئے تک باہر بیٹھنے چلی جایا کرتی تھیں، ان ذخیروں میں دن کے وقت شینہہ جونوں کی ٹولیاں، درانتیاں لے کر جاتی ہیں اور کبھی واپس نہیں آتیں، کب؟"

اور اس للکار نے جیسے زمین کی تہوں تک مار کی اور اتنے زور کا زلزلہ آیا کہ اس کی گڑگڑاہٹ سے لگتا تھا کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے اور کلیجہ پانی ہو کر بہہ جائے گا۔

میاں اللہ یار پھڑکتی ہوئی زمین پہ منہ کے بل گرا اور جیسے بھٹی میں مکئی کے دانے اچھلتے ہیں، پھدکتا رہا۔ یہاں تک کہ ذخیرے میں جتنے کیکر گرنے تھے گر گئے، آس پاس کے دیہاتوں میں اکا دکا پکی عمارتوں کے جتنے مینارے اور لینٹر گرنے تھے گر گئے۔ زمین میں دراڑیں جو پڑنی تھیں پڑ گئیں اور پھر زمین ساکت ہو گئی، بالکل ساکت چاروں طرف ایک سناٹا چھا گیا، اور اس سناٹے میں جوگی کی صاف اور واضح آواز ابھری۔

"یہ سب تب ہوتا ہے جب اپنا حصہ چھوڑ کے میرے حصے کی فکر ہو جاتی ہے۔ تیرے لئے جنگل ہیں بیلے ہیں، تیرے پالتو جانور ہیں جو سب قدرت رکھتے ہوئے بھی تجھے کچھ نہیں کہتے، تیرا پیٹ ہی بھرتے رہتے ہیں۔ اگر سانپوں، سیہوں، سوؤروں، گوہوں، چھچھوندروں کے لئے، میرے لئے، اتی سی، بس چپہ بھر جگہ چھوڑ دی گئی ہے تو تو وہاں بھی گھس آیا؟ اور کسی بے غیرت نے تجھے نہ روکا؟ تو میاں اللہ یار نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ نہ!!" جوگی نے زبان ٹخٹخائی اور گرے ہوئے درختوں کے تنوں کو پھلانگتا، گھاس کے قطعوں کو لانگھتا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے غائب ہو گیا، بھوریوں کی طرف اور میاں اللہ یار زمین پہ سجدے کے بل گرا، اپنے دل کی دھڑکن سنتا رہا جو لگتا تھا کانوں میں دھڑک رہا ہے۔

بار انفعال سے اس کے کندھے جھکے جا رہے تھے اور فضل بی بی کی معصوم صورت آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی۔ تو فضل بی بی کو میاں اللہ یار نے خود قتل کیا تھا!!

اس واقعے اور باؤ اسرار کے بورڈنگ جانے کے درمیان سات سال تھے اور ان سات سالوں میں کسی نے دوبارہ نہ جوگی کو دیکھا اور نہ میاں اللہ یار کے منہ سے بھوریوں کا ذکر ہی سنا۔

اس زلزلے سے زمین پھٹ گئی اور کہنے والے کہتے ہیں کہ ایلی من، بلیل من، وہ تینوں نوجوان اور غفورے کی ادھ کھائی لاش، اس دراڑ میں گر گئے تھے۔ اگلے جھٹکے سے زمین برابر ہو گئی اور بکری کہاں گئی، اس بارے میں راوی خاموش تھے کچھ لوگوں کے بیان کے مطابق وہ ہرا بھرا ذخیرہ چھوڑ کر بھوریوں میں چلی گئی تھی اور اس جوگی کی کٹی کے باہر بیٹھی رہتی تھی۔

بہر حال یہ سنی سنائی باتیں ہیں کیونکہ اس واقعے کے بعد کوئی شخص کبھی بھوریوں کی طرف نہیں گیا اور نہ ہی گاؤں میں پھر کوئی حادثہ پیش آیا۔

(۱۴)

سید عرفان احمد، شب خوابی کا گلجھو نہا عنابی لبادہ اوڑھے اپنے گرینڈ پیانو کے آگے بیٹھے تھے۔ ان کی لمبی مخروطی انگلیاں ساز کے پردوں پر پڑ رہی تھیں اور وہ اپنی پر درد اور پر سوز آواز میں گا رہے تھے۔

"آئے گا آئے گا، آئے گا، آنے والا
آئے گا، آئے گا۔۔!!!!!!!!!!!"

آج کل وہ اپنی جواں سال بیوی کا غم منا رہے تھے۔ حسین و جمیل شاہدہ جسے دیکھ کر جم خانہ میں تمبولا کھیلتی بیگمات حسد کے مارے جل بھن کر رہ جاتی تھیں اور جس کے پاس شیفان لیس کی نفیس ترین ساڑھیاں تھیں، جو الزبتھ آرڈن کے علاوہ کوئی برانڈ استعمال نہیں کرتی تھی، وہ شاہدہ مر گئی تھی۔ کینسر کا موذی مرض اسے ایسے چاٹ گیا تھا، جیسے دیمک ہرے بھرے درخت کو چاٹ جائے۔ لیکن اس کینسر کا یا تو انہیں علم نہیں تھا یا انہوں نے اپنے جاننے والوں کو بتایا نہیں تھا، کیونکہ شاہدہ کی موت کے بارے میں عجیب عجیب چہ میگوئیاں ہوتی رہتی تھیں۔

عرفان صاحب ان دنوں قائد آباد کے پراجیکٹ پہ کام کر رہے تھے، جب ان کے لئے شاہدہ کا رشتہ آیا۔ رشتہ لانے والے بھی کوئی معمولی شخص نہ تھے۔ ملک کے چوٹی کے بزنس مین تھے اور دور دور تک ان کا طوطی بولتا تھا۔

عرفان صاحب لاکھ پڑھے لکھے، حسین و جمیل، علیگیرین سہی، لیکن اتنی حسین اور امیر عورت کا رشتہ آنے پہ ڈر بڑا کے رہ گئے۔ ان کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ یہ نہ تھا کہ وہ کسی پتھر سے پیدا ہوئے تھے۔ اچھے وقتوں میں امروہے کے قریب ان کا پورا خاندان آباد تھا۔ پاکستان بنا تو وہ علیگڑھ سے انجینئرنگ کی ڈگری لے کے، سرکاری نوکری پانے پہ دلی گئے تھے۔ جہاں ان پہ یہ راز کھلا کہ مسلمان افسروں کو اس بات کی آزادی حاصل ہے کہ اگر چاہیں تو پاکستان چلے جائیں۔

اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں! عرفان احمد نے گھر والوں کو تار بھیج دیا کہ ہم تو پاکستان جائیں گے۔ وہ غریب پہلے تو اپنے گھروں میں سہمے سمٹے بیٹھے رہے، پھر کسی آئی کے پھیر میں گھر سے نکل پڑے۔ جو پہلی سپیشل گئی، اس میں وہ

سارا گھرانہ تھا۔ گھر کی ماما اور بڑے میاں تک مارے گئے۔ عرفان احمد کو ان کا پاکستان مل گیا، جس سے وہ دیوانہ وار پیار کرتے تھے۔ اس پاکستان نے ان کو واپڈا میں اونچے عہدے پر پہنچا دیا اور شاہدہ ان کی زندگی میں آ گئی۔

اس قدر حسن، نزاکت، نفاست، ان کا تو دیکھ دیکھ کر رعب حسن سے دل بیٹھ جاتا تھا۔ لگتا تھا شاہدہ کو چھو لیں گے تو کوئی گناہ سرزد ہو جائے گا۔

شاہدہ ان کی باتوں پر ہنسا کرتی۔ ہنستے ہنستے، اس کے شرمیلا ٹیگور کے سے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے اور وہ مارے محبت کے عرفان احمد کے بازو سے لپٹ جاتی۔

شاہدہ کے امیر ماموں نے اسے بنگلہ بنوا کر دیا۔ چچاؤں نے اٹلی اور امریکہ، اور نا جانے کہاں کہاں سے سامان منگا کر سیٹ کیا۔ ساگوان کے بڑے صوفہ سیٹ، ''تھامس چپ این ڈیل' کے تھے۔ ایک موٹر کار بھی آ گئی اور یہ جوڑا اے۔ آر خاتون کے ناولوں میں دکھائی گئی زندگی گزارنے لگا۔

صبح ہوتی تو، گورنس (جس کے پاس سب تالے کھول دینے والی ماسٹر کی تھی) بڑی خاموشی سے دبے قدموں چلتی ہوئی، جالی کے پردے چھوڑ کے مخمل کے دبیز پردے باندھ دیتی۔ سورج کی روشنی، ہلکی زمردیں سی رنگت لئے کھڑکی کے شیشوں پہ پڑتی۔ اس سرمدی دھند لکے میں جالی اور ریشم کے سرسراتے پردوں اور دبیز تکیوں والے، بیضوی چھپر کھٹ پہ شاہدہ اپنے دونوں بازو اٹھا کر انگڑائی لیتی تو عرفان احمد لرز کے رہ جاتے۔

ہر صبح وہ خود کو یقین دلاتے کہ شاہدہ کوئی خواب نہیں حقیقت ہے اور ہر رات جب وہ سونے کے لئے لیٹتے تو ایک ٹرین کٹے ہوئے جسموں سے بھری، وہ سرپٹ دوڑتی کہ وہ بھول جاتے کہ شاہدہ کون ہے۔

دونوں ابھی بستر ہی میں ہوتے کہ گورنس ان کے لئے چائے بھجوا دیتی، ڈھاکے سے آئی خوشبودار چائے، جو سفید پیالیوں میں انڈیلی جاتی تو پورا کمرہ اس کی خوشبو سے بھر جاتا تھا اور کھڑکی پہ چونچیں مارنے والا شکر خوروں کا غول بھی جیسے اس خوشبو سے مست ہو کر مارننگ گلوری کی بیلوں میں جا گھستا تھا جہاں پورا غول چائے ختم ہونے تک چاندی کی گھنٹیوں کی سی مہین مہین آوازیں نکالتا رہتا۔

بیڈٹی کے بعد عرفان صاحب اپنے اطالوی غسل خانے میں مونچھیں تراشتے، بال سنوارتے اور خود کو مختلف زاویوں سے دیکھتے اور سراہتے۔

ناشتے کی میز پر وہ سب لوازمات موجود ہوتے جو کسی بھی کولونیل افسر کی میز کی زینت ہوتے تھے۔ مکھن توس، انڈے، بھنی ہوئی کلیجی، مارملیڈ، جام، جیلی بھنا ہوا قیمہ، مصالحہ دار بھنڈی وغیرہ وغیرہ۔

انگریز کو گئے ابھی زیادہ عرصہ تو نہ ہوا تھا، پہلی سپیشل کٹنے کے زخم پہ تو انگور آ گیا تھا مگر کچھ یادیں کچھ یادوں کی نسبت، زیادہ سخت جان ہوتی ہیں۔ انگریز کی یاد بھی بہت ڈھیٹ نکلی۔

شاہدہ، ناشتے کی میز پر ہاؤس کوٹ پہن کر آتی تھی، لیکن عرفان صاحب کے جانے کے بعد خوب جم کر تیار ہوتی تھی اور پڑوس کے بنگلے میں مقیم اپنی سہیلی مسز بترا کو بلا بھیجتی تھی۔

مسز بترا، اور ان کا سارا خاندان، پاکستان بننے پر مسلمان ہو گیا تھا۔ ان کا ہندو نام، مدھومتی بترا اور مسلمان نام زینب بترا تھا۔ پاکستان بنا تو وہ اتنی ننھی تھیں کہ انہیں اپنا ہندو دور یاد ہی نہ تھا۔ گھر سے سب مورتیاں ہٹا دی گئی تھیں۔

ایک بوڑھی پردادی جو اپنا دھرم چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہ تھیں، چند چھوٹی مورتیاں اور ایک ننھا سا پوجا گھر بچائے آج بھی بترا ہاؤس کے جنوبی گوشے میں بیٹھی جانے کیا انتر منتر گھولتی رہتی تھیں۔ بیٹا بہو سب مر چکے تھے، پوتے کے کنبے سے نہ ان کو محبت تھی نہ انس اور اب تو وہ سب ملیچھ تھے کم بخت مارے۔

پردادی اس عمر میں بھی اپنا سب کام خود کرتی تھیں اور آٹھوں پہر اپنی کم نصیبی پہ روتی تھیں کہ یہ سب دیکھنے کو وہ آج تک کیوں زندہ رہیں؟ ان بدنصیب کو کیا خبر تھی کہ ان بوڑھی آنکھوں نے جو بڑھاپے کی زد میں آ کر کرنجی سے سرمئی ہو گئی تھیں، ابھی کیا کیا دیکھنا ہے۔

اس روز عرفان صاحب دفتر گئے تو شاہدہ اور مدھومتی عرف زینب بترا یا زینب عرف مدھومتی بترا نے سوچا کہ آج شام تمبولا پارٹی ہونی چاہیئے۔ دونوں سہیلیاں، کھانے کے کمرے کے ساتھ بنے پارلر میں جا بیٹھیں، جہاں بڑی بڑی فرانسیسی طرز کی کھڑکیوں سے خوب روشنی اندر آتی تھی اور ان کھڑکیوں پہ سفید گلاب کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔

یہاں مصری چمڑے کے موڑھے تھے اور گدے دار آرام کرسیاں رکھی تھیں۔ کھڑکیوں کے سامنے لکھنے کی میز پہ ہلکے گلابی کاغذ، جن پہ شاہدہ کے نام کے ابتدائی حروف "ایس۔اے" چھپے تھے، رکھے ہوئے تھے۔

دونوں سہیلیاں سنہری قلمدان سے قلم نکال کے تمبولا پارٹی کے لئے رقعے لکھنے لگیں۔ ذرا ہی دیر میں وہ اکتا گئیں اور باقی کام گورنس کے سپرد کر کے خود ٹہلتی ہوئی باغ کے عین وسط میں بنے گول چھتری کی وضع کے چھت والے گارڈن ہاؤس میں آ گئیں۔

یہاں شاہدہ کی پینٹنگ کا سامان رکھا رہتا تھا۔ اس وقت بھی ایزل پہ ان کی ایک ادھوری تصویر رکھی ہوئی تھی۔ جس میں سورج پہاڑوں کے پار غروب ہو رہا تھا اور کچھ پرندے اپنے ٹھکانوں کا رخ کر رہے تھے۔

خدا نے شاہدہ کو سب کچھ دے رکھا تھا، لیکن مصوری کا فن نہیں۔ پہاڑ، سورج، پرندے اور دھوپ کا رنگ، سب غیر متناسب، غیر حقیقی اور بے ڈھب تھے۔ پرندے کسی دیو مالائی پرندے سے ملتے جلتے تھے اور پہاڑ شائد مریخ یا کسی اور سیارے پہ دیکھے گئے ہوں۔ سورج گول تو تھا، لیکن اس میں بھرا نارنجی رنگ خاصا آتشی گلابی سا تھا۔

مدھو نے تصویر کو دیکھا اور دیر تک شاہدہ کے فن کی داد دیتی رہی۔ شاہدہ، مسکرا، مسکرا کے یہ بے داد وصول کرتی رہی۔ پھر ایک دم کھڑکی کی طرف مڑی اور بغیر کسی تمہید کے مدھو کی بات کاٹ کر بولی، "مدھو! میں تمہیں عرفان صاحب کے بارے میں ایک عجیب بات بتانا چاہتی ہوں۔"

مدھو جو اب سورج کے رنگ کی تعریف کے لئے الفاظ اور ہمت اکٹھی کر رہی تھی، چونک گئی۔

"کیا بات ہے؟"

''بات بہت خاص ہے، تم وعدہ کرو، یہ بات کسی کو نہیں بتاؤ گی؟''

''میری جان شاہدہ! بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ تم کہو اور میں کسی سے کہہ دوں؟ ممکن ہی نہیں۔''

مدھو کی یقین دہانی کے باوجود شاہدہ کے چہرے سے الجھن نہ گئی۔ اس نے ایک بار یک موو قلم اٹھایا اور اسے رنگ میں بھگو کے سورج میں مزید دہکتا ہوا رنگ بھرنے لگی۔ شکر ہے کہ اب کی بار رنگ واقعی نارنجی بنا تھا۔

وہ نہایت تیزی سے سٹروک لگا رہی تھی لیکن تصویر جتنی بے ڈھنگی تھی، اتنی ہی رہی۔ مدھو خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ ڈھیر سارے رنگ تھوپنے کے بعد وہ جیسے نڈھال ہو کے ایک گدے دار کرسی پہ ڈھیر ہو گئی۔ اس کے دونوں بازو کرسی کے ہتھوں سے نیچے لٹک رہے تھے اور چہرے پہ شدید بے بسی چھائی ہوئی تھی۔

مدھو خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ شاہدہ خود ہی بولے۔ جانے کیا بات تھی؟ دیکھنے میں تو عرفان صاحب بہت معقول لگتے تھے۔

پہلے پہل جب یہ کوٹھی بنی اور یہ دونوں میاں بیوی یہاں آباد ہوئے تو مدھو کی شادی کو فقط دو ماہ ہوئے تھے۔ مسٹر بترا اتنے شدید بزنس مین تھے کہ شادی کے تیسرے ہی دن دفتر جا گھسے۔ ہنی مون کا پروگرام آگے سے آگے ہوتا گیا۔ پچھلے چار برس میں وہ کئی کئی ہفتوں کے لئے، مری میں گورنر ہاؤس کی نچلی ڈھلانوں پہ بنے اپنے سمر ہاؤس میں رہ کر آئی تھی مگر بترا صاحب کے بغیر۔

ان کی شادی شدہ زندگی، پھپھوندی لگے بسکٹ کی طرح بدذائقہ اور بے کار ہو چکی تھی۔ ایسے میں شاہدہ اور عرفان صاحب کی طوطا مینا جیسی محبت دیکھ کرنا چاہتے ہوئے بھی ان کے سینے پہ سانپ لوٹا کرتے تھے۔

آج یہاں اس گارڈن ہاؤس میں جاتی برسات کی اس دوپہر عرفان صاحب کے بارے میں کوئی رازداری کی بات (جو یقیناً خوشگوار نہیں تھی) سننے کے تصور سے ہی مدھو کے جسم میں سرور کی پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔ اسے اپنی ماں کی بات یاد آ گئی کہ سب مردحتی بجھانے پر اور سب شادیاں چھ ماہ گزرنے پر ایک جیسی ہو جاتی ہیں۔ تاریک، اجنبی، دم گھونٹ دینے والی بکبکی اور بسا ندھی۔

شاہدہ کے چہرے پہ مردنی چھائی ہوئی تھی اور اوپری ہونٹ کے بالائی حصے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔ اس کے نازک نتھنے اس طرح گلابی ہو رہے تھے، جیسے بہت سے آنسو پیے بیٹھی ہو۔ بڑی بڑی آنکھیں جو کنول کے پھولوں کی طرح شفاف تھیں، ان میں آنسوؤں کی ہلکی سی نمی چمک رہی تھی۔

مدھو مڑی اور گنگناتے ہوئے، گل دان سے گل چین کا سفید پھول نکال کر جانے کس خیال کے تحت اپنے بالوں میں اڑس لیا۔

''مدھو!'' اب کے شاہدہ بولی تو اس کی آواز میں آنسو گھلے ہوئے تھے۔

''کہو شاہدہ! میں سن رہی ہوں''

''مدھو! عرفان صاحب۔۔۔۔'' وہ کچھ کہتے کہتے جھجک گئی اور اضطراب میں ایک پاؤں ہلانے لگی۔

مدھو نے سوچا یہ ضرور اردو فلموں والی "شیردن" ہوگی۔ پچھلے کئی ہفتوں سے وہ دیکھ رہی تھی کہ شیرون کا آنا جانا عرفان صاحب کے گھر میں بہت بڑھ گیا تھا۔ بنگالی نسل کی یہ اداکارہ آج کل فلموں کی کامیابی کی ضمانت تھی اور جم خانہ کی شاموں کا سرور۔

مدھو نے دل میں اٹھتی، سرور کی لہر کو دبا کے تشویش سے شاہدہ کو دیکھا۔

"بولو نا، شاہدہ! کیا ہوا؟ کیا کیا عرفان صاحب نے؟"

"وہ عرفان صاحب۔۔۔ بالکل بدل گئے ہیں، وہ، وہ ایک سانپ پال رہے ہیں"۔

شاہدہ نے بے ساختہ کہا۔ مدھو، چونک گئی۔ "سانپ؟ کیسا سانپ؟"

شاہدہ تھوک نگل کر بڑی دقت سے بولی، "سانپ، کالے رنگ کا سانپ!"

مدھو کا رنگ اڑ گیا اور اسے لگا اگر وہ ذرا دیر اور کھڑی رہی تو گر جائے گی۔ جلدی سے دوسری کرسی پہ بیٹھ گئی۔

"کالے رنگ کا سانپ؟" وہ سخت حیرت سے بولی۔

"ہاں، مدھو! سانپ، میں نے خود دیکھا ہے بلیئرڈ روم کے ساتھ والے باکس روم میں ایک اتنی بڑی پٹاری میں کالا ناگ، او خدایا!" شاہدہ نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپالیا اور رونے لگی۔

مدھو اپنی جگہ سن بیٹھی تھی۔ عرفان صاحب سانپ پال رہے تھے۔ اپنے گھر کے تہہ خانے میں مگر کیوں؟

اس کے ذہن میں عرفان صاحب آ گئے۔ دبلے، پتلے، باریک نقوش والے عرفان صاحب جو دبلے ہونے کی وجہ سے بہت لمبے لگتے تھے، خاص طور سے ان کے ہاتھ اتنے نازک اور انگلیاں اتنی لمبی لمبی تھیں کہ ایک بار چائے کی پیالی تھماتے ہوئے مدھو کا ہاتھ ان انگلیوں سے چھو گیا تو مدھو کو لگا وہ مہین انگلیاں برف کی لمبی لمبی قلموں کی طرح چھن چھن کر کے ٹوٹ جائیں گی۔

ان پتلی لمبی انگلیوں سے وہ اتنی مشاقی سے پیانو بجاتے تھے کہ وہ چھپ چھپ کر دیکھتی رہ جاتی تھی اور سوچتی تھی کہ یہ انگلیاں اگر کسی کے بالوں میں خاص کر جب وہ بھنور سے کالے اور ریشم سے ملائم بھی ہوں، شانہ نہیں تو کیسا رہے؟ اس سوچ پر وہ خود ہی پسینہ پسینہ ہو جاتی تھی۔

عرفان صاحب کے باریک باریک ہونٹوں کے نچلے کنارے پہ ایک ننھا سا تل تھا جو اچانک دیکھنے پر یوں لگتا تھا جیسے چاکلیٹ پیسٹری کا ذرہ لگا رہ گیا ہو۔ تلخ مٹھاس سے بھرا چاکلیٹ پیسٹری کا ذرہ! اور عرفان صاحب کی آنکھیں، خدایا! خدایا! ایسی بے چین چمکتی آنکھیں مدھو نے آج تک کسی کی نہ دیکھی تھیں۔ جیسے دو یاقوت اپنے اندرونی ابدی آگ سے دہک رہے ہوں۔

کبھی کبھار ڈنر کے بعد جب شاہدہ اور عرفان صاحب اسے جم خانہ سے گھر چھوڑنے ساتھ لے آتے تھے، (گو ایسا کل تین بار ہوا تھا،) تو یہ آنکھیں مدھو کے صدر دروازے پر لگے بڑے بڑے مرکری ہنڈوں کی روشنی میں نیلم کے جوڑے کی طرح جھلملاتی تھیں۔ شائد اسی خیال کے تحت اس نے بترا صاحب سے سری لنکا کے نیلم منگائے۔

یہ نیلم اس نے بغیر تاج کے بس آنکڑے میں جڑوا کے ٹاپس بنوا لئے تھے اور ہر وقت پہنے رہا کرتی تھی۔ اسے لگتا تھا نیلم کے اس جوڑے سے سن سن کرتی، زندگی کی لہریں اس کے پورے وجود میں دوڑتی پھرتی تھیں۔ اس کا وجود، جو خود بھی پھپھوندی لگے بسکٹ کی طرح باسی اور بے مصرف ہو چکا تھا، کسی کو اس کی چاہ نہ تھی۔

مدھو نے ہاتھ بڑھا کر اپنے کان کی لو کو چھوا، پتھر ٹھنڈا تھا، اسے جھرجھری سی آ گئی۔

''تم نے ان سے پوچھا نہیں کہ یہ سانپ وہ کیوں پال رہے ہیں؟''

شاہدہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں نہیں پوچھا پگلی؟''

شاہدہ نے ننھے سے دستی رومال سے آنکھیں پونچھیں جو سوج کر مزید حسین لگ رہی تھیں۔ باہر آسمان پہ ایک دفعہ پھر بادل اکٹھے ہو رہے تھے اور سورج گاہے ان کی اوٹ سے نکلتا تھا اور گاہے غائب ہو جاتا تھا۔

''اصل میں یہ سانپ والی بات تو بہت بعد میں ہوئی۔ تبدیلی تو ان میں اس وقت آنا شروع ہوئی، جب دریا والی بات شروع ہوئی۔''

''دریا والی بات؟'' مدھو نے حیرت سے شاہدہ کو دیکھا۔ اسی وقت کھانے کے کمرے سے ظہرانے کی گھنٹی سنائی دی۔

شاہدہ جلدی سے اٹھی چہرے پہ زبردستی کی بشاشت طاری کی اور مسکرا کر بولی، ''کتنی بری ہوں میں، لنچ کا ٹائم ہو گیا اور مجھے کوئی خیال ہی نہیں، بس تمہیں پریشان کر کے رکھ دیا میں نے، آؤ لنچ کریں''۔

مدھو خاموشی سے شاہدہ کے ساتھ، گھر کی طرف چل دی۔ بترا فیملی کے باقی لوگوں کی طرح اس میں بھی بے حد تحمل اور گہرائی تھی۔ اس زمانے میں جب کروڑوں لوگ مذہب کے نام پہ بھوت بنے، اپنی اپنی جڑیں خود ہی کھود رہے تھے، اس خاندان نے بڑے تحمل اور وقار سے مذہب نام کے چولے کو، گیروے سے ہرے رنگ میں بدل لیا اور خاموش بیٹھے رہے۔ لاکھوں لوگ کٹ مرے، لاکھوں لوگ جیتے جی مر گئے۔ ایک پوری نسل اجڑ گئی، لیکن بترا خاندان نے اپنے وقار کا ساتھ نہ چھوڑا۔

مدھو باقی کہانی سننا چاہتی تھی لیکن اصرار کر کے نہیں۔ اس وقت جب شاہدہ خود سب کچھ کہہ دینا چاہتی ہو اور وہ وقت بہت قریب تھا!!۔

(۱۵)

دریا والی بات سے پہلے جو ایک بات ہوئی تھی، اس بات کے بارے میں شائد شاہدہ بھی نہیں جانتی تھی۔ کیونکہ یہ ان دنوں کی بات تھی جب عرفان صاحب نے اپنے پورے خاندان کو گھر کی ماما اور بڑے میاں سمیت اس نئے دیس کی مٹی کے سپرد کیا تھا۔ مٹی کے ساتھ انسان کے جتنے بھی اہم رشتے ہیں ان میں سب سے اہم رشتہ تو شائد قبر ہی کا ہے۔

عرفان صاحب کے بڑے وہاں یہ ہی سوچ کر بیٹھے تھے کہ بڑوں کی ہڈیاں چھوڑ کر کہاں جائیں، اور جب چلے تو اس نئے دیس سے وہ رشتہ قائم ہوا کہ پچھلے سارے ناطے بیچ رہ گئے۔

ان ہی دنوں عرفان صاحب کے ایک دوست نے ان کو مشورہ دیا کہ تم اپنی زرعی زمین کا کلیم تو داخل کرو، نوکری تو ہے ہی، لیکن اپنا حق کیوں چھوڑا جائے۔

دفتروں اور کلرکوں کی ایک طویل فہرست تھی جس سے جھوجھنے کے بعد آخر عرفان صاحب کو وہ کاغذات ملے جن کی رو سے وہ دریائے بیاس کی پرانی گزرگاہ کے قریب، چند ایکڑ زمین کے مالک بنا دئے گئے۔

یہ چند ایکڑ چوڑی پٹی اپنی طوالت میں ایک ضلعے سے چلتی چلتی دوسرے ضلعے میں داخل ہو جاتی تھی اور اس فاصلے کو طے کرنے کے لئے اسے ایسے، بل اور موڑ لینے پڑتے تھے کہ اگر کسی طرح اس پٹی کا بلندی سے مشاہدہ کیا جاتا تو یہ گمان ہوتا کہ ایک عظیم الشان ناگ کسی مستی میں لہرایا ہوا پڑا ہے۔

خیر عرفان صاحب، اپنی کلیم شدہ زمین دیکھنے گئے تو انہیں شدید مایوسی ہوئی، ریت جھاڑیاں اور ٹوبے، ٹیلے۔ دور تک تو وہ گئے ہی نہیں، وہیں کنارے سے مٹی اٹھائی، سونگھی، دیکھی اور ہاتھ جھاڑ کر اٹھ گئے۔ زیر لب کچھ کلمات بھی کہے، جنہیں عیار پٹواری نے اپنی ذہنیت کے مطابق ڈی کوڈ کر کے ذہن میں محفوظ کر لیا۔

اس کے بعد کبھی عرفان صاحب کو اپنے بزرگوں کی امروہے کے قریب والی زرخیز زمین کے کلیم کی حسرت نہ ہوئی۔ وہ دل و جان سے اپنی نوکری میں جٹ گئے۔ تعلیم یافتہ افسر کم تھے، پورا ملک پڑا تھا سامنے۔ دریائے سندھ کی وادی جو دنیا کی زرخیز ترین زمین ہے اور جس کے ناقص ترین ٹکڑے کے وہ مالک تھے۔ اس وادی کو کشور حسین بنانا

تھا، جس کا نقشہ پون صدی پہلے گلابی چہرے والے انگریز نے دیا تھا۔

سرحد کے آر اور پار دونوں ملک جان توڑ کوشش کر رہے تھے کہ زیادہ سے زیادہ علاقے تک پانی پہنچا کر زمین کو قابلِ کاشت بنا دیا جائے کیونکہ ان کے نوطوں میں آنے والی بھوکی نسلوں کے بے شمار جرثومے کلبلا رہے تھے اور وہ جانتے تھے کہ اگر ہر ہر کھیت سے بے شمار خوراک پیدا نہ کی گئی تو یہ ٹڈی دل ایک روز، مارے بھوک کے ایک دوسرے کو کھا جائیں گے اور اگر پھر بھی پیٹ نہ بھرا تو زمین کھود کر اپنے بڑوں کی ہڈیاں تک نکال کر کھا جائیں گے۔

تو اس خوف کے تحت (گو اس خوف کے خدوخال ابھی اتنے واضح نہ تھے) سرحد کے آر اور پار، پانی کی کشمکش جاری تھی۔ آب پاشی کے منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے حریصوں کی طرح دریاؤں پہ تصرف اور ان کے منبع ہتھیانے کا نیچ کام، اس منصوبے کا حصہ ٹھہرا جو ۳ جون ۱۹۴۷ء کو ایک بظاہر بے ضرر انتظامی تقسیم کے لئے بنایا گیا تھا۔

دریا والی بات تو بہت بعد میں ہوئی پہلے تو مچھلیوں نے انسانی گوشت چکھا اور جوہڑوں میں رہنے والے کچھوؤں کی آنکھیں انسانی خون سے چپچپا گئیں اور گدھ اور کوے گھبرا گھبرا کے اتنا کھا گئے کہ ان کے پیٹ پھٹ گئے اور ان کی لاشوں کو کھانے والا کوئی نہ بچا۔ لیکن کوئی زلزلہ نہ آیا، کوئی سیلاب نہ آیا۔ آسمان پہ کسی طرح کے پرندوں کوئی جھنڈ نمودار نہ ہوا۔ آندھیاں معمول کے مطابق چلتی رہیں اور سورج کی تپش آدھا درجہ بھی آگے پیچھے نہ ہوئی۔ آسمان اور زمین اپنی جگہ قائم رہے، نہ سورج زمین کو پکڑ سکا اور نہ زمین نے اپنی جگہ چھوڑی!!

(۱۶)

دریا والی بات تیرہ یا شاید بارہ سال بعد ہوئی۔ اتنے بڑے بڑے واقعات میں وقت کا حساب کون رکھ سکتا ہے؟ اور جو وقت کا حساب رکھتا ہے وہ واقعات میں ڈنڈی مار جاتا ہے۔ وقت اہم ہے یا واقعہ؟ یہ سوچنے بیٹھ گئے تو بات رہ جائے گی۔

اس روز عرفان صاحب دفتر سے آئے تو معمول سے زیادہ پرجوش تھے۔ ان کی کافوری رنگت میں شہابیاں گھلی جا رہی تھیں۔ آنکھوں کے نیلم ایسی لو دے رہے تھے کہ شاہدہ کو لگا ابھی سب کچھ بھق سے ہو کر رہ جائے گا۔

اس شام انہوں نے جم خانہ جانے کا ارادہ بھی ملتوی کر دیا اور شام کی چائے گارڈن ہاؤس میں لگا دی گئی۔

یہاں نازک انگلش پیالیوں میں چائے پیتے ہوئے انہوں نے شاہدہ کو بتایا کہ پانی تقسیم ہو گیا ہے۔

''تبت میں ایک جھیل ہے،'' مان سرور'' جو'' کوہ کیلاش'' سے نکلتی ہے۔ اس جھیل سے دریائے سندھ نکلتا ہے جو تبت، لداخ، شمال مغربی سرحدی صوبے سے گزرتے ہوئے پنجاب میں داخل ہوتا ہے اور سندھ سے گزرتا ہوا بحیرہ عرب میں گر جاتا ہے۔ اس دوران اس میں بہت سے دریا گرتے ہیں۔ ان دریاؤں۔۔۔''

جانے وہ کیا کیا کہتے رہے، شاہدہ نے اپنے دماغ کا وہی خود کار بٹن دبا دیا جو وہ سکول کے زمانے میں سبق کے دوران دبا دیا کرتی تھی۔ اسے عرفان صاحب کے ہونٹ ہلتے ہوئے نظر آئے۔ باریک باریک شنگرفی لب، جن کے کنارے پہ ایک بھورا تل تھا، چاکلیٹ پیسٹری کے ذرے جیسا اور جی چاہتا تھا اس کے تلخ ذائقے میں کھو جایا جائے۔

''اور اس طرح پانی تقسیم ہو گیا''۔ وہ بڑے جوش سے بولے۔ شاہدہ جس چاکلیٹ کے دریا میں غوطے کھا رہی تھی، گھبرا کے اس سے باہر آئی۔ ''مگر عرفان صاحب! دریا کیسے تقسیم ہو سکتے ہیں؟''۔

''جس طرح زمین تقسیم ہو جاتی ہے۔'' انہوں نے مسکرا کے اپنی معصوم اور حسین بیوی کو دیکھا، جسے یقیناً کچھ بھی معلوم نہیں۔ جب کچھ بھی مفت مل جائے، کچھ پانے کے لئے محنت نہ کرنی پڑے تو اسے بانٹنے کو سب خوب مستعد ہو جاتے ہیں۔ دریا، زمین، آسمان، پہاڑ، انسان نے نہیں بنائے۔ اسے بیٹھے بٹھائے مل گئے ہیں۔ اس لئے اب وہ

اس کے حصے بخرے کر رہے ہیں۔

شاہدہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت بھر کے انہیں دیکھتی رہی۔ یہ بات نا جانے کیوں اس کے دماغ میں بری طرح اٹک گئی۔ حالانکہ بیشتر خوبصورت عورتوں کی طرح وہ اپنا دماغ زیادہ استعمال کرنے کے حق میں نہیں تھی، لیکن پانی کی اس مجوزہ تقسیم میں کیا بات غلط تھی، جو اس کے دماغ میں اٹک گئی۔

یہ بات اس نے کسی کو بھی نہ بتائی، اپنی جان سے زیادہ عزیز سہیلی مدھو کو بھی نہیں۔ لیکن اگلی صبح جب وہ مدھو سے ملنے اس کی کوٹھی میں پہنچی تو جانے کیوں اس کے قدم پچھلے صحن کی طرف اٹھ گئے۔ بوڑھی دادی اپنے ننھے سے پوجا گھر کے سامنے بیٹھی کمزور آواز میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔

شاہدہ نے احتراماً ساڑھی کے پلو سے سر ڈھانکا اور ذرا دور بیٹھ کر سننے لگی۔ مجال ہے جو ایک لفظ بھی پلے پڑا ہو۔ الجھ کر سامنے رکھی ''شیوا جی'' کی مورتی کو دیکھنے لگی۔ اتنا اجنبی دیوتا، جو اس قدر طنز سے مسکرا رہا تھا کہ شاہدہ کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ شیوا جی کی لمبی لمبی جٹائیں، ان کے کندھوں پہ پریشان تھیں اور ان جٹاؤں سے گنگا جاری تھی۔ ایک ہاتھ میں کمنڈل، دوسرے میں ڈمرو، ماتھے پر تیسری آنکھ، جس کو دیکھ کر شاہدہ کو جھرجھریاں سی آ رہی تھیں۔ ادھ کھلی آنکھوں میں ابدی سکوت اور ہونٹوں پہ گہری طنزیہ مسکراہٹ۔ شاہدہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی، مگر دادی جن کے چہرے پہ ناگواری کے بہت واضح تاثرات تھے، ہاتھ کے اشارے سے اسے رکنے کا کہہ رہی تھیں۔

شاہدہ وہیں سیڑھیوں پہ ٹک گئی۔ دادی اپنا پاٹھ ادھورا چھوڑ کے اس کے پاس آئیں۔ ''مدھو سے ملنے آئی ہو؟'' ان کی آواز میں بھی بے زاری تھی۔ شاہدہ کا جی چاہا، وہاں سے بھاگ جائے۔ مگر جانے کس شرم میں نہ صرف بیٹھی رہی بلکہ سر کے اشارے سے دادی کے سوال کا جواب بھی دے دیا۔

''تم مدھو کو زیادہ نہ ملا کرو'' دادی، بدمزاج تھیں مگر اتنی بے مروت ہوں گی، شاہدہ نے کبھی نہ سوچا تھا۔

''دیکھو لڑکی، جس عورت کا میاں اتنا حسین ہو، اسے سہیلیاں بناتے ہوئے سوچنا چاہیے۔ یہ سامنے والی عورت'' دادی نے اپنے سوکھے سے ہاتھ سے سامنے کے گھر کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ اس گھر والی، وہ بھی، اور وہ بھی'' انہوں نے تین چار سمتوں میں ہاتھ نچائے۔ ''سب تیرے میاں کے پیچھے ہیں اور یہ مدھو، یہ کون سی سیتا ہے؟ اری پاگل! سیتا کون ہوتی ہے؟ سب ڈرتی ہیں، دنیا سے۔ اگر انہیں ڈر ختم ہو جائے تو کون ریکھا کے اس طرف کھڑی رہے گی؟ تو تو پاگل ہے شاہدہ!'' ان کی آواز سخت تھی، لیکن شاہدہ کو لگا، وہ سچ بول رہی ہیں۔

مگر یہ کیسا سچ تھا؟ عرفان صاحب پہ سب عورتیں کیوں عاشق تھیں؟ اور دادی کو یہ بات کیسے پتا تھی؟

''دیکھ لڑکی! مرد دریا ہوتا ہے، زندگی بانٹتا ہے، اس کے کناروں پہ بستیاں بستی ہیں۔ لیکن یہ بھی سن لے، دریا کو بانٹ نہیں سکتے۔ دریا جہاں بہتا ہے وہیں کا ہوتا ہے، اور تیرا شوہر، تیرا ہے، اسے اپنا رکھ۔ ان سب میں بانٹ دے گی تو کیا خود پیاسی رہے گی؟''

شاہدہ دادی کی کھلی کھلی اور قدرے فحش گفتگو پہ شرمندہ سی ہو گئی۔ عرفان صاحب کو اس نے کب کسی کے ساتھ دیکھا تھا؟ لیکن دادی کی باتوں سے وہ چونک گئی۔ دادی بھی دریا کی بات کر رہی تھیں۔ چاہے کسی حوالے سے ہی سہی۔ یعنی سب کے حواس پہ دریا سوار تھا۔ آخر دریا اپنے راستے سے اٹھ کر ان کے گفتگو میں کیوں آ گیا تھا؟

"دریا دیوی تھا، سارے دریا دیویاں تھے۔ پھر ان میں ایک دریا، دیوتا بن کر آیا وہ سندھ تھا، تو میری بات مان، یہاں سے کہیں دور چلی جا، مدھو سے، ان سب گھروں میں رہنے والی ساری عورتوں سے دور، اپنے میاں کو لے کر چلی جا۔ ان سب کی نظر تیرے گھر پہ ہے۔"

(۱۷)

''غرض جب طالوت فوجیں لے کر روانہ ہوا تو اس نے (ان سے) کہا کہ خدا ایک نہر سے تمہاری آزمائش کرنے والا ہے۔ جو شخص اس میں سے پانی پی لے گا (اس کی نسبت یہ سمجھا جائے گا کہ) وہ میرا نہیں اور جو نہ پئے گا وہ (سمجھا جائے گا کہ) میرا ہے۔ ہاں اگر کوئی ہاتھ سے چلو بھر پانی پی لے (تو خیر، جب وہ لوگ نہر پر پہنچے) تو چند شخصوں کے سواء سب نے پانی پی لیا۔ پھر جب طالوت اور مومن لوگ جو اس کے ساتھ تھے نہر کے پار ہو گئے، تو کہنے لگے کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں۔ جو لوگ یقین رکھتے تھے کہ ان کو خدا کے رو برو حاضر ہونا ہے وہ کہنے لگے کہ بسا اوقات تھوڑی سی جماعت نے خدا کے حکم سے بڑی جماعت پہ فتح حاصل کی ہے اور خدا استقلال رکھنے والوں کے ساتھ ہے۔'' (سورۃ البقرہ ۲۴۹)

Look tafseer [illegible]

مولوی صاحب نے اتنا پڑھ کے نشانی لگائی اور احترام سے چوم کے قرآن پاک بند کیا، جزدان میں لپیٹا اور سامنے بیٹھی زینب بترا کو امید بھری نظروں سے دیکھا کہ شائد آج وہ کوئی سوال کرے، مگر وہ اسی طرح پتھرائی ہوئی بیٹھی رہی۔ چھوٹی سی تھی یہ زینب، جب مولوی صاحب نے اسے کلمہ پڑھایا تھا، قرآن سکھایا، نماز سکھائی۔ تب سے اب تک مولوی صاحب کا اس گھر سے ناطہ نہ ٹوٹا تھا۔ وہ اسی طرح آتے تھے۔ گھر کے بچوں بڑوں کو قرآن پڑھاتے، ترجمہ پڑھتے، تفسیر سناتے اور لوٹ جاتے۔

ہوتے ہوتے ان کے شاگردوں میں صرف زینب رہ گئی تھی۔ زینب نہائت خاموشی سے سب سنتی اور دہرا دیتی۔ اس نے کبھی کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ آج بھی وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔

Look

مولوی صاحب نے چند لمحے توقف کیا، اور پھر، باآواز بلند، خدا حافظ کہتے ہوئے چلے گئے۔ زینب نے قرآن پاک اٹھایا، نشانی سے کھولا اور آگے پڑھنے لگی۔ وہ کیا سوال کرتی؟ جب کہہ دیا گیا تھا کہ یہ آزمائش ہے اور اس پانی کو پینے والے سرکش ہوں گے اور خدا ان کا ساتھ نہ دے گا تو ایسی کیا مار تھی؟ سوائے سرکشی کے کون سا جذبہ تھا جس نے مجبور کیا تھا کہ اس دریا کا پانی پی لیا جائے؟ یہ ایسی مشکل بات تو نہ تھی کہ مدعو اس پہ سوال کرتی۔

سب کچھ اتنا واضح تھا، مولوی صاحب جانے کیوں چاہتے تھے کہ ان واضح ہدایات پہ پھر سے بات کی جائے، بحث کی جائے، شائد وہ بوگن ویلیا سے ڈھکے اس گول برآمدے میں دیر تک بیٹھے رہنا چاہتے تھے؟ شائد ان کو سوالوں کا جواب دینے کا شوق تھا؟ جو بھی تھا زینب کی خاموشی مولوی صاحب کو عجیب طرح سے اکساتی تھی۔ وہ بڑے بڑے مفسروں کی تفسیریں ڈھونڈھ کر لاتے تھے اور پڑھتے تھے مگر زینب نے کبھی کوئی سوال نہیں کیا۔ کرتی بھی تو کیوں؟

سامنے باغ میں بہار آ چکی تھی اور پھل دار درختوں پہ بور مہک رہا تھا۔ کیسا ظالم موسم تھا، ہر ہر شے سے روئیدگی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ درختوں کی شاخوں پہ مخملیں پتے سر اٹھا رہے تھے، جو درخت خزاں کے جاتے ہی پتے جھاڑ کے فارغ ہو گئے تھے، وہ اب مکمل ہرے تھے۔ پھولوں کا تو خیر شمار ہی ممکن نہ تھا اور ہوا میں سبزے اور رنگ برنگے پھولوں اور ان کے ریزدانوں سے اٹھتی مہک ایک پاگل کر دینے والی باس بن کر ٹھہری ہوئی تھی۔

یہ باس مدھو کے اعصاب پہ طاری ہوتی جا رہی تھی۔ دل پہ جیسے کوئی بھاری بوجھ سا آ پڑا تھا اور حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ بتر ا صاحب کسی کام سے کراچی جا چکے تھے اور اگر وہ ہوتے بھی تو کیا فرق پڑتا؟ نہ پھولوں کے کنج میں خوشبو کی سلگائی ہوئی آگ ہی مدھم پڑتی اور نہ ہی بور کے خوشے اپنے نافے بند کرتے۔ یہ خوشبو تو یوں ہی پھیلنی تھی اور اس کے اثر سے مدھو کے پپوٹے یوں ہی بوجھل ہو کے بند ہونے تھے۔ بھلا موسم کسی کے آنے جانے کا انتظار تھوڑی کرتے ہیں؟

برآمدے کی سیڑھیاں اتر کے وہ لان میں آ گئی۔ آسمان پہ بہار کے بادل پھیلے ہوئے تھے۔ مدھو نے دھریک کی ایک جھکی ہوئی شاخ سے ایک چھوٹا سا گچھا توڑ لیا اور سر جھکا کے اس گچھے کو سونگھا۔ اس خوشبو نے اسے وہاں سے اٹھا کے سکول کے دنوں میں پہنچا دیا۔ کتنے بے شمار درخت تھے۔ صدر دروازے سے لے کر اس کی جماعت کے کمرے تک، کاسنی کاسنی پھولوں سے سڑک ڈھکی ہوئی ہوتی تھی اور یہ ہی پاگل کر دینے والی خوشبو ہوا میں ٹھہری ہوئی ہوتی تھی۔

وہ بلاوجہ مسکرائی اور پھولوں کا گچھا ساڑھی کے بروچ میں اڑس لیا۔ زمین و آسمان، پیڑ پودے، سب کچھ کتنا نیا تھا ابھی ابھی "کن" کی گونج ختم ہوئی تھی اور ابھی ابھی سارے رنگوں نے جنم لیا تھا۔ دادی پچھلے برآمدے میں پڑھ رہی تھی، جانے کیا کیا؟ وہ سب اب مدھو کے لئے بہت اجنبی تھا، لیکن اب بھی اسے ہلکا سا یاد تھا کہ ایک موٹے سے مدور توند والے ننگے پنڈے سوامی جی آیا کرتے تھے اور یہیں اس برآمدے میں آلتی پالتی مار، گلے میں جنیو ڈالے جانے کیا اتر منتر پڑھتے تھے (مدھو) کے باپو، ماتا، جو اب امی ابو تھے، دادی، پردادی اور آس پاس کے ہندو محلے دار، سر جھکا کے سنا کرتے۔ وہ کیا کہتے تھے، اسے نہ تب سمجھ آیا تھا اور نہ اب یاد تھا۔ ہاں ایک کہانی اسے یاد تھی جو باپو نے اسی برآمدے میں اسے سامنے بٹھا کر سنائی تھی۔

ایسا ہی دن تھا، دھریک اور آم کے بور کی یہ ہی پاگل کر دینے والی مہک تھی اور باپو جی نے بتایا تھا۔ ایک بہت ہی بڑے رشی، مہارشی، وشوامتر کے بارے میں۔ کیا بتایا تھا؟ مدھو آم کے پیڑ کے نیچے رکھے بنچ پہ بیٹھ گئی۔ گو وہ سب

کچھ وہ اب بھول چکی تھی، لیکن آج خوشبوؤں کے اس ہجوم میں اسے یاد آیا کہ ابو نے اسے وشوامتر کی کہانی سنائی تھی ۔۔۔''اور جب وشوامتر، گائے کی طرف بڑھا تو نندنی نے کہا،''اے بلبھا تو مجھے ہاتھ لگائے گا اور وشسٹھ تم کھڑے دیکھ رہے ہو۔'' پھر واشسٹا نے اپنی طاقت سے کشک کے سارے لشکر کو ختم کر دیا۔

کشک کو تب معلوم ہوا کہ بادشاہوں کی طاقت سے زیادہ طاقت رشیوں کے پاس ہوتی ہے تب وہ وہاں سے سیدھا ہمالہ چلا گیا اور ایک کنڈ کے پاس آسن جمالیا۔''

''مگر باپو! اسے نندنی کیوں چاہیے تھی؟ وہ تو بادشاہ تھا۔''

''بادشاہوں کو اپنے فوجیوں کا پیٹ بھرنا ہوتا ہے، مدھورانی! اور اگر نندنی اس کے پاس ہوتی تو اس کی فوجیں کبھی بھوکی نہ مرتیں۔''

مدھو نے نظر اٹھا کے سامنے پھیلی بہار کو دیکھا۔ جیسے شاہدہ نے بے دھیانی میں رنگ اچھال دیئے ہوں، تیز تیز رنگ۔ شاہدہ کے خیال کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں عرفان صاحب کی تصویر جیسے کوندسی گئی۔ ایک جھرجھری سی پیر کے انگوٹھوں سے لے کے سر کی چوٹی تک سرائیت کر گئی۔ اس نے سر جھٹک کے برسوں پہلے کی اس شام کو پھر سے یاد کرنے کی کوشش کی جب ابو نے اسے وشوامتر کی کہانی سنائی تھی۔

''۔۔۔اور جب وششٹا نے بھی اسے رشی مان لیا تو وہ پھرنے لگا۔ جگ میں اس کا چرچا ہو گا اور جب تری شانکو کو وششٹا کے سو بیٹوں نے بددعا دی کہ جا چنڈال ہو جا اور وہ چنڈال ہو گیا اور وشوامتر کے پاس آیا۔ اپنی باتوں سے اس نے وشوامتر کو اتنا بھڑکا دیا کہ اس نے اپنی طاقت استعمال کر کے تری شانکو کو اس کے جسم سمیت سورگ میں پہنچا دیا لیکن سب دیوی دیوتاؤں کو یہ بات نہ بھائی اور اندر نے اسے پھر زمین کی طرف دھکیل دیا۔ وشوامتر نے دوبارہ آسمان کی طرف دھکیلا اور ایسا تین چار بار ہوا اور تری شانکو نے کہا کہ میں باز آگیا ہوں، لیکن اب وشوامتر اپنے کہے سے کیسے پیچھے ہٹتا؟ اس نے تری شانکو کو سورگ میں پہنچانا تھا۔

پس اب اس نے ایک نئی سورگ بنائی، نئے دیوی دیوتا بنائے، نیا اندر بنایا اور جب وہ یہ سب کچھ بنا چکا تو اس کی سب طاقت، جو اس نے کئی صدیوں کی تپسیا کے بعد حاصل کی تھی ختم ہو گئی۔ اب وشوامتر ڈرا کیونکہ اگر یہ دنیا اپنے مدار پہ نہ گھومتی تو پہلے سے قائم، اس دنیا پہ آگرتی اور سب کچھ ختم ہو جاتا تب اس نے رام کو پکارا کہ اب یہ دنیا (سورگ) جو میں بنا بیٹھا ہوں، اس کو چلا۔ رام نے کہا کہ یہ دنیا تم نے بنائی ہے تو اس کو چلاؤ بھی۔ لیکن یہاں وشوامتر عاجز تھا۔ پھر رام اس سورگ میں داخل ہو گیا اور کہا کہ دنیا بنانا، سورگ بنانا، یہ میرا کام ہے، دیوتاؤں کا کام، آئندہ اس کام میں مت پڑنا۔ وشوامتر فوراً ہی اپنی غلطی مان گیا، وہ سورگ، وہ دیکھو، وہاں کہیں آسمان پہ ایک تارہ ہے۔۔۔''

مدھو نے سامنے دیکھا، آتی ہوئی شام کی ہلکی سی سیاہی آسمان پہ پھر گئی تھی اور درختوں کے جھنڈ سے جھلکتے آسمان پہ دب اکبر جھلملا رہا تھا۔ کتنی عجیب اور اجنبی کہانی تھی اس وشوامتر کی اسے کیونکر یاد تھی؟ مدھو کا جی چاہا کہ اٹھے

اور شاہدہ کے ہاں چلی جائے۔ اس روز کے بعد وہ دوبارہ وہاں نہیں گئی تھی۔ گو اس کے ذہن میں عرفان صاحب کے پاس روم کی پٹاری کا ناگ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ وہ جاننا چاہتی تھی مگر اتنے دن گزر گئے اور مزید کوئی بات نہ ہوئی اس روز کی تمبولا پارٹی کے بعد کوئی ہلا گلا بھی نہ ہوا۔ اتنا انتظار کرنے سے بہتر یہ نہ تھا کہ یہاں سے اٹھا جائے اور شاہدہ کے ساتھ کہیں جانے کا پروگرام بنایا جائے۔ اور کچھ نہیں تو کچھ روز مری کے سرہاؤس ہی میں گزار لئے جائیں۔" ہائے رے زندگی"۔ مدھو نے انگڑائی لی اور بنچ سے اٹھ کے شاہدہ کے گھر کا رخ کیا۔

(۱۸)

دریاوالی بات اس روز ہوئی جب عرفان صاحب منگلا ڈیم کے منصوبے کی فائلیں دیکھ رہے تھے۔سندھ طاس کے منصوبے کے مطابق جو تین دریا ہندوستان کو دیئے گئے تھے ان کے پانی کی کمی کو پورا کرنے کے لیے جو ڈیم بنانے تھے ان میں سے پہلا منگلا ڈیم تھا۔یہ ڈیم دریائے جہلم پہ بنایا جا رہا تھا جو لوگ اس ڈیم کے بننے سے بے گھر ہو رہے تھے ان کے لیے حکومت نے انگلستان سے ورک پرمٹ حاصل کر لیے تھے۔میر پوریوں نے اب انگلستان بسانا تھا۔ شاہدہ یہ بات سن کر اداس ہوئی تھی لیکن عرفان صاحب کے نزدیک یہ کوئی ایسی بات نہ تھی وہ بھی تو کہیں سے آ کر کہیں بسے تھے اور جہاں آ کر بسے تھے۔اسے بسانے کے لیے چند لوگ اور ادھر سے ادھر ہو گئے تو کیا ہوا؟

تو خیر ان دنوں ایک روز دوپہر کو جب گرمی اپنے عروج پہ تھی اور شاہدہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی تو ایک کالا بھجنگ نیم ننگا آدمی عرفان صاحب سے ملنے آیا۔ملازم نے روکا تو اس نے لال لال آنکھوں سے ایسا گھورا کہ جان ہی نکل گئی۔پھر وہ خود ہی دندناتا ہوا ان کی اسٹڈی میں گھس گیا۔ملازم بتاتے ہیں کہ وہ پورے دو گھنٹے وہاں رہا اور جب وہ نکلا تو خالی ہاتھ تھا۔آتے ہوئے اس کے ہاتھ میں کچھ تھا۔لیکن کیا تھا یہ کسی ملازم کو یاد نہیں۔

رات کے کھانے پہ شاہدہ نے محسوس کیا کہ عرفان صاحب کچھ خاموش ہیں۔لیکن اس نے کام کا دباؤ سمجھ کے نظر انداز کر دیا۔مگر آنے والے چند دنوں میں اس نے محسوس کیا کہ وہ بالکل بولتے جا رہے ہیں تب اس نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ وہ دریا والی بات سے پریشان ہیں۔

''دریا والی بات کیا ہے؟'' شاہدہ نے ان کے ریشم کے لچھوں جیسے بال پیشانی سے ہٹائے۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ تین مشرقی دریا، بیاس، ستلج اور راوی کا پانی اب ہندوستان کا ہے۔ہم صرف اس بات کے پابند ہیں کہ دریاؤں کی گزرگاہوں میں آبادیاں نہ بنائیں کیونکہ دریا اپنے پرانے راستوں پر کبھی بھی آ سکتے ہیں۔کسی بھی موسمی تبدیلی کی وجہ سے۔''

''ہاں! یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔''

''تو......اب......اب ایسا ہے کہ بیاس، بیاس سوکھ جائے گا، بالکل ختم ہو جائے گا۔''

یہ کہتے ہوئے ان کا رنگ زرد پڑ گیا اور ماتھے پر پسینے کے قطرے پھوٹ نکلے۔ شاہدہ کو سخت حیرت ہوئی۔

"پیاس تو پہلے ہی کہاں بہتا ہے؟ شاید انڈیا ہی میں کہیں ستلج سے مل جاتا ہے اور یہاں تو بس نالا سا ہی ہے۔"

عرفان صاحب نے دستی رومال سے پسینہ پونچھا اور بستر کے ساتھ رکھی میز پر کروشیئے کے گلاس کور سے ڈھکے گلاس کو اٹھا کر پانی پیا۔ نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں شاہدہ! دریا کو سوکھنا نہیں چاہیے۔ جانتی ہو دریا سوکھ جائیں تو کیا ہوتا ہے؟"

اب کے شاہدہ نے نفی میں سر ہلایا۔ اسے عرفان صاحب پہ ترس آیا۔ کام کے دباؤ نے ان کو جیسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا اور اب یہ نئی لے لگ گئی تھی۔

"دریا تو نہیں سوکھیں گے، بتا تو رہے تھے آپ کے کچھ لنک کینالز بنائیں گے مغربی دریاؤں کا پانی مشرقی دریاؤں میں اور......"

عرفان صاحب عجلت اور اضطراب میں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"نہیں شاہدہ! نہیں۔ وہ سب غلط ہے ایسا نہیں ہو سکتا شاہدہ، ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے! کیسے ہو سکتا ہے؟"

شاہدہ نے اپنی مہین نائٹی کا سٹریپ کندھے پہ درست کیا اور اٹھ کے ان کے قریب چلی گئی۔ بہت ہمدردی سے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور چونک گئی۔ وہ کانپ رہے تھے۔ بری طرح لرز رہے تھے ایسے جیسے مارننگ گلوری کی بیل پہ سے شکر خوروں کا جھنڈ ایک دم بھرّ امار کے اڑ جائے اور وہ بیل کھڑکی کے سائبان تلے لرزتی رہ جائے۔

"عرفان! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ کیا ہوا؟ کیا دفتر میں کوئی پریشانی ہے؟"

عرفان صاحب نے سختی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

ان کے ماتھے پہ بل پڑے ہوئے تھے اور سانس ایسے چل رہی تھی جیسے کسی ان دیکھے بوجھ نے پسلیوں کو پھیپھڑوں کے ساتھ چپکا دیا ہو۔

"نہیں شاہدہ ایسا ممکن نہیں، دریا میں اپنا ہی پانی بہتا ہے۔ یہ دیکھو یہ میرا بازو ہے، میری رگیں، میری وریدیں ان میں میرا خون بہتا ہے، میرا ایک بلڈ گروپ ہے ایک بلڈ کمپوزیشن ہے۔ تم مجھ سے اور میں تم سے کتنی ہی محبت کیوں نہ کریں اگر میرا سب خون نچوڑ کے تمہارا خون مجھ میں ڈال دیا جائے تو کیا ہوگا؟ نہ تم بچو گی نہ میں اور اگر ہم دونوں بچ بھی گئے تو تم کب تک اپنا خون مجھ میں ڈالتی رہو گی؟ پھر ہم سوائے خون کے تبادلے کے اور کیا کر پائیں گے شاہدہ؟ سوچو؟ سوچو، ایسا انسان جس میں کسی دوسرے کا خون ہو اور وہ انسان جس کا خون مسلسل دوسرے انسان کو دیا جا رہا ہو، کیا وہ دونوں انسان زندہ ہوں گے؟ اور اس زندگی کو تم زندگی سمجھو گی؟"

شاہدہ نے دیکھا کہ یہ کہتے ہوئے وہ تھر تھر کانپ رہے تھے اور ان کا رنگ زرد پڑنا شروع ہو گیا تھا۔

"عرفان! عرفان!" شاہدہ نے ان کے بج پڑتے ہاتھوں کو اپنے گرم ہاتھوں میں تھام لیا۔

"عرفان اہم انسان ہیں۔ بھلا انسان اور دریا میں کیا مماثلت۔ آپ بیٹھ جائیں عرفان، یہاں..... میں کمرے کی کھڑکیاں کھول دیتی ہوں، آپ کو تازہ ہوا چاہیے۔"

عرفان صاحب نے شاہدہ کے ہاتھوں کو اپنے سرد ہاتھوں میں زور سے دبوچ لیا۔ انہیں آکسیجن چاہیے تھی، تازہ ہوا۔ ہوا، پانی، خوراک، انسان کی بنیادی ضروریات ہے۔ صرف انسان کی ہی نہیں سبھی جانداروں کی بنیادی ضرورت دریا میں بھی تو پانی ہوتا ہے اور پانی کیا ہوتا ہے یہ عرفان صاحب کو اب معلوم ہونا شروع ہوا تھا جب سندھ طاس منصوبے پہ دستخط ہو چکے تھے۔ تین بڑے ڈیم، کئی بیراج، رابطہ نہریں اور نہروں کے موگھے اور نالے اور نالوں میں بہتی ہوئی ننھی ننھی مچھلیاں، جن پہ سفید بگلے گھات لگائے ہوئے بیٹھے تھے اور اُکا نہہ کے منہ میں ایک بگولا خوف سے پھولا ہوا کھڑا تھا اب، اب ان پہ یہ راز کھلا کہ یہ سب کیا ہو گیا تھا۔ دریا سوکھ رہا تھا۔ دریائے بیاس کا مغربی حصہ جو اپنڈکس کی طرح دریاؤں کے اس قدرتی نظام میں ایک طرف کو پڑا تھا، سوکھ رہا تھا۔

اب کیا ہو سکتا تھا؟ میر پوریوں کو ورک پرمٹ مل گئے تھے۔ تربیلا کھد رہا تھا، بستیاں خالی کی جا رہی تھیں، انسان نے اپنے بچاؤ کا سب انتظام کر لیا تھا لیکن وہ بہت سی مخلوقات کو بھول گیا تھا۔ مخلوقات کو تو خدا بھی نہیں بھولتا۔ خدا کیسے بھول جائے؟ خالق اپنی تخلیق کو اس وقت تک نہیں مٹاتا جب تک اسے مٹانا ناگزیر نہ ہو جائے۔

> "تو ہم نے اسے وحی بھیجی کہ ہماری نگاہ کے سامنے اور ہمارے حکم سے کشتی بنا پھر جب ہمارا حکم آئے اور تنور ابلے تو اس میں بٹھا لے ہر جوڑے میں سے دو اور اپنے گھر والے، مگر ان میں سے وہ جن پر پہلے بات پڑ چکی اور ان ظالموں کے معاملے میں مجھ سے بات نہ کرنا، یہ ضرور ڈبوئے جائیں گے" (المومنات: ۲۷)

شاہدہ خاموش ہو گئی۔ عرفان صاحب بدل گئے تھے ان کا میدہ شہاب رنگ کا مشکی ہونا شروع ہو گیا تھا اور اس رنگ میں ہلدی کا رنگ گھل سا گیا تھا۔ ان ہی دنوں شاہدہ نے بلیئرڈ روم کے ساتھ والے باکس روم میں وہ پٹاری دیکھی اور اس میں وہ سانپ۔ کچھ برا ہونے والا تھا بہت برا۔ شاہدہ کو عرفان صاحب کی بہت فکر تھی۔ وہ بیٹھے بٹھائے کھو جاتے تھے ان کا سارا جسم ایک عجیب بدبودار سے پسینے میں بھیگا رہنے لگا تھا اور ان کی کانوں کی لوؤں پہ موٹے موٹے بال نکلنے شروع ہو گئے تھے۔ ناخن اور مسوڑھے رنگ بدل رہے تھے اور کبھی کبھار بہت قربت کے لمحات میں شاہدہ کو لگتا تھا کہ وہ کوئی اور آدمی ہیں۔ ایک ایسا آدمی جسے وہ نہیں جانتی تھی بالکل بھی نہیں۔ یہ سب باتیں وہ مدھو کو بتانا چاہتی تھی لیکن صرف سانپ والی بات بتا کر ہی اسے یوں لگا کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ وہ مدھو سے چھپنے لگی۔ کلب کی مصروفیات، کافی پارٹیز سب سے کترانے لگی۔ بھلا وہ مدھو کا سامنا کیسے کر سکتی تھی کیونکہ اسے اور صرف اسے معلوم تھا کہ عرفان صاحب سانپ پال رہے ہیں۔ اپنے ہی گھر میں سانپ۔

(۱۹)

مدھو جب شاہدہ کی کوٹھی میں داخل ہوئی تو اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس کی ملاقات عرفان صاحب سے ہو جائے گی۔ وہ باغ کی روش پہ نپے تلے قدم رکھتی گارڈن ہاؤس کی طرف جا رہی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ بہار کے اس ابرآلود دن میں اسے شاہدہ وہیں ملے گی۔ لیکن اس سے پہلے ہی گل مہر کے درخت کے نیچے اسے عرفان صاحب نظر آگئے۔ وہ آنکھیں بند کیے آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے پہلے تو زینب نے چاہا کہ خاموشی سے غائب ہو جائے۔ لیکن اس وقت تک عرفان صاحب آنکھیں کھول چکے تھے اور ان کی آنکھوں میں دبی وہی ابدی آگ اپنی تپش میں بھڑک رہی تھی۔

"مدھومتی"۔ انہوں نے اس کا پرانا نام (جو وہ اب خود بھی بھول جانا چاہتی تھی) لیا۔ مدھو خاموشی سے ان کے قریب جا کے دو زانو بیٹھ گئی۔ چند ساعتوں تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ آسمان پہ بہار کے بادل جمع ہو رہے تھے سفید بادل جن کے کنارے سورج کی چمک سے نقرئی ہو رہے تھے اور ان بادلوں کو ڈھانپنے کو سیاہ بادلوں کا ایک بڑا سا گروہ شمال سے چلا آ رہا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی اور روئیدگی کی خوشبو۔ کائنات جو ابھی ابھی بنی تھی، اس کے ہر کونے سے زندگی پھوٹ رہی تھی۔ زندگی جو شکست نہیں مانتی، جو چلتے رہنا چاہتی ہے، اپنا تسلسل قائم رکھنے کو ہر ڈھنگ اپناتی ہے۔ وہی زندگی ہرن کے نافے سے اٹھتی خوشبو کی طرف ہر کونے کھدرے سے سر اٹھا رہی تھی۔

مدھو نے چور نظروں سے عرفان صاحب کو دیکھا۔ ہر وقت سوٹ بوٹ میں ملبوس رہنے والے عرفان صاحب اس وقت وضو کے لیے پہنی جانے والی کھڑاؤیں اور چارخانہ تہہ بند باندھے بیٹھے تھے ان کا اوپری بدن بالکل برہنہ تھا اور چور نظروں سے دیکھنے پر بھی یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے سفید موم کا مجسمہ بنا کے گل مہر کے درخت کے نیچے رکھ دیا ہو۔ عرفان صاحب کا رنگ بے حد صاف تھا اور جلد اتنی مہین اور شفاف کہ جسم کی رگیں اور وریدیں چھلکی پڑتی تھیں۔

جانے وہ کیوں اس وقت یوں نیم برہنہ یہاں بیٹھے تھے؟ سب گھر والے، نوکر چاکر، شاہدہ، کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک سناٹا سا سب طرف طاری تھا اور ماسوائے ایک کوئل کے جو نا جانے کہاں بیٹھی ایک ساں بولے جا رہی تھی۔ باقی ہر طرف خاموشی تھی۔

ہوا میں ٹھہری رنگ رنگ کے پھولوں کی خوشبو اور آم کے بور کی امڈتی ہوئی مہک مدھو کے اعصاب پہ بھلی طرح اثر انداز ہو رہی تھی۔ عرفان صاحب بہت مضطرب تھے۔ مدھو نے چاہا وہ ان سے کچھ پوچھے لیکن آواز حلق میں مچھلی کے کانٹے کی طرح اڑ گئی اس نے بولنا چاہا تو بس منمنا کے رہ گئی۔

"مدھوا میں استعفیٰ دے رہا ہوں" عرفان صاحب نے بہت سکون سے اسے اطلاع دی، جیسے ان دونوں کے درمیان کوئی بہت گہرا تعلق ہو۔ مدھو اس اطلاع پہ حیران سی رہ گئی۔ اتنی اچھی نوکری سے استعفیٰ کیوں دے رہے تھے؟ اور استعفےٰ دینے کے بعد یہ ٹھاٹ باٹ کی زندگی کیسے گزاری جائے گی؟

شاہدہ تو ایک لمحہ بھی ان آسائشات سے دور نہیں رہ سکتی تھی۔ یہ سب سوچتے سوچتے اس نے بے دھیانی سے عرفان صاحب کو دیکھا اور اب اسے اندازہ ہوا کہ یہ وہ عرفان صاحب نہیں تھے۔ جن سے وہ واقف تھی۔ وہ نرم چہرہ، وہ دھیمے تاثرات غائب تھے۔ عرفان صاحب کا چہرہ ایک سخت گیر مرد کا چہرہ لگ رہا تھا جو جنگیں اور قحط اور مصائب، جھیل چکا ہو اور آنے والے مصائب سے پہلے سکھ کے چند لمحے جینا چاہتا ہو۔ صرف چند لمحے۔

پھر عرفان صاحب اسے بتانے لگے کہ دریائے بیاس کا جو حصہ پاکستان میں ہے وہ سوکھ جائے گا۔ زینب حیران ہوئی کیونکہ اس بات سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

"تم نے وشوامتر کی کہانی سنی ہے مدھوتی" عرفان صاحب نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا مدھو کو حیرت ہوئی ابھی وہ یہ ہی تو سوچ رہی تھی کہ ایک روز بترا صاحب نے اسے وشوامتر کی کہانی سنائی تھی۔ لیکن یہ عرفان صاحب کو اچانک وشوامتر کہاں سے یاد آگیا؟ وہ تو انجینئر تھے، پل، نہریں، ڈیم، بیراج اور سڑکیں بنانا ان کا کام تھا۔ یہ دیومالائی کہانیاں، جن کو سن کے اپنا وقت ضائع کرنا اب کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ ان کہانیوں کی کھوج ان کو کیونکر ہوئی؟

ہوا کا ایک جھونکا آیا اور آم کے بور کی خوشبو کا بھپکا مدھو کی ناک سے ٹکرایا۔ اف اس خوشبو سے دانتوں میں کیسی چل سی اٹھی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ کچھ نہیں تو یہ سامنے بیٹھے عرفان صاحب کے موم سے بنے شانے میں ہی دانت گڑو دیے جائیں۔ مدھو کو اپنے اس بے ہودہ خیال پہ اتنی شرم آئی کہ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے پھوٹ نکلے۔

"وشوامتر کی کہانی میں نے پڑھی نہیں، مجھے کسی نے سنائی ہے۔ جانے غلط ہے یا صحیح۔ میں تم سے اسی لیے پوچھ رہا ہوں کہ اگر تمہیں معلوم ہو تو مجھے سناؤ۔"

اور پھر مدھو نے گل مہر کے اس درخت کے نیچے بیٹھ کے عرفان صاحب کو وشوامتر کی کہانی سنائی، مینکا کی آمد بھی، ہری شانکو کا آنا بھی۔ جب وہ نئی سورگ پہ پہنچی تو عرفان صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ مدھو نے دیکھا ان کے چہرے کی رنگت متغیر ہو رہی تھی۔ ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

"پھر سے بتانا، وشوامتر نے کیا کہا؟" انہوں نے بڑی آس سے مدھو سے پوچھا، جیسے پہلے جو کچھ انہوں نے سنا، وہ جھوٹ ہو، فریب ہو انہیں سننے میں غلطی ہوئی ہو۔ لیکن دوبارہ سننے پر بھی وہی تفصیلات تھیں کہ کس طرح ایک

عام انسان اپنی ہوس میں فقیروں کو للکارتا ہے اور پھر جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ دولت اور دنیاوی طاقت سے بڑی چیز علم ہے تو وہ ''تپسیا'' پہ جت جاتا ہے۔

''تپس''، یعنی ''تپش''، یعنی وہ ازلی اور ابدی آگ جو انسان کے دل میں چھپی ہے، جس میں تپ کے وہ کندن بنتا ہے۔ اور اس ''تپس'' کے لفظ سے ''س'' کا لفظ نکلا۔ ''ویاس'' اور جب انہوں نے مدھو سے تیسری دفعہ یہی کہانی سنانے کو کہا تو شام بہت جھک آئی تھی، اودے بادل گھر چکے تھے اور ہوا بالکل تھم گئی تھی۔ درخت کے نیچے ایک حبس تھا اور اس حبس میں عرفان صاحب کے جسم سے اٹھتے پسینے کی ہلکی سی باس ایسے ٹھہری ہوئی تھی جیسے گوشت خور درندے کے بھٹ میں خون کی باس۔

مدھو نے اب کی بار بہت رک رک کے بتایا کہ وشوامتر جب سورگ بنا چکا تو اس کی ساری طاقت ختم ہوگئی اور اب وہ اس سورگ کو چلا نہیں سکتا تھا۔

''بس کرو مدھو'' عرفان صاحب نے تڑپ کے اس کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ دیا۔ کنج میں درخت کے نیچے گھنا اندھیرا تھا۔ اسی وقت بادل بہت زور سے گرجا۔ بجلی کی چمک سے سارا باغ چکا چوند ہوگیا۔ ایک بار پھر زور کا کڑاکا ہوا اور مدھو ڈر کے عرفان صاحب سے چمٹ گئی۔ پھر تین بار بجلی اور چمکی اور جب تیسری بار کڑکی تو اس کڑک میں ایسا شور تھا کہ مدھو کو لگا اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ وہ اور زور سے عرفان صاحب کو چمٹ گئی اور اس نے اپنے سفید دانت ان کے کندھے میں گڑو دیئے۔ جیسے وہ کسی چیخ کو روکنا چاہتی ہو۔ ایک ایسی چیخ جو بجلی کی اس کڑک سے بھی مہیب اور بھیانک ہو جو اس کے جسم کی بنیادوں سے اٹھی ہو اور زلزلے کی ہولناک گڑگڑاہٹ کی طرح سب طرف چھا جانا چاہتی ہو۔

اسی وقت بجلی چھٹی بار چمکی اور باغ کے بیچوں بیچ بنی لکڑی کی برساتی پر گری۔ لمحہ بھر کو سب روشن ہو گیا۔ اجنتا اور ایلورا کے غاروں سے لے کر کیپ ڈوکیا کے کھاؤں تک۔ تاج محل کے گنبد سے بیاس کے بیٹ تک سب سفید روشنی میں نہا گئے اور پھر بارش شروع ہوگئی۔ بھڑ بھڑ جلتی ہوئی برساتی کے عقب میں گل مہر تلے کا منظر شاہدہ نے باغ کی روش پہ سے دیکھا اور اپنی جگہ کیل دی گئی۔ شائد وہ وہاں سے کبھی نہ ہل سکتی اور کوہ ندا کے مجسموں کی طرح وہیں پتھر کی ہو جاتی اگر بارش میں گرنے والی مچھلیاں اس کے کندھوں اور بازوؤں کو زخمی کرتی ہوئی باغ کی روش پہ گر کے پھڑ پھڑ نہ تڑپتیں۔

شاہدہ نے ایک دہشت میں یہ منظر دیکھا۔ آسمان سے پانی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں گر رہی تھیں جن کی آنکھیں کسی ازلی اور ابدی حیرت میں چری ہوئی تھیں اور وہ اپنے ننھے ننھے منہ بار بار کھول رہی تھیں، جیسے کچھ کہنا چاہتی ہوں، صدیوں کے ارتقاء کے سفر میں انسان نے اپنی زبان جانوروں سے الگ کر لی تھی۔ مچھلیاں ایک کے اوپر ایک گرتی رہیں۔ منہ کھولتی بند کرتی، اپنی حیرت بھری آنکھوں سے شاہدہ کو دیکھتی اور ان کی دموں اور جانوں کی رگڑ سے شاہدہ کی مہین لیس کی ساڑھی چیتھڑا چیتھڑا ہوگئی۔ شاموز کے بلاؤز کی دھجیاں اڑ گئیں اور اس کی نازک جلد پہ جگہ

جگہ خراشیں سی پڑ کے خون رسنے لگا۔

یہ باغ، جس میں برساتی کا چوبی کھنڈر سلگ رہا تھا اور جس کی روشوں، گھاس کے قطعوں اور پھولوں کی کیاریوں میں ہزارہا آسمان سے گرنے والے آبی جانور منہ کھول کھول کے اکھڑے اکھڑے سانس لے رہے تھے اور جہاں ایک درخت کے نیچے عرفان صاحب اور مدھو اسی طرح بیٹھے تھے جیسے آدم اور حوا جنت سے نکال دیئے جانے سے پہلے شجرِ ممنوعہ کی چھاؤں میں پائے گئے تھے اور جہاں شاہدہ فطری لباس میں کھڑے قد سے حیران اور پریشان کھڑی تھی۔ سچ مچ اسی شہر لاہور کا ایک حصہ تھا۔ لیکن یہ بات دریا والی بات سے منسلک ہے اور اس بات سے تیرہ یا چودہ سال بعد کی ہے جب مچھلیوں نے انسانی خون چکھا تھا اور گدھوں کے منہ اپنی خوراک سے پھر گئے تھے صرف تیرہ یا پھر چودہ سال بعد کی!!

شاہدہ اس منظر سے اس قدر دہشت زدہ ہوئی کہ اس نے خود کو بلیئرڈ روم کے ساتھ والے کوٹھڑی نما کمرے میں بند کر لیا اور جب بار بار دروازہ پیٹنے پر بھی اس نے دروازہ نہ کھولا تو ملازموں نے گورنس سے ماسٹر کی لے کر دروازہ کھول لیا۔ اندر باکس روم کے فرش کے بیچوں بیچ شاہدہ اوندھے منہ گری ہوئی تھی۔ اس کے سانچے میں تراشے ہوئے بدن پہ ایک دھجی تک نہ تھی اور نہ ہی سانپ کے کاٹے کا کوئی نشان لیکن اس کا جسم تیزی سے نیلا پڑتا جا رہا تھا۔ اسے یقیناً سانپ نے ڈس لیا تھا۔ لیکن وہاں سانپ نہ تھا۔ کسی ملازم نے کسی پٹاری یا سانپ کی موجودگی کا اعتراف نہ کیا اور شاہدہ کو راتوں رات شاہ جمال کے قبرستان میں دفنا دیا گیا۔

عرفان صاحب پہلے ہی استعفٰی دے چکے تھے اب وہ تھے اور اس گھر کی تنہائی۔ سارا دن دیوانوں کی طرح باغ میں، دوسری منزل پہ تہہ خانے میں منڈلاتے رہتے۔ کبھی پیانو بجانے بیٹھتے تو بجائے ہی چلے جاتے۔ ان کا رنگ تیزی سے سیاہ پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ ہمیشہ ترشے رہنے والے بال کانوں کی لوؤں کو ڈھانپ رہے تھے اور آنکھوں کی چمک میں بلا کی تیزی آتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اٹھتے تھے اور راوی کے آس پاس کے ویرانوں میں (علامہ اقبال ٹاؤن اور سبزہ زار وغیرہ سب کے سب ویرانے تھے) نکل جاتے اور واپس آ کے تہہ خانے میں گھس جاتے۔ ایک بار گورنس نے شکایت کی کہ گھر کے باورچی خانے سے مرتبان اور روغنی ہانڈیاں جو یوں ہی منگوا کر رکھ لی گئی تھیں غائب ہو رہی ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ بوتلیں، جار، ڈبے، کنستر سب کھسکنے لگے۔ عرفان صاحب اب زیادہ تر چارخانہ تہبند اور کھڑاویں پہنے باغ کی روشوں پہ ٹہلتے رہتے تھے، کئی کئی پہر کھڑے رہتے، یہاں تک کہ ان کے پیروں پر ورم آ جاتا۔

پوری کوٹھی پہ ایک آسیب زدگی سی چھائی ہوئی تھی اور نوکر چاکر، چرند پرند کسی مشی النوم کے مریض کی طرح بس پتھرائی ہوئی آنکھیں لیے ادھر سے اُدھر گھومتے رہتے تھے۔

ساتھ والی کوٹھی سے اب کبھی کوئی نہیں آیا تھا۔ آتا بھی کیونکر؟ بترا صاحب کی بیٹی کے ہاں شادی کے اتنے برسوں بعد اولاد ہونے والی تھی۔ وہاں تو ایک چہل پہل تھی۔ رنگ برنگے کپڑے سل رہے تھے، سویٹر بنے جا رہے

تھے، شوہر، ماں، باپ سب ہی نے مدھو کو ہتھیلی کا چھالا بنا رکھا تھا۔ یوں بھی وہ اپنی عزیز سہیلی شاہدہ کی اچانک اور پراسرار موت سے بہت دلبرداشتہ تھی۔ سب ہی اس کی دل بستگی میں لگے ہوئے تھے سوائے ان کی پردادی کے۔ جو اب بھی اپنا کھانا خود پکاتی تھی اور اپنے پوتے کے خاندان کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔

دادی کی نظروں میں مدھو کے لیے ایک خاموش ملامت ٹھہری رہتی تھی۔ مدھو ان سے بہت گھبراتی تھی، جب جب کرسچین نرس چیک اپ کے لیے آتی تھی پردادی کہیں سے رینگتی ہوئی آجاتی تھیں اور گول برآمدے کے ستون سے لگ کر بیٹھ جاتی تھیں۔

صوفوں کرسیوں اور چمڑے کے اسٹولوں سے جن پہ اب ان کے پرپوتے کا ملیچھ خاندان اور ملیچھ تر دوست احباب آکر بیٹھا کرتے تھے وہ شدید گھن کھاتی تھیں۔

در کے ساتھ لگے لگے وہ اپنی گدلی اور مندی مندی آنکھوں سے کالی بھٹ نرس کو مدھو سے بھونڈے مذاق کرتے دیکھتی رہتیں اور ان کے جھریوں سے اٹے چہرے پہ حقارت اور نفرت کی توسیں واضح ہوتی چلی جاتی تھیں۔ اتنی نفرت، اتنی حقارت ان کا پوپلا سامنہ اس طرح بھنچا ہوا ہوتا تھا جیسے وہ ابھی مدھو کے منہ پہ تھوک دیں گی۔

نرس کے جاتے ہی وہ بھی جھکی جھکی اٹھتیں اور پچھلے حصے میں اپنے کمروں کی طرف چلی جاتیں۔ ان ہی دنوں انہوں نے بترا صاحب کو بلا کر وصیت کی۔ وصیت تو خیر کیا، ایک سنکی، مرتی ہوئی بڑھیا جو اپنے عقیدے سے آخری دم تک لپٹے رہنا چاہتی تھی، اس کی وصیت اس کے سوا کیا ہو سکتی تھی کہ اسے اس کے عقیدے کے مطابق جلا دیا جائے۔ لیکن جب دادی یہ بات کہہ چکیں تو انہوں نے اپنی گدلی آنکھیں بترا صاحب کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ بترا صاحب دادی کی نگاہوں میں ناچتے سوالوں سے بھاگتے تھے۔ ان سوالوں میں بہت سی ''ہو، ہائے'' اور بہت سے طنزیہ ہنکارے بھی ڈولتے پھرتے تھے اور بترا صاحب دادی کے سامنے آج بھی وہی ننھا بچہ بن جاتے تھے جو ان سے کھانڈ کے بنے کھلونے لے کر کھانے کے لیے ہنومان جی کی چال چل کے دکھایا کرتے تھے۔

دادی بوڑھی اور کمزور ہو چکی تھیں۔ لیکن ان کی آنکھوں کے سوال نئے اور نوزائیدہ تھے۔ مینڈک کے ننھے سے دم دار لاروے کی طرح دادی کی آنکھ میں روز پٹ سے ایک نیا سوال پیدا ہوتا تھا اور ان گدلی آنکھوں میں تیرتا رہتا تھا۔

بترا صاحب ان سے آنکھیں چرا گئے۔

''پتر! مدھو کے گھر بیٹا ہوگا، مجھے پتا ہے اور اب میرا جو کچھ رہ گیا ہے وہ سب اس کو دے دینا، مدھو کے بیٹے کو''۔

بترا صاحب حیرت کے جھٹکے سے سنبھلے ہی نہ تھے کہ دادی نے دوسرا وار کیا۔

''یہ بچہ صرف مدھو کا ہے، داماد جی تو ہنہ! ہنہ! ہنہ!'' انہوں نے نہایت حقارت سے ہاتھ جھٹکے۔

''دادی! وہ......''

''بس کر جا کاکا، بس کر جا! ظلم کیا تم لوگوں نے بے چاری لڑکی پہ اور ایسے ظلم کا بدلہ یہیں مل جاتا ہے۔ تم سب

لوگوں کو مل جائے گا۔''

بترا صاحب کے ماتھے پہ پسینہ پھوٹ نکلا۔ جیب سے رومال نکال کے ماتھا پونچھا، کھلی کھڑکی سے لو کا ایک جھونکا آیا اور دادی کے بستر کی سفید چادر کو چھوتا ہوا نکل گیا۔

''آپ کی کھڑکیوں پہ ٹٹی چڑھواتا ہوں۔'' بترا صاحب نے بات بدلنے کی کوشش لیکن دادی نے ذرا رخ نہ دیا اسی طرح رازداری سے آگے جھک کے بولیں۔

''اس طرح تو گھر داماد تو لے آیا۔ لیکن کا کا! جب تم مر جاؤ گے، تمہاری بیوی مر جائے گی، مدھو اور اس کا میاں مر جائے گا تو کون زندہ رہے گا؟ کسی کو دھیان آیا؟''

بترا صاحب نے غور سے دادی کو دیکھا۔ دادی اپنے زمانے کی حسین ترین عورت تھی۔ دادا نے انہیں ایک شادی میں دیکھا تھا اور وہیں ایڑیاں رگڑ کے پڑ گئے تھے کہ شادی کروں گا تو اسی سے، ورنہ دریا میں کود کر جان دے دوں گا، زہر کھا لوں گا۔

دادی، دادا سے عمر میں بڑی تھیں۔ لیکن اپنی ذات برادری کی تھیں، چنانچہ شادی ہو گئی، لیکن دادا زیادہ نہ جئے۔ ان کی موت بھی عجیب طریقے سے ہوئی۔ ایک دن ان کے ہاں ایک مسلمان دوست آئے۔ دادی تو ان کے آنے کا سن کے ہی جھرجھریاں لیتی گھن کھاتی پھر رہی تھیں۔ ماس مچھی کھانے والے، زور زور سے بولنے والے مسلمان، توبہ!!

لیکن خیر، مہمان آئے، ان کے لیے انارکلی کے ایک ہوٹل سے کھانا منگوایا گیا، کھانا وانا کھا کے مہمان تو رخصت ہوئے لیکن دادی کا دادا سے زوردار جھگڑا ہوا، اور اسی شام دادا شام کی سیر کو گئے تو چار کندھوں پہ واپس آئے۔ ان کا رنگ تیزی سے نیلا پڑتا جا رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں جسم بالکل صاف تھا، کہیں کسی زخم یا کیڑے کاٹنے کا کوئی ڈنک نہ تھا۔

دادا کو راتوں رات جلا دیا گیا اور ان کی استھیاں ایک کلسے میں بھر کے رکھ لی گئیں کہ جب ان کا پوتا بڑا ہو گا تو بدری ناتھ جا کے بہا آئے گا۔

پھر وہ استھیاں بھی غائب ہو گئیں۔ یہ باتیں بترا صاحب کو ایسے ہی یاد تھیں جیسے خواب میں دیکھا ہوا کوئی منظر۔ تب سے اب تک دادی جیے جا رہی تھیں برابر جیے جا رہی تھیں۔ حالانکہ ان کا بیٹا بہو تک مر کھپ گئے تھے پوتا بوڑھا ہو گیا تھا مگر دادی کو جانے جینے کی کیا ہوس تھی کہ وہ ڈھٹائی سے سانس لینے پر تلی ہوئی تھی اور اب انہیں مدھو کے ہونے والے بچے کی فکر تھی۔

''نہیں آیا ناں کسی کو دھیان؟ اتنے بے وقوف ہو سب، پتا نہیں خود کو سمجھتے کیا ہو؟ ہنہ! ہنہ!'' دادی نے ہاتھ جھٹکے۔

بترا صاحب نے کچھ کہنا چاہا لیکن زبان منہ کے اندر ہی اندر چرمرا کے رہ گئی۔ دادی چند لمحے انہیں گھورتی

رہیں پھر اپنے بستر پہ کھڑکی کی طرف منہ کر کے لیٹ گئیں۔ کھلی کھڑکی سے گرم ہوا کا ایک اور جھونکا آیا اور ان کے روئی کے گالے جیسے سفید بالوں کو منتشر کرتا کمرے میں پھیل گیا۔

بترا صاحب چند لمحے اسی طرح بیٹھے رہے اور جب دادی کے خراٹے سنائی دینے لگے تو گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے اٹھے۔ جیسے دادی کا سارا بڑھاپا ان کے پنجر پہ لد گیا ہو۔ بدن بوجھل ہو گیا ہو اور پاؤں اٹھتے نہ ہوں۔ دادی اتنا کچھ جانتی تھیں اور اگر دادی جانتی تھیں تو باقی سب بھی تو جانتے ہوں گے۔ ایک بار پھر ان کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ پڑا۔ ملازم، نوکر چاکر، دوست احباب، بات تو پھیل چکی تھی اور اگر دادی جانتی تھیں تو وہ بھی جانتے ہوں گے کہ داماد جی تو بس ''ہنہ! ہنہ!'' ہی ہیں۔

بترا صاحب کو لگا، ساتھ ساتھ کھڑی کوٹھیاں جیسے جھک کے ایک دوسرے کے کان میں سرگوشیاں کر رہی ہوں ''داماد جی تو بس ہنہ! ہنہ!!''

یہ سرگوشیاں پھر بلند آوازوں میں ڈھل گئیں، کھڑکیاں اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے طعنے دینے لگیں اور روشن دان بھنوئیں اچکانے لگے۔ صدر دروازوں کے منہ کھلنے اور بند ہونے لگے اور بترا صاحب کو لگا وہ ان طعن کرتی عمارتوں میں تا دیر کھڑے نہیں رہ سکتے۔ گھبرا کے مڑے تو ان کے قدم خود بخود عرفان صاحب کی کوٹھی کی طرف اٹھ گئے!!

عرفان صاحب کے گھر میں خاموشی تھی باغ کے درخت گرمی سے جھلسے ہوئے تھے۔ گھاس کوٹی ہوئی تھی لیکن اتنی ہری نہ تھی، کیاریوں میں نئے پھول نہ بوئے گئے تھے اور پچھلے پھول آسمان سے گرنے والی ان مچھلیوں کے صدمے سے مسلے گئے تو پھر سر نہ اٹھا سکے۔ اب ان کیاریوں میں مالی درختوں سے گرنے والے پتے اور دیگر خاشاک ڈال دیا کرتا تھا اور فرصت ملنے پر کھرپی سے نلائی کر دیتا تھا۔ شاید اسے امید تھی کہ یہاں پھر کبھی نئے پھول بوئے جائیں گے۔ گلِ داؤدی، گلاب، گیندا، کلغا اور گلِ خیرو۔ اسی امید پر وہ مردہ پتوں کے اجسام ان کیاریوں میں دبا رہا تھا۔

لان کے بیچوں بیچ آسمانی بجلی سے جلے ہوئے گارڈن ہاؤس کا کھنڈر ایک بھیانک منظر پیش کر رہا تھا۔ کوئی ویرانی سی ویرانی تھی دھوپ کا رنگ بھی کچھ ماند سا پڑ گیا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشوں پہ بارش کی بوندوں سے جو گدلاہٹ جمی تھی اسے صاف کرنے کا خیال بھی کسی کو نہ آیا۔ اس دن پے در پے رونما ہونے والے واقعات نے سب کو ایسا شل کیا تھا کہ ابھی تک کچھ بھی معمول پر نہ آ سکا تھا۔ آسمان سے گرنے والی مچھلیوں کو شاہدہ کی تدفین سے پہلے ہی نہایت خاموشی سے اٹھا کر شاگرد پیشے کے سامنے موجود ایک غرقی میں ڈال دیا گیا تھا۔ غرقی کے منہ پر کنکریٹ کا ایک مضبوط ڈھکن لگا ہوا تھا، جسے اٹھانے کے لیے دو آہنی دستے موجود تھے۔ اس سے پہلے یہ غرقی صرف ایک دفعہ کھولی گئی تھی۔

جس وقت مچھلیاں غرقی میں ڈالی جا رہی تھیں تو منظور نامی ڈرائیور نے چپکے سے چار ذرا بڑی مچھلیاں اپنے کوارٹر میں پہنچا دی تھیں۔ شنید یہ ہے کہ اس کی بیوی امید سے تھی اور اسے کئی روز سے تلی مچھلی کھانے کی خواہش ہو

رہی تھی۔

خیر مچھلیاں غرق کرنے کے بعد کئی روز تک ملازموں کو وہاں سے ایسی آوازیں آتی رہیں جیسے کئی آبی مخلوقات غرقی میں موجود متعفن گاد میں پھڑک رہی ہوں۔ ظاہر ہے وہم ہی ہوگا۔ مچھلیاں تو آسمان سے گرتے ہی مرگئی تھیں۔

اس واقعے کے ایک ماہ بعد منظور کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی اور اس بات پر شاید کوئی بھی یقین نہ کرے کہ اس کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور اوپری بدن انسان کا تھا۔ دائی تو فی الفور بے ہوش ہوگئی مگر منظور کی بیوی ماں تھی۔ بچی کو صاف کیا۔ کپڑے میں لپیٹا اور شیرنی کی طرح ڈٹ گئی۔ آس پڑوس، ساتھ کے کوارٹرز، دوسری کوٹھیوں، آبادیوں اور بستیوں سے جس کسی نے تماشہ دیکھنے کو آنے کی کوشش کی اس نے دھکا کے بھگا دیا۔

چھ روز کی بچی کو لے کر منظور کی بیوی غائب ہوگئی اور پھر کسی کو اس کا پتا نہ چلا۔ کہنے والے کہتے ہیں اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی تھی۔ لیکن کہنے والوں کا کیا ہے کہنے والے تو کہا ہی کرتے ہیں۔

خیر تو اب کوٹھی میں تنہائی، تاریکی اور سیلن کا راج تھا۔ بترا صاحب راہداریوں سے گزرتے کمروں میں گھومتے رہے ان کا سامنا کسی ذی روح سے نہ ہوا۔ قالینوں کو لگتا تھا کوئی جھاڑتا ہی نہیں۔ پاؤں رکھتے ہی غبار کا ننھا سا بادل جوتے پہ چھا جاتا تھا۔ گھومتے گھماتے وہ تہہ خانے میں اتر گئے اور ابھی انہوں نے بتی روشن بھی نہ کی تھی کہ انہیں لگا نیم اندھیرے جیسے سارا تہہ خانہ ''سن'' سے کر کے ہوا ہو۔ فرش پہ بنا شطرنجی نمونہ زور سے ہلا ہو اور اپنی جگہ پھر سے واپس آگیا ہو پھر ایک دم ہی وہ ان کے سامنے آگئے، چارخانہ تہہ بند باندھے اوپری بدن برہنہ، بال بڑھ کے کاندھوں تک آئے ہوئے اور رنگ جانے کس آگ میں تپ کر تانبا ہوتا ہوا۔

بترا صاحب انہیں دیکھ کر چونک گئے۔ یہ وہ عرفان صاحب تو نہیں تھے جو جم خانہ کے بار روم میں لکھے شعر کو درست تلفظ سے پڑھتے تھے تو سننے والے وجد میں آجاتے تھے۔

جن کے بانو بجانے کے انداز پہ شہر کی لڑکیاں مرا کرتی تھیں۔ لڑکیاں تو لڑکیاں، بیاہتا گرہستنیں بھی اس حسنِ یوسف پہ فریفتہ تھیں۔ ہر نئے سال کے جشن پہ مسٹر اینڈ مسز عرفان کو بہترین جوڑے کا خطاب ملتا تھا اور جلنے والوں کے سینوں پہ سانپ لوٹا کرتے تھے۔ مگر یہ وہ عرفان صاحب تو نہ تھے یہ تو ایک عجیب ان گھڑ، کرخت مرد تھا جو تہہ خانے میں اترنے والی سیڑھیوں کے عین بیچوں بیچ ان کا راستہ روکے کھڑا تھا ایک پھنیر ناگ کی طرح۔

عین اسی طرح ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ یاقوت کے جوڑے کی طرح ایک دھیمی دھیمی سلگن۔

''کچھ کام تھا آپ کو؟'' جب وہ بولے تو ان کی آواز بھی بدلی ہوئی سی تھی۔

بترا صاحب کو کچھ نہ سوجھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے انہوں نے کچھ نہ سوچا تھا۔ وہ تو بس طعن کرتی کھڑکیوں اور دشنام اگلتے روشندانوں سے بھاگے تھے۔ عرفان صاحب سے سامنا ہونے پر وہ کیا کہیں گے۔ یہ سوچنے کا نہ تو انہیں ہوش تھا اور نہ انہوں نے زحمت ہی کی کہ کچھ ذہن بنالیں۔ ملاقات ہوئی تو کیا کہیں گے؟

اب وہ عرفان صاحب کو کیا بتاتے کہ انہیں عرفان صاحب سے کیا کام تھا۔ لیکن اس طرح زینوں کے

درمیان کب تک خاموش کھڑے رہتے۔ انہوں نے نہایت بے تکے پن سے کہا۔

''مدھو کے ہاں کچھ ہونے والا ہے۔''

عرفان صاحب نے پلک تک نہ جھپکی۔ ان کے پیچھے نیم اندھیرے میں پھر کچھ ہلچل مچی لیکن ایسی خفیف کہ آنکھ کی پکڑ میں نہ آسکی۔

''وادی کو سب معلوم ہے۔'' انہوں نے اکھڑے اکھڑے انداز میں کہا ایک دم ہی انہیں یہ سب کچھ بہت عجیب محسوس ہونے لگا۔ یہ سیڑھیاں، یہ گھر، عرفان صاحب اور خود ان کا اپنا آپ۔ بھلا کوئی تک بھی تھا؟ وہ کیوں یوں ایک پڑوسی کے گھر میں جس کی بیوی کو مرے ابھی چند ماہ ہوئے تھے دندناتا ہوا گھس آیا تھا اور اب یہاں کھڑے اپنی بیٹی کے امید سے ہونے کی خبر سنا رہے تھے۔

انہیں چکر سا آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ گرتے عرفان صاحب نے انہیں بازو سے تھام لیا اور اسی طرح اپنے ساتھ چلاتے ہوئے اوپر سٹڈی میں لے گئے۔ سٹڈی میں سب طرف بڑے بڑے نقشے لگے ہوئے تھے۔ دیواروں پر، کتابوں کی الماریوں پر حتیٰ کہ فرش پر نقشے پھیلے ہوئے تھے۔ یہ نقشے کوئی جغرافیائی یا سیاسی نقشے نہیں تھے یہ نقشے اصل میں پلان تھے۔ آب پاشی کے اس عظیم ترین نظام کے نقشے جس نے وادی سندھ کی تقدیر بدل ڈالنی تھی۔

اس منصوبے کے نقشوں کے ساتھ ساتھ وہاں ایک دوسرے منصوبے کے نقشے بھی لگے ہوئے تھے۔ سندھ طاس کے منصوبے کے نقشے، سات رابطہ نہریں، تین ڈیم، کئی بیراج اور تین دریا۔

بترا صاحب کو یہ نقشے چنداں سمجھ نہ آئے۔ انہیں صرف اردو میں لکھا ایک بڑا سا لفظ نظر آیا جو ایک نقشے پر لکھا تھا۔ یہ نقشہ کسی وادی کا تھا جس میں غالباً کوئی بند بنا ہوا تھا۔

فرش پہ بکھرے نقشوں میں سمندر اور پہاڑ بھی تھے۔ کہیں کہیں سطح زمین کے اندر کی تہوں کو بھی دکھایا گیا تھا۔ لیکن بترا صاحب کو کچھ سمجھ نہ آیا کہ عرفان صاحب نے یہ سب نقشے وہاں کیوں پھیلا رکھے ہیں اور وہ انہیں وہاں کیوں لائے تھے۔ عرفان صاحب انہیں یہاں لانے کے بعد جیسے ان کے وجود سے لاتعلق ہو گئے تھے اور بڑی خاموشی سے نقشے لپیٹ لپیٹ کے ایک گتے کی پیٹی میں رکھنے شروع کر دیے۔ آدھے نقشے لپیٹ کر جیسے انہیں کچھ خیال آیا۔ سر اٹھا کے بترا صاحب کو دیکھا۔

''آپ کچھ فرما رہے تھے؟ مدھو کے بارے میں؟''

بترا صاحب کو اب ان پہ باقاعدہ غصہ آنا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن ضبط کا تقاضا تھا کہ تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔

''مدھو امید سے ہے اور آپ جانتے ہیں، جانتے ہیں'' بترا صاحب ہانپ سے گئے یہ جملہ وہ پورا نہیں کر سکتے تھے۔

عرفان صاحب نے بہت غور سے ان کی بات سنی اور پھر جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، بڑے سکون سے بولے:

"میں نے استعفیٰ دے دیا ہے۔"

ہزار صاحب کا خاندانی تحمل ان کا ساتھ چھوڑنے لگا۔ لیکن وہ بڑے وقار سے خاموش بیٹھے رہے۔

"اس روز جب مدحو یہاں آئی تو میں اسے یہی بتا رہا تھا کہ میں نے استعفیٰ دے دیا ہے پھر بارش ہونے لگی اور آسمان سے آبی مخلوقات گرنے لگیں اور گارڈن ہاؤس پہ بجلی گر گئی اور شاہدہ ان صدمات سے جانبر نہ ہو سکی، اس شام......" وہ سانس لینے کو رکے پھر بہت رازداری سے آگے جھک کے ہزار صاحب کے قریبا کان میں بولے، "مدحو کے ہاں بیٹا ہوگا نہایت خوبصورت"۔

ہزار صاحب کو لگا ان کا دل ان کے سینے میں پھٹ جائے گا۔ کاش، کاش وہ اتنے جنگلی ہوتے کہ میز پہ پڑا بھاری رول اٹھا کے عرفان صاحب کے سر میں مار سکتے۔ یا کم سے کم ان کے منہ پر تھوک ہی دیتے۔ لیکن وہ نہایت اطمنائی سے وہاں بیٹھے رہے جیسے کسی نے ان کو پتھر کا بنا دیا ہو۔

عرفان صاحب اپنی بات کر کے مڑے اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ سارے نقشے بند کرنے کے بعد وہ خود بھی دبے پاؤں سٹڈی سے باہر چلے گئے۔ جیسے ہزار صاحب وہاں موجود ہی نہ ہوں۔

ہزار صاحب دیر تک اس کرسی میں مرے ہوئے پڑے رہے پھر جانے کہاں سے توانائی کی ایک لہر آئی۔ جس کے تحت ہزار صاحب وہاں سے اٹھ کے گرتے پڑتے اپنے گھر پہنچے۔

پھر جو انہیں ملیریا کے بخار چڑھا تو ہزار دواؤں کے باوجود اس دن تک نہ اترا۔ جس رات مدحو کے ہاں بیٹا ہوا۔

(۲۱)

وہ رات بھی عجیب تھی دن بھر آسمان پہ گرد کی موٹی تہہ چڑھی رہی جو نومبر کے مہینے میں ایک عجیب بات تھی۔ سہ پہر سے آسمان لال ہونا شروع ہوا اور پھر ایسی زوردار آندھی چلی کہ لان میں کھڑا آم کا کہن سال درخت جڑوں سے اکھڑ کے وہ جا کے گرا۔ درختوں کی شاخیں، چٹ چٹ ٹوٹیں، برآمدوں میں رکھی کرسیاں وحشی ہواؤں کے ساتھ ادھر سے ادھر ہو گئیں۔ کھلی کھڑکیوں کے پٹ آندھی کے ساتھ اکھڑ کے کہیں سے کہیں جا پڑے اور سارے میں جیسے چنڈی دھمال ڈال گئی۔

اس قیامت خیز شام میں جب مدھو کو اندازہ ہوا کہ وقت قریب ہے تو نہ کوئی نرس کو بلا سکتا تھا اور نہ ہی ہسپتال جانے کی کوئی سبیل تھی۔

مدھو کا خوبصورت بیٹا جب اس دنیا میں آیا تو آندھی کے ساتھ زوردار بارش بھی ہو رہی تھی۔ بجلی کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہوئی جا رہی تھیں اور بادلوں کی گرج کلیجے کے پار ہوئی جا رہی تھی۔

سوائے اس غیر معمولی طوفانی موسم کے، اس زچگی کے دوران کوئی واقعہ غیر از معمول پیش نہ آیا۔ ازل سے جیسے ایک انسان اس دنیا میں آتا ہے، اسی طرح وہ بچہ بھی اس دنیا میں آیا۔ مسز بترا خوش تھیں کہ کوئی پیچیدگی نہیں ہوئی، ورنہ وہ اکیلی صرف چند گھریلو ملازموں کے ساتھ یہ سب کیسے سنبھال پاتیں۔

آدھی رات کو کہیں جا کے سب سونے سلانے کو لیٹے۔ بارش بدستور جاری تھی۔ ڈادی کو کسی نے یہ خبر نہ دی۔ مسز بترا بہت خوش تھیں۔ خوش تو داماد جی بھی بہت تھے اور اس خوشی کے اظہار میں انہوں نے دیوار پہ ٹنگی دونالی اتار کے شاید ہوائی فائر کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ لیکن گولی تو اندھی ہوتی ہے۔ نا جانے کیسے خوشی میں چلائی گئی وہ گولی ان کا تالو چیرتی ہوئی کھوپڑی کے پار نکل گئی اور وہ اپنے ہی خون کے تالاب میں مردہ پڑے رہے۔ رات بہت طوفانی تھی۔ برآمدے کی طرف کوئی بھی نہ گیا۔

صبح جب طوفان تھما اور تھک کے سونے والے جاگے تو انہوں نے دیکھا کہ مدھو کے برابر سے نوزائیدہ بچہ غائب تھا۔ ایک کہرام مچ گیا اور ابھی کسی کو کچھ سمجھ بھی نہ آیا تھا کہ کیا ہوا ہے کہ پچھلے برآمدے سے جمعدارنی چیخی

چلاتی، بین کرتی دوڑی چلی آئی۔ داماد جی کی لاش اپنے ہی خون میں نہائی اکڑی ہوئی پڑی تھی۔

مدھو کو غش آ گیا۔ بترا صاحب تو جیسے جیتے جی مر گئے۔ پولیس کے آنے جانے، پوچھ تاچھ، بیان، موقع واردات کے جائزے وغیرہ میں شاید سب مدھو کے بچے کے بارے میں بھول گئے اور بھولے رہتے اگر مدھو خود اٹھ کے اس کی تلاش میں نہ نکل کھڑی ہوتی۔

وہ ایک ایک کمرے میں جھانک رہی تھی اس وقت اس کی آنکھوں میں ایک ایسی تڑپ تھی جو بلی کی آنکھ میں اپنے بلونگڑے کے کھو جانے پر ہوتی ہے۔ تب ہی اس پہ یہ انکشاف ہوا کہ دادی بھی غائب ہے۔ نقاہت، بھوک اور پے در پے صدمات نے مدھو کو بے جان سا کر دیا اور وہ دادی کے پلنگ پر ہی بے ہوش ہو کر گر گئی۔ دادی اگر وہاں ہوتی تو ضرور گھن کھاتی کہ ہائے ہائے سب بھرشٹ ہو گیا۔ لیکن دادی غائب تھیں!!!

مدھو زیادہ دیر وہاں نہیں رہی۔ مسز بترا جلد ہی اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں آ گئیں۔ بچے کے لیے اس کی تڑپ قدرتی تھی جس میں وہ وقتی طور پر شوہر کا غم بھی فراموش کیے ہوئے تھی۔

دادی کے غیاب نے بترا صاحب کو چونکایا۔ داماد جی کے کفن دفن سے فارغ ہونے پر انہوں نے گھر کی عورتوں کے سامنے اعلان کیا کہ بچہ کہیں نہیں گیا، یقیناً دادی بچے کو لے کر گھر ہی میں کہیں چھپی ہوئی ہیں۔

مدھو کو بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے داماد جی، لاکھ گھر داماد سہی۔ لیکن ان کا کنبہ قبیلہ کچھ تو تھا۔ اور ایسا ہوتا ہے کہ گھر دامادوں کے والدین کو اپنے بیٹے سے بڑی بے چین سی محبت ہوتی ہے جو یہاں بھی تھی اور اگر نہ بھی ہوتی تو بھی یہ کیسے ممکن تھا کہ جوان آدمی کی موت پر چپ سادھ لی جاتی۔

پولیس، ملنے والے، مدھو کے سسرال والے، لوگوں سے کوٹھی بھر گئی تھی اور ہر طرف مدھو کی بدنصیبی کے تذکرے ہو رہے تھے۔ اسی رات مدھو بھی گھر سے غائب ہو گئی اور پڑوس کی کوٹھی میں آگ لگ گئی۔ آگ ایسی بھڑکی کہ فائر بریگیڈ والوں کی تین گاڑیاں رات بھر پانی چھڑکتی رہیں مگر ایک پتا بھی نہ بچایا جا سکا۔ درختوں پہ رہنے والے پرندوں تک کو اڑنے کا موقع نہ ملا۔ لوہا، لکڑی، کنکریٹ، چرند، پرند، انسان جو بھی وہاں تھے سب جل کے خاک ہو گئے۔ اگلے دن جب شام کو سب کچھ جل بجھا اور تپش اتنی کم ہوئی کہ احاطے میں جایا جا سکے تو وہاں سوائے ایک جلی ہوئی دیواروں والے کھنڈر کے کچھ نہ بچا تھا۔ قیمتی صوفے، نایاب تصویریں، اعلیٰ ملبوسات، نازک کراکری، کچھ نہ بچا تھا۔ آگ کے صدمے سے آس پاس کے گھروں کے درخت بھی جھلس گئے تھے اور ان پہ رہنے والے پرندے اپنے گھونسلے چھوڑ چھاڑ کے دوسرے درختوں پہ پناہ گزین ہو گئے تھے۔ ان درختوں پہ پہلے سے رہنے والے پرندوں نے اس دخل در معقولات پہ آسمان سر پہ اٹھا لیا اور دوسرے روز شام کو جب آگ ذرا سرد پڑی تو ادھر ادھر کے لوگ اپنی اپنی کوٹھیوں کی چھتوں، شہ نشینوں اور لانز میں نکل آئے۔ کھنڈر ابھی سلگ رہا تھا اور اس تباہی کے پس منظر میں چیختے، شور مچاتے پرندے اور نیم جھلسے ہوئے درخت جو پڑوس کے گھروں سے جیسے پرسہ دینے کو جھک آئے تھے بڑی ہی المناک تصویر پیش کر رہے تھے۔ دیکھنے والے کانوں کو ہاتھ لگا رہے تھے۔ ایک دو لوگوں نے دبی آواز میں اور کچھ نے

با آواز بلند اس واقعے کا ذکر کیا جب آسمان سے مچھلیوں کی بارش ہوئی تھی اور یہ بارش فقط عرفان صاحب کے گھر برسی تھی۔ انہیں وہ زور کا کڑا کا بھی یاد تھا جس نے دلوں کو دہلا دیا تھا اور وہ جھماکا بھی جس سے اندر باہر سب روشن ہو گیا تھا اور عرفان صاحب کے گارڈن ہاؤس کو آگ لگ گئی تھی۔ قریباً سب ہی لوگوں نے اس واقعے سے منسلک ایک اور واقعہ بھی سن رکھا تھا، لیکن کسی کو بھی اس پہ یقین نہ آتا تھا۔ عرفان صاحب کو سب بہت برسوں سے جانتے تھے اتنے شریف اور وضع دار آدمی پہ اتنا گراہوا الزام لگا دینا، شاید ان کے نمک حرام ملازموں کے لیے تو ممکن تھا لیکن خاندانی پڑوسی کیسے، اتنی بڑی تہمت دھر سکتے تھے۔ لیکن پچھلے بہتر گھنٹوں میں جو واقعات رونما ہوئے تھے وہ کسی اور طرف ہی اشارہ کر رہے تھے۔

داماد جی کی غیر فطری موت، مدھو کے بچے کا غائب ہو جانا، پھر دادی اور مدھو کی پراسرار گمشدگی اور اب عرفان صاحب کے گھر میں اچانک آگ کا لگنا۔ وہ سب سرگوشیاں جو بوجوہ نہ کی جا سکی تھیں۔ اب بیان بن چکی تھیں۔ بڑے سے بڑے واقعے کو فقط سر کے اشارے سے "ڈس مس" کرنے والی بیگم صاحبائیں کہنیوں تک بازو اٹھا اٹھا کے عرفان صاحب کے سوختہ کھنڈر کی طرف اشارہ کر رہی تھیں اور کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھیں۔

مردوں نے سگریٹ سلگا لیے تھے اور ان کے تجزیوں کا نچوڑ یہ تھا کہ بترا صاحب نے خود ہی اپنے داماد، بیٹی، نواسے اور دادی کو مارا تھا۔ داماد کی لاش تو مل گئی۔ باقیوں کو انہوں نے عرفان صاحب کی کوٹھی میں پھینک دیا اور پھر ان لاشوں پہ پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ حالانکہ چند گھنٹے پہلے بارش ہو چکی تھی نا جانے کیوں آگ بھڑک اٹھی اور اس کی لپیٹ میں پوری کوٹھی آ گئی۔

بات چونکہ ان پڑوسیوں نے کہی تھی جو سالوں سے ساتھ رہ رہے تھے اس لیے اس میں وزن تھا۔ گو ان مرنے والوں کی طرف سے دعویٰ کرنیوالا کوئی نہ تھا لیکن داماد جی کے گھر والے بھرے بیٹھے تھے۔ ایف۔ آئی۔ آر کٹی اور جب پولیس والے بترا صاحب کو گرفتار کرنے آئے تو وہ اپنے بستر پہ مردہ پائے گئے انہوں نے خواب آور گولیوں کی پوری شیشی نگل لی تھی۔

مسز بترا پاگل ہو گئیں اور ساتھ ساتھ بنی یہ دونوں کوٹھیاں اجڑ گئیں۔ کاروبار کو کون دیکھتا؟ ایک دور پار کے رشتے دار تھے سو انہوں نے جلد ہی انجے پنجے نکال کے سب کچھ ہڑپ لیا۔ کوٹھی کو منحوس سمجھ کے جوں کا توں رہنے دیا گیا۔ جلد ہی کوٹھی کھنڈر بن گئی۔ دیواروں پہ سیلن کے اثر سے جگہ جگہ پپڑیاں نمودار ہوئیں، پہلے سفیدی جھڑی، پھر پلستر کی باری آئی، جگہ جگہ سے اینٹیں جھانکنے لگیں اور ان اینٹوں پہ ہلکا ہلکا کلر ابھرنا شروع ہوا۔

کھڑکیوں کے شیشے دھندلے ہوئے اور پھر آندھی، بارشوں سے ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگے۔ کھلے رہنے سے کھڑکی کے پٹوں کے قبضے آخر جواب دے گئے اور وہ جھولتے جھولتے گرنے لگے۔ چور اور آس پاس کے کوارٹروں کے بدنیت ملازم راتوں کو باڑ میں چھپتے چھپاتے اندر آ جاتے اور کمروں سے قیمتی سامان اٹھا کے چمپت ہوتے۔

پہلے پہل تو یہ چوریاں چھوٹی موٹی چیزوں تک محدود تھیں۔ پھر ظالموں نے دیکھا کہ مسز بترا تو بس اللہ کا جی

ہیں۔ کھانا سامنے رکھ دیا تو کھا لیا۔ نہ ملا تو مانگا نہیں۔ کسی نے کہہ سن کے کپڑے بدلوا دیئے تو ٹھیک ہے، ورنہ خود سے خیال ہی نہ آیا۔ وہاں تھا بھی کون، ایک بوڑھی ملازمہ کے سوا جو حق نمک ادا کرنے کو رہ گئی تھی۔

خیر تو اب رفتہ رفتہ چور اتنے دیدہ دلیر ہو گئے کہ بڑی بڑی چیزیں، جیسے مسہریاں، الماریاں، صوفہ سیٹ، قالین اور سائیڈ بورڈ اٹھا اٹھا کے سواریوں پر لدوا لدوا کے لے گئے۔ شنید تھا کہ یہ بڑے عدد، پڑوسیوں کی فرمائش پہ ان کے ہاں پہنچائے گئے تھے۔ بترا صاحب مقامی تھے اور پشتوں کے امیر، تو ان کے ہاں جو ساز و سامان تھا وہ آس پڑوس کے کسی گھر میں نہ تھا۔ ظاہر ہے ہمسائے نظر رکھتے تھے۔

ہوتے ہوتے گھر ویرانہ ہو گیا۔ مسز بترا گول برآمدے میں بیٹھ کر اکثر عجیب ڈراؤنی باتیں کیا کرتی تھیں۔ ایسی باتیں جو یقیناً ان کے مشاہدے میں نہیں تھیں۔ اب جبکہ ان کے دماغ نے سوچنے سمجھنے اور حقیقتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا تو ان کے لاشعور میں کبھی کبھی کے سنے ہوئے واقعات نے مجسم شکل اختیار کر لی تھی۔ اب وہ اکثر ایک ایسی ٹرین کی کہانی سناتی تھیں، جس پہ اس کی گنجائش سے زیادہ لوگ سوار ہو گئے تھے اور پھر ان سب لوگوں کو مار ڈالا گیا۔ ایک بھی شخص کو زندہ نہ چھوڑا گیا۔ صرف اس پاداش میں کہ وہ زندہ رہنا چاہتے تھے۔ اپنے ہونے کا تسلسل برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے ہونے کا تسلسل توڑ دیا گیا انہیں ختم کر دیا گیا۔ ان کی لاشیں، چلتی ٹرین سے جوہڑوں میں گریں، کتوں نے بھنبھوڑیں اور گدھوں نے اتنی کھائیں کہ انہیں ابکائیاں آ گئیں۔

پھر وہ ایک رشی کی کہانی سناتیں، جو مہارشی بننا چاہتا تھا اور ایک کنڈ کے کنارے بیٹھا رہتا تھا۔ اس کی ''تپیا'' کی آگ نے اس کنڈ سے نکلنے والے پانیوں میں بھی ایک عجیب تاثیر پیدا کر دی اور ان پانیوں میں عجیب جانور پیدا ہوئے۔ ایسے جانور جو اور کسی دریا میں جی نہیں سکتے تھے۔ صرف اسی دریا کے سرخی مائل پانیوں میں ان کی بقاء تھی۔ ان جانوروں میں انسان سے مشابہہ بلھن بھی تھی، مونچھوں والے کچھوے بھی، مچھلیوں کی کئی نایاب قسمیں میٹھے پانی کے جھینگے اور سرخ کیکڑے، گھونگھوں کی لاتعداد قسمیں، کیچڑ میں کیموفلاج ہو جانے والے آبی جانور اور مگرمچھ۔

یہ سب جانور، باقی دریاؤں سے فرق تھے کیونکہ ان کو جینے کے لیے، انڈے دینے کے لیے اور پھر ان انڈوں کے سینے کے لیے جتنی تپش، جتنی خنکی چاہیے تھی، اس کا تناسب اسی دریا میں قائم تھا۔ دریا کے کناروں پہ رنگ رنگ کے درخت اگے، جن کی جڑوں کو صرف اسی دریا کے پانی کی نمی چاہیے تھی۔ ان پہ جو پھل پھول لگتے تھے وہ بظاہر دوسرے دریاؤں کے کنارے پائے جانے والے نباتات جیسے ہی تھے، لیکن یہ بات اب صرف مسز بترا دہرا رہی تھیں کہ ان نباتات کے رنگ، خوشبو اور ذائقے میں ایک نہایت لطیف فرق تھا، جو باقیوں سے انہیں ممتاز کرتا تھا۔ ان درختوں پہ رہنے والے طیور کے پروں اور چونچ کے رنگ اور بناوٹ بھی اسی طرح فرق تھے اور ان طیور پہ تاک لگانے والے باگڑ بلے بظاہر عام بلے تھے لیکن ان کے نوکدار کانوں پہ ایک بال صرف ایک بال ایسے کھڑا ہوتا تھا جیسے کوئی رشی، مہارشی بننے کی آرزو میں کسی کنڈ کے کنارے ایک پیر پہ ہو کے شہادت کی انگلی آسمان کی طرف بلند کر کے کھڑا ہو۔ خاموش، ساکت، پرسکون!!!

پھر وہ بڑی چالا کی سے مسکراتی تھیں اور ادھر ادھر دیکھ کے اپنے فرضی سامعین سے مخاطب ہوتی تھیں۔

''ان سب جانوروں کے علاوہ اس دریا میں ایک اور عجیب و غریب مخلوق بھی رہتی تھی۔ ایسی مخلوق جس کے بارے میں لوگوں نے عجیب عجیب کہانیاں گھڑ رکھی ہیں۔ دنیا کے ہر کونے میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ ہوتی ہے اور اسی دنیا کے ہی کونوں میں لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ نہیں ہوتی۔ تو اگر وہ نہیں ہوتی تو پھر ان گنت زمانوں سے لاتعداد لوگ اس کے بارے میں بے شمار کہانیاں کیسے کہہ گئے؟'' اتنا کہہ کر وہ سامنے اجاڑ لان کو دیکھا کرتیں، جہاں کبھی سبزے کے قطعے تھے اور پھولوں کی کیاریاں اور سایہ دار درخت اور پھلوں کے بوجھ سے جھک جانیوالے ثمر دار اشجار۔ اب وہ درخت دیکھ بھال نہ ہونے سے جھاڑ جھنکاڑ کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ پھولوں کی کیاریاں اجڑ گئی تھیں اور لان میں اتنی جڑی بوٹیاں اگ آئی تھیں کہ ڈھاکا کی مخملی گھاس کا ایک تنکا بھی باقی نہ بچا تھا۔

اس اجڑے ہوئے لان میں آوارہ کتے لوٹ لگاتے اور لمبی لمبی گھاس میں گوہ کا ایک جوڑا اکثر رینگتا ہوا نظر آتا۔ اس لان کو دیکھ کر وہ مزید بدحواس ہو جاتیں اور با آواز بلند اس کے حسن کی وہ وہ داستانیں سناتیں کہ اگر کوئی سن لیتا تو شرم سے عرق عرق ہو جاتا۔

''......تو ان مخلوقات میں سے جو اس دریا کے سرخی مائل گدلے پانی میں پیدا ہوئی تھی ایک مخلوق وہ بھی تھی جس کا آدھا بدن لڑکی کا اور آدھا بدن مچھلی کا تھا۔ مچھلی کا بدن ایسا نہیں تھا جیسا عام مچھلیوں کا ہوتا ہے۔ یہ بدن تو ایسا تھا جیسے کوئی بیلے ڈانسر دونوں ٹانگیں جوڑ کے پنجوں پہ تنی کھڑی ہو اور ان باہم پیوستہ زانوؤں اور پنڈلیوں پر کسی مشاق درزی کا سیا ہوا چانوں سے بھرا لبادہ کس دیا گیا ہو۔ جس سے اس کے زانوؤں کے ابھار اور کولہوں کا بوجھل پن مزید نمایاں ہو گیا ہو اور اس کا اوپری بدن جو ایک لڑکی کا جسم تھا......'' یہاں تک کہہ کے وہ عیاری سے مسکراتیں اور بیٹھے بیٹھے آگے پیچھے جھولنے لگتیں۔

''اب ایک جوان لڑکی کا جسم کس قدر خوبصورت ہو سکتا ہے۔ اسی قدر وہ خوبصورت ہوتی تھی۔ اتنی خوبصورت، اتنی خوبصورت، جتنی خوبصورت......مدھو تھی۔'' مدھو کا نام لے کر وہ گھبرا جاتی تھیں۔ یہ نام ان کو ہمیشہ پریشان کرتا تھا۔ مدھو کون تھی؟ اس کا ان سے کیا رشتہ تھا؟ اس نام سے دل پہ ایک بھاری پتھر سا آن گرتا تھا۔ وہ گھبرا کے وہاں سے اٹھتیں اور پچھلے برآمدے میں چلی جاتیں جہاں اب نہ تو دادی کی چوکی تھی۔ نہ سیڑھیوں کے ہر زینے پہ رکھی پیتل کی جھمجھاتی ہوئی گڑویاں، نہ ہی الگنی پہ دادی کی نیلی کنی کی سفید ساریاں تھیں صرف شیوجی کی مورتی، پتوں کے ڈھیر کے درمیان کھڑی متانت سے مسکراتی تھی۔ بالوں میں چاند، کانوں میں بالے۔ ہاتھ میں کمنڈل اور جٹاؤں سے بہتی گنگا۔ کسی چور کو دھیان نہ آیا کہ وہ ان کو بھی اٹھا کر لے جاتا۔ ہاں کسی جذبہ ایمانی سے چھلکتے ہوئے چور نے ان کی ستواں ناک بڑے سلیقے سے تراش دی تھی۔ اب یہ نکٹا بھگوان بڑی بڑی آنکھیں کھولے اپنے پجاریوں کا منتظر تھا۔

پجاری تو خیر کیا آتے مسز بترا وہاں آتی تھیں۔ بڑی چالاکی سے مسکراتی تھیں۔ اپنے ملگجے دوپٹے سے برآمدہ جھاڑ کے عین شوجی کے سامنے مغرب کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتی تھیں اور پھر دعا مانگتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کے

رو پڑتی تھیں۔ جانے کس کس غم میں اداس؟ انہیں سب کچھ بھول چکا تھا، بس اتنا یاد تھا کہ وہ دکھی تھیں۔ بہت دکھی اتنی دکھی کہ ان کے دکھوں کے آگے کائنات کا ہر دکھ ہیچ تھا۔

کبھی تو وہ کئی کئی پہر یہاں بیٹھی رہتی تھیں۔ نوکرانی جواب پڑوس کے کسی اور گھر میں کام کرتی تھی، جب واپس آتی تو ان کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر لاتی، ان کے بال بناتی، کپڑے بدلتی اور جو روکھا سوکھا میسر ہوتا ان کے سامنے رکھ دیتی۔ ایسا قریباً روز ہی ہوتا اور روز ہی اس کی آنکھیں بھر آتیں، روز ہی وہ اپنی مالکن پہ پڑنے والی بپتا یاد کر کے روتی، اب تو یہ ایک روایت سی بن گئی تھی اور جس روز وہ نہ روتی، مسز بترا بچوں کی سی شریر مسکراہٹ سے کہتیں ''روؤ ناں، روتی کیوں نہیں ہو؟'' اور یہ سن کے وہ پھوٹ پھوٹ کے روتی۔ ایسا عروج اور ایسا زوال، کس شقی القلب کا کلیجہ نہ پھٹ جائے؟

پھر ایک دن وہی دور پار کے رشتے دار جو بترا صاحب کے کاروبار پہ قابض ہوئے تھے اچانک دوبارہ نمودار ہوئے۔ وہ اس کوٹھی کو ملبے سمیت بیچنا چاہتے تھے۔ مسز بترا خوفزدہ نظروں سے یہ سب منظر دیکھتی رہیں اور اس رات وہ کہیں غائب ہوگئیں۔

پھر دوبارہ کسی نے ان کو کہیں نہ دیکھا۔ کوٹھی کے خریدار جب اگلی بار آئے تو جانے کیسے درخت کا موٹا ٹہنا ٹوٹ کر ان کی کار پر گرا اور اس کے وزن سے ان کی گردنوں کے منکے ٹوٹ گئے اور وہ وہیں مر گئے۔ اس روز کے بعد نہ تو کسی نے اس کوٹھی کو بیچنے کا ذکر کیا اور نہ ہی کسی کو اسے خریدنے کی ہمت ہوئی۔

رفتہ رفتہ دونوں کوٹھیوں کی درمیانی دیوار ڈھ گئی۔ خودرو پودوں اور درختوں نے دونوں مکانوں کے کھنڈرات کو ڈھانپ لیا۔ بترا صاحب کی کوٹھی کے ہر ہر کمرے کے فرش کو پھاڑ کے برگد کے درخت نکلے اور ان کی لٹکتی ہوئی جٹاؤں نے اینٹ، سیمنٹ اور سریے کو ڈھانپ لیا۔ عرفان صاحب کے گھر کا کھنڈر، ٹاہلی، کیکر اور جامن کے درختوں سے گنجان ہوگیا۔ گھاس نے بڑھ کے بنیادوں کو چھپا لیا۔ خودرو بیلیں ایسی گتھیں کہ دن کے وقت بھی زمین تک روشنی نہیں پہنچ پاتی تھی۔

اس ہریاول کے قطعے میں آوارہ کتوں نے گڑھے کھودے، بارشوں سے ان گڑھوں میں پانی بھر گیا اور پھر جانے کہاں کہاں سے رنگ برنگی مچھلیاں ان گڑھوں میں چلی آئیں۔ رنگ برنگے پرندوں نے درختوں میں گھونسلے بنائے اور ہزار ہا رینگنے والے جانور پناہ گزین ہوئے۔

اب یہ تھا کہ اسی شہر لاہور کی ایک مضافاتی بستی میں چند کنال زمین پہ ایک جنگل سینہ تانے کھڑا تھا اور اس میں بسنے والی مخلوقات بڑی حقارت سے اپنے چاروں طرف رواں دواں انسانی زندگی کو دیکھتی تھی اور کسی کی جرأت نہ تھی کہ کروڑوں روپے کی اس جائیداد میں سے ایک مرلہ زمین بھی کسی مصرف میں لا سکے۔ یہ دریا والی بات کے چند سال بعد کی بات ہے یعنی جب دریا کے سوکھ جانے کی بات ذرا پرانی ہو چکی تھی۔ راتوں کو یہاں مہیب بڑ بلگیں چکر کاٹتی تھیں اور دن کو فاختاؤں کی خون خشک کر دینے والی ہوں، غوں، غوں، غوں سنائی دیتی تھی۔ جنگل اپنا تسلسل قائم رکھنے پہ مصر تھا!!!

گاڑی پوری رفتار سے بھوریوں والے کلّوں کی طرف جا رہی تھی۔ پچھلی سیٹ پہ اسرار کا سر گودی میں رکھے مینے کو عجیب عجیب واہمے گھیرے میں لے رہے تھے۔ کئی سال پہلے کی باتیں اس طرح ذہن کے پردے پر منعکس ہو رہی تھیں کہ اسے گزرا ہوا سب زمانہ ایک شفاف منظر کی طرح اپنے سامنے پھرتا ہوا نظر آ رہا تھا، وہ زمانہ اور وہ واقعات جن پہ غور کرتے کرتے مینا اتنا سیانا ہو گیا تھا۔ یا شاید وہ واقعات اب بھی حل طلب تھے۔

اسے یاد تھا کہ اس دن اس نے میاں اللہ یار کی دونالی سے "چھپا کی" ماری تھی۔ چھپا کی مار کے وہ اس کا خون ہاتھوں میں مل ہی رہا تھا کہ اس نے ان لوگوں کو دیکھا۔ وہ شاید چار تھے یا پانچ، بیل گاڑیوں پہ اتنے مرتبان، ڈبے، روغنی ہانڈیاں اور جار رکھے ہوئے تھے کہ اسے ان کو دیکھنے میں دقت ہو رہی تھی۔

ان میں سے جو سب سے آگے تھا، اس کا چہرہ کرخت اور آنکھیں بے تحاشا چمکیلی تھیں۔ اس نے فقط تہہ بند باندھ رکھا تھا اور اوپری بدن برہنہ تھا۔ بال بڑھ کے کاندھوں تک آ گئے تھے اور ابھی کان میں بالی نہ تھی۔

مینے کے دماغ میں جھن سے کچھ ہوا۔ یہ تو وہی جوگی تھا، مینا اسے پہچان نہیں پایا تھا۔

پھر اسے یاد آیا کہ یہ جوگی اپنی بیل گاڑیوں سمیت میاں اللہ یار کے ڈیرے پر جا پہنچا تھا، اور یہ وہی رات تھی، جس رات اسرار پیدا ہوا تھا۔ مینے نے دم بدم موت کی طرف بڑھتے اس خوبصورت چہرے کی طرف دیکھا اور اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ اس رات وہ کتنا خوش تھا۔ بھائی تو اس کے اور بھی بہت تھے مگر اولاد جیسا یہ بھائی جو تھا تو سوتیلا، لیکن اس قدر خوبصورت تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اسے دیکھ کے لگتا ہی نہ تھا کہ نوزائیدہ بچہ ہے۔ چھ سات روز کے بچے کی طرح سنبھلا ہوا چہرہ، رنگ اتنا گورا، آنکھیں کھُوئی، باریک باریک ہونٹ اور ستواں ناک، ایسی پیاری شکل تو یہاں کسی کی نہ تھی۔

میاں اللہ یار کے دل میں اس کے لیے جو خواہ مخواہ کی پرخاش تھی، مینا اس سے بخوبی واقف تھا لیکن ایسی بے وجہ کی بات کو بنیاد بنا کے اتنے پیارے بھائی کو محبت کی نظر سے نہ دیکھنا حماقت تھا اور مینا احمق نہیں تھا۔

جب مینے نے دائی سے لے کر اسرار کو دیکھا تھا تو اس وقت یہ جوگی صحن میں کھڑا اونچی اونچی آوازوں میں

میاں اللہ یار سے کچھ کہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہاں زور زور سے بولنے کی آوازیں آتی رہیں اور پھر بڑا پھاٹک کھلا اور جوگی اپنی بیل گاڑیوں کو لے کر وہاں سے چلا گیا۔

اس واقعے کے چھ ماہ بعد مینے نے جوگی کو دوبارہ دیکھا تھا۔ لیکن آج سے پہلے وہ ان دونوں واقعات کو آپس میں جوڑ نہ پایا تھا۔ اور آج جب اسرار زندگی اور موت کی سرحد پہ کھڑا تھا تو مینے کو یاد آیا کہ جوگی تو خود کہیں سے آیا تھا۔ اس کے ساتھ تین عورتیں اور شاید دو نومولود بچے تھے۔ ایک عورت بہت بوڑھی اور دوسری بہت جوان اور تیسری عورت، جو اتنی حسین تھی کہ مینا ایک آنکھ سے اس کو دیکھ بھی نہ پایا تھا۔ وہ عورت اور دوسرا بچہ، جاتے ہوئے جوگی کی بیل گاڑیوں پہ نہ تھے۔

یہ ایک ایسی باریک تفصیل تھی، جیسے مینا بھولا رہا۔ سالہا سال گزر گئے اور مینے کے ذہن پہ فراموشی کی ٹوپی چڑھی رہی۔ شاید اگر اس کی دونوں آنکھیں ٹھیک ہوتیں تو اسے یہ تفصیل نہ بھولتی۔ آج زندگی میں پہلی دفعہ مینے کو اپنے کانے ہونے کا دکھ ہوا۔

سوال یہ تھا کہ جوگی اس رات میاں اللہ یار کے پاس کیوں آیا تھا؟ اور چند ماہ بعد وہ یہ کیوں کہہ رہا تھا کہ میاں اللہ یار، میاں اللہ یار نہیں ہے، دوسرا سوال یہ تھا کہ جوگی کے ساتھ آنے والی دوسری عورت اور بچہ کہاں گئے؟

پھر اسے وہ رات یاد آئی جب وہ بھوریوں والے کلوں سے واپس آیا تھا اور شاماں نے اسے پچھلے صحن میں جانے سے روک دیا تھا اور فضل بی بی کی لاش جو چاندنی رات میں پچھلے صحن میں پڑی تھی جس کی آنکھیں کسی حیرت میں چری ہوئی تھیں اور منہ سے خون کی ایک پتلی سی لکیر جاری تھی۔ جیسے کسی شے کی دہشت سے اس کا کلیجہ پھٹ گیا ہو اور وہ دن جب باؤ اسرار کو ان دیکھے ذرائع سے خوراک ملنی شروع ہوئی تھی اور اس کے لیے آنے والی بکری اور اس کے میمنوں کو ذخیرے میں چھوڑ دیا گیا تھا اور پھر وہ بکری اور اس کے میمنے آدم خور ہو گئے تھے اور چوہوں نے سانپوں کا تعاقب شروع کر دیا تھا اور رتی کی چونچ میں زہر بھر گیا تھا۔

یہ سب یاد کر کے مینے کے سر میں سے پسینے کی دھاریں بہنے لگیں اور اس نے گھبرا کے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بھوریوں کا ناگ، بالکل سامنے تھا اور محسن نے کار کی بریک لگائی تھی۔ اگر وہ بریک نہ لگاتا تو وہ نیچے آ جاتا۔ وہ جو گاڑی کا راستہ روکے کھڑا تھا!!

(۲۳)

اسرار کے نیم مردہ جسم کو اس نے اپنے بازوؤں پہ اس طرح اٹھالیا جیسے وہ کوئی بچہ ہو۔

''تم دونوں یہیں رکو'' وہ بولا تو اس کی آواز میں تحکم تھا۔ محسن نے کچھ کہنا چاہا تو مینے نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش کرا دیا۔

اسرار کو بازوؤں پر اٹھائے وہ بھوریوں کی ریت پہ پیر رکھتا آہستہ آہستہ نظر سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے غائب ہونے کے بعد سامنے منظر ویسا ہی ہو گیا، جیسا کہ وہ تھا۔ ریت کے ٹیلے، درختوں کا حاشیہ اور اس حاشیے پہ جھکا آسمان اور اس آسمان پہ چمکتا شام کا وہی ستارہ جو بترا صاحب کے لان پہ ننگا چمکتا تھا تو دھوکہ لگتا تھا یہ ہی وہ گمشدہ سورگ ہے جو وشوامتر نے بنائی تھی۔

''اب کیا کریں۔'' محسن نے مینے سے پوچھا۔ اس قدر دوڑ بھاگ کے بعد بھوریوں کا سناٹا اور چلتی ہوا کی سائیں سائیں۔ یوں لگ رہا تھا اب کرنے کو کچھ نہ رہ گیا ہو۔

''اب کیا کرنا...... انتظار کریں گے اس کا''۔ مینا خاموشی سے کار کی پچھلی نشست پر جا کے لیٹ گیا۔

محسن کار سے ٹیک لگا کے وہیں کھڑا رہا۔ وہ مینے جتنا سیانا تو نہ تھا اور باوجود اس کے کہ اس کے کان عام لوگوں کی نسبت ذرا بڑے اور کھڑے کھڑے سے تھے جن کو دیکھ کر اس پر ایک احمق آدمی کا شبہ ہوتا تھا۔ لیکن اس کی یادداشت بہت مضبوط تھی۔ یہ اور بات کہ اس یادداشت کی مدد سے وہ چیزوں کو سامنے رکھ کے کوئی فیصلہ نہ کر پاتا تھا نہ ہی کوئی نتیجہ اخذ کر سکتا تھا۔ ایک طوطے کی طرح اسے جملہ یا منظر یاد تو رہ جاتا تھا لیکن وہ جملہ یا منظر کس بات کا پیش خیمہ ہے، یہ سمجھنا اس کے بس سے باہر تھا۔

جیسے اس وقت بھی یہاں بھوریوں کے کنارے کھڑے اسے یہ معلوم نہ تھا کہ آخر کیوں اسے وہ رات یاد آ رہی تھی جب اسرار پیدا ہوا۔ وہ بظاہر ایک عام سی رات تھی۔ آتی سردیوں کی رات۔ جب سے مینے کی شادی ہوئی تھی اور اس نے اندر کوٹھڑی میں سونا شروع کیا تھا، محسن چھت پہ اس کی جگہ سویا کرتا تھا۔ اس رات بھی وہ دیسی روئی کی بھاری رضائی میں گرمڑی مارے پڑا تھا کہ اسے نیچے صحن میں کسی چہل پہل کا احساس ہوا۔ پہلے تو وہ اسی طرح لحاف کی نرمی اور گرمی میں فیتس کی طرح ٹانگیں سکیڑے پڑا رہا۔ لیکن جب اس چہل پہل میں پھونکنی سے ماری گئیں پھونکیں اور ان

کے اڑے اڑنے والی چنگاریوں کی چنک بھی شامل ہوگئی تو محسن تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوگیا۔ اس نے رضائی میں سے سر نکال کے جھانکا تو نیچے صحن میں کمو نائین بڑی ولٹوہی میں پانی گرم کر رہی تھی۔ دو تین روز پہلے ہونے والی بارش کے اڑے لکڑیاں ابھی تک گیلی تھیں اس لیے کمو کو بار بار ان میں پھونکیں مارنی پڑ رہی تھیں۔ گاؤں کی ہی ایک اور نام نہاد سیانی، جست کی بالٹی لیے پانی کے گرم ہونے کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اسی وقت نباں دائی گھنی کوٹھڑی سے ہاتھ نچاتی ہوئی نکلی۔

''ہنہ! بچہ نہ بچے کا نام، یہ تو ٹھنڈا پھوڑا تھا، جو آج پھٹ گیا، اور بچے ہوتے ہیں مردوں کے ہاں، بڈھے بابوں کے بس کا یہ روگ نہیں......''

کمو نے یہ سن کے حیرت سے انگلی منہ میں ڈال لی۔ برآمدے سے کسی خوش خبری کے شوق میں صحن کی طرف آتے میاں اللہ یار نے جب یہ سنا تو وہ اپنی جگہ پتھر کے ہوگئے۔ اسی وقت ڈیرے کا پھاٹک زور زور سے بجنے لگا اور ساتھ ہی ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے زور آور سانڈ غصے میں پھنکار رہے ہوں۔

کمو نے گھبرا کے بغیر اجازت ہی دروازہ کھول دیا۔ بیل گاڑیاں ڈھچر ڈھوں کرتی احاطے میں داخل ہوگئیں۔ وہ پانچ تھے یا چار، محسن کو اتنے فاصلے سے صاف نظر نہ آیا۔ لیکن ان میں ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا، جس کا بالائی بدن برہنہ تھا اور نیچے اس نے فقط تہہ بند باندھ رکھا تھا۔ اتنی دور سے بھی وہ اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ سکتا تھا جو اس طرح سلگ رہی تھیں جیسے دو یاقوت۔ گو محسن نے کبھی یاقوت بھی نہ دیکھے تھے لیکن ان آنکھوں کی آب کو اس کے علاوہ کسی اور شے سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔

وہ بغیر کسی کی طرف دیکھے سیدھا میاں اللہ یار کی طرف بڑھا اور ان سے کچھ کہا۔ لیکن گفتگو اتنی مدھم آواز میں تھی کہ محسن سمیت نہ تو نباں دائی ہی کچھ سن پائی اور نہ ہی کمو نائین کے کان میں کچھ پڑا۔

پھر کیا ہوا تھا یہ محسن کو اس لیے یاد نہ تھا کہ اس کو نیند کی جھپکی سی آگئی تھی۔ جوانی کی نیندیں بڑی ظالم ہوتی ہیں اور محسن کی جوانی تو تھی بھی اپنے جوبن پہ۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے اسے ایک میٹھی نیند سلا دیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ میاں اللہ یار صحن میں پاگلوں کی طرح ناچ رہا ہے۔ مینے نے ایک بچے کو کپڑے میں لپیٹ کر اٹھا رکھا تھا اور دائی پچھلے طویلے سے انعام میں ملی بھینس اور کٹی لے کر اپنے گھر جا رہی تھی۔

دونوں بیل گاڑیاں دور بھوریوں کی طرف جانیوالی سڑک پہ آہستہ روی سے رواں تھیں۔ یہ منظر محسن کے ذہن میں آج بھی اسی طرح تازہ تھا جیسے ابھی دیکھا ہو۔ لیکن اتنی تیز یادداشت کے باوجود اس کا دماغ اس واقعے سے کوئی بھی نتیجہ اخذ کرنے میں ناکام تھا۔

اسے یہ بھی یاد تھا کہ اگلے روز سب لوگ دائی کو اس کی ناتجربہ کاری پہ لعنت ملامت کر رہے تھے کہ تو تو کہتی تھی کہ بچہ نہیں ہے، پھوڑا تھا، پھر یہ نومولود ننھا گڈا کہاں سے آیا؟ اور دائی کھسیا کھسیا کے ہنسے جا رہی تھی۔

میں نے کہا نا، واقعات کو یاد رکھنا اور بات ہے اور ان سے نتائج اخذ کرنا اور بات ہے۔

اسرار، جو نہ جیتا تھا اور نہ مردہ تھا۔ اس کے بے ہوش وجود کو بازوؤں میں اٹھائے وہ بڑی متوازن چال چلتے جنڈ کے درختوں سے بنی اس کٹیا میں داخل ہوئے۔ ایک لمبی راہداری سے گزار کر وہ اسے پچھی کے پار والے کمرے میں لے گئے۔ یہاں انہوں نے اسے چٹائی پر لٹا دیا۔

بے ہوش اسرار کا چہرہ دیکھ کر ان کے دل میں محبت کا سمندر موجزن ہو گیا۔ اس کا رنگ گورا تھا اور بند آنکھوں کے پپوٹے دو سیپیوں کی طرح گھنی بھنوؤں کے نیچے دھرے ہوئے تھے۔ لمبی لمبی زلفیں اس کے لٹانے میں چٹائی پہ پھیل گئی تھیں اور لگتا تھا ابھی ان جٹاؤں سے کسی دریا کے دھارے پھوٹ پڑیں گے۔

اس قدر حسن عام انسان کے چہرے پر کہاں ہوتا ہے اور جب ہوتا ہے تو وہ انسان نہیں ہوتا ہے۔ انہوں نے بڑی محبت سے اس کے ماتھے پر آئی ایک لٹ پیچھے کی۔ اسی وقت جنڈ کی شاخوں میں کچھ کھڑ بڑ ہوئی اور وہ اندر داخل ہو گئی۔

جس روز آسمان سے مچھلیوں کی بارش برسی تھی اور گارڈن ہاؤس پر بجلی گری تھی اور اس منظر کی تاب نہ لا کے شاہدہ نے خود کو باکس روم میں بند کر لیا تھا۔ اس دن کے بعد سے انہوں نے مدھو کو نظر بھر کے بھی نہ دیکھا تھا۔ لیکن وہ جانتے تھے، وہ وہیں موجود تھی۔ اسرار کے ذرا بڑا ہو جانے کے بعد وہ کبھی اس کٹیا سے باہر نہیں گئی تھی۔

وہ سب افواہیں جو اس کی وجہ سے گاؤں اور شاملاٹ میں پھیلی تھیں، وقت کے ساتھ ساتھ دم توڑ گئی تھیں۔ زلزلے کے بعد کسی نے بھوریوں کا رخ بھی نہ کیا تھا مگر وہ ان کے سامنے نہیں آتی تھی۔ اتنے برسوں سے اس نے اپنے سواء کسی سے بات نہ کی تھی۔ وہ پانچوں نفوس یہاں موجود تھے۔

لیکن کوئی بھی کسی کے سامنے زیادہ نہیں آتا تھا۔ ان کے کپڑے بوسیدہ ہو گئے تھے اور ان بوسیدہ چیتھڑوں سے اپنے بدن ڈھانپے وہ جنڈ کی اس بھول بھلیاں میں غائب رہتے تھے۔ منظور کی بیوی نے ہاتھوں سے کھود کھود کر ایک قدرتی ٹوبے کو اتنا وسیع کر لیا تھا کہ برسات کا پانی جمع ہونے کے بعد اس کی بیٹی، جس کا آدھا جسم مچھلی کا اور آدھا انسان کا تھا، مزے سے اس ٹوبے میں تیرتی پھرتی تھی۔

یہ بات مدھو کو اس لیے معلوم تھی کہ ایک روز وہ غلطی سے اس طرف چلی گئی تھی جہاں وہ دونوں رہا کرتی تھیں۔ لیکن اپنی غلطی کا احساس ہونے پر وہ فوراً پلٹ آئی تھی۔

اسی بھول بھلیاں میں کہیں دادی بھی تھیں۔ انہوں نے مرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وقت ان کو بھول گیا تھا اور وہ بیٹھی گھنٹوں جانے کیا کیا بولا کرتیں۔

بولتی تو مسز بترا بھی تھیں۔ لیکن ان کی باتیں اب بھی عجیب ہوتی تھیں۔ وہ ایک سمندر کی کہانی سناتی تھیں، جو اب نہیں رہا، وہ اسے دیوتاؤں کا سمندر کہتی تھیں اور اس سمندر میں ایک بڑا سا جزیرہ تیرتا پھرتا تھا۔ پھر وہ جزیرہ زمین پر چڑھ آیا اور اس نے بڑے بڑے پہاڑ بنا دیے اور ان پہاڑوں پر دیوتا آ کے رہنے لگے اور ان دیوتاؤں نے پھر دریاؤں کی شکل اختیار کر لی اور دوبارہ سمندر میں جا ملے۔ وہی سمندر جو دیوتاؤں کا سمندر تھا۔ ہر چیز اپنے اصل کو پلٹتی ہے اور ہر چیز کا اصل ایک ہی ہے۔

مدھو کسی کے پاس بھی نہیں بیٹھتی تھی۔ نہ دادی کے، نہ مسز بترا کے اور عرفان صاحب نے تو اس دن کے بعد سے اسے نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھا تھا۔ مدھو کٹی کے باہر بیٹھی گھنٹوں میاں اللہ یار کے ڈیرے کی طرف دیکھا کرتی تھی جہاں اسرار رہتا تھا۔

اسرار، جس نے اس دنیا میں آنا تھا۔ جو اس گھرانے کی نسل چلانے کے لیے آیا تھا جو سب کا سب مار دیا گیا تھا، جو شاہدہ کے ہاں پیدا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ بانجھ تھی اور یہ بات اس کے امیر ماموں کو بخوبی معلوم تھی کہ شاہدہ باوجود اس کے کہ دیکھنے میں ایک خوبصورت عورت ہے لیکن درحقیقت وہ عورت نہ تھی۔ قدرتی طور پر اس کے جسم میں بیضہ دانیاں نہ تھیں۔ یہ بات جب عرفان صاحب کو معلوم ہوئی تو ابھی دریا والی بات نہیں ہوئی تھی۔

ان کے اندر اپنی نسل چلانے کا سرکش جذبہ ابھرا اور انہوں نے شیرون میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ شیرون جو اردو فلموں کی بنگالی اداکارہ تھی مگر شاہدہ کو اس بات کا ذرا بھی اندازہ نہ تھا۔ ان ہی دنوں دریا والی بات ہو گئی اور پھر وہ عرفان صاحب سے ملنے آیا۔ بھری دوپہر میں، اس کے پاس ایک پٹاری تھی اور اس میں ایک کالا ناگ تھا۔ وہی ناگ جو شاہدہ نے بلیئرڈ روم کے ساتھ والے باکس روم میں دیکھا تھا۔

وہ بڑی دور سے آیا تھا۔ یہ تو عرفان صاحب کو اسے دیکھ کر ہی معلوم ہو گیا تھا لیکن اس کا کہنا تھا کہ وہ منگلا سے آیا ہے۔ جہاں منگلا مائی کا مندر تھا اور جہاں منگلا ڈیم بننے والا تھا۔

وہ ان کے لیے کچھ لایا تھا۔ کالا ناگ۔ منگلا کی پہاڑیوں میں رہنے والا کالا ناگ پھر اس نے انہیں بتایا کہ یہ سب کتنا ہولناک ہے۔ بھلا کبھی دریا بھی تقسیم ہوتے ہیں؟ اس سے زیادہ احمقانہ بات کیا ہو سکتی ہے کہ زمین میں جہاں پانی ذخیرہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہاں ایک گڑھا کھود دیا جائے؟ بھلا دریاؤں کا پانی بھی جمع کیا جا سکتا ہے؟

پھر اس نے انہیں بتایا کہ بند بنانے والوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔

''میرے بھائی! انسان بہت بودا ہے۔ بے وقوف اور سرکش۔ اسے دریاؤں کے بہاؤ سے نفرت ہے اسے

چلتی ہوائیں بری لگتی ہیں۔ اسے پرندوں، جانوروں، حشرات الارض سے جان کا خوف ہے۔ پھر جب یہ سب کو مار ڈالتا ہے تو ایک دوسرے کو بھی مار ڈالتا ہے۔

اس کو خود پہ بہت مان ہے، لیکن میرے بھائی! دریا منہ زور ہوتے ہیں۔ اپنی طاقت کے نشے میں انسان سے بھی زیادہ مست۔ یہ جو تم لوگ دریاؤں کو باندھ رہے ہو، جانتے ہو کیا ہوگا؟''

عرفان صاحب اپنی تعلیم کے نشے میں سرشار اس جوگی کی باتیں سن رہے تھے کال کلوٹا، جاہل آدمی۔

جوگی کو شاید کچھ بھی پتا نہیں تھا، وہ یوں ہی منہ اٹھا کر چلا آیا تھا۔ بڑی دیر وہ خاموش بیٹھا بٹر بٹر انہیں دیکھتا رہا۔ پھر ناگ کی پٹاری ان کی طرف کھسکائی۔

''یہ وہاں رہتا تھا، جہاں ڈیم بنا رہے ہو۔ میں اسے بچا لایا''۔

پھر وہ چلا گیا۔ عرفان صاحب نے اس کی بات پر غور نہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اس رات انہوں نے ایک عجیب خواب دیکھا۔

انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک عجیب وغریب جگہ کھڑے ہیں۔ ایک ٹیلا اور چاروں طرف دریا بہہ رہا ہے۔ اور اس دریا میں کاریں اور ٹرک اور مکان اور ملیں اور دکانیں اور انسان سب بہتے جا رہے ہیں اور وہ بے حسی سے کھڑے ان بہنے والوں کو دیکھ رہے ہیں۔

یہ خواب پھر ایک تسلسل سے نظر آنا شروع ہوا۔ ایک رات، دوسری رات، تیسری رات اور جب نوراتوں تک انہوں نے یہ خواب مسلسل دیکھا تو وہ چونک گئے اور انہوں نے وادی سندھ کے آبپاشی کے نظام کو دوبارہ سے پڑھنا شروع کیا۔

انہوں نے اس موضوع پہ بہت کچھ پڑھ ڈالا اور پھر ایک روز انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ اس دن کے بعد سے وہ راوی کے آس پاس سے، مچھلیاں اور گھونگھے اور کیکڑے اور دریائی جھینگے اور گوہیں اور سانپ اور دیگر حشرات جمع کرنے لگے۔ پھر انہوں نے منظور کی بیوی بیٹی، جسے اس نے اپنے گھر ہی میں چھپایا ہوا تھا اور دادی اور اسرار اور مدھو کو لیا اور وہاں سے چلے گئے۔ ریت کے اس سلسلے کی طرف جہاں کبھی دریا بہتا تھا اور یہ زمین انہیں ان کی امروہے کے قریب والی زمین کے کلیم میں ملی تھی اور اس دریا کی گزرگاہ تھی جو راستہ بدل گیا تھا اور عقل مند آدمی کبھی دریا کے راستے اور سانپ کی لکیر پر پیر نہیں دھرتا۔

مسز بترا کو وہ تب لائے جب انہیں خبر ملی کہ کوٹھی بکنے والی ہے۔ خریداروں کی موت اس کے بعد ہوئی اور اس میں عرفان صاحب کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔

یہاں آ کے بسنے کے لیے انہیں صرف میاں اللہ یار کی آشیرباد چاہیے تھی۔ اسی لیے وہ اس کے پاس پہنچے۔ یہ وہ دن تھا جب میاں اللہ یار میںے اور سارے گاؤں کے سامنے ذلیل ہونے والا تھا۔ کوئی دیر ہو جاتی کہ نباں دائی اپنا ہاتھ نچا کے کہنے والی تھی، ''میاں اللہ یار تو ہنہہ! ہنہہ!'' لیکن عین اسی وقت یہ لوگ وہاں پہنچ گئے۔ جب عرفان صاحب نے انہیں اپنی آمد کی غرض سے آگاہ کیا تو ان کے شاطر دماغ میں فوراً ہی ایک منصوبہ آیا اور انہوں نے انہیں وہاں بسانے کے عوض مدھو کا نوزائیدہ بیٹا مانگ لیا۔

اب یہ بتانا کہ مدھو وہیں روپوش رہی اور اسرار کو اسی نے پالا تو یہ ایک فضول تفصیل ہوگی۔

اصل بات یہ ہے کہ اتنے بڑے سودے کے بعد بھی میاں اللہ یار کا پیٹ نہ بھرا اور یہ بھوریاں جو سالوں سے ویران پڑی تھیں جب ان پر عرفان صاحب اپنے عجیب کنبے کے ساتھ بسنے آئے تو اللہ یار کو یہاں امکانات کا جہاں نظر آنے لگا اور وہ اپنی بات سے پھر گئے۔ یہاں تک کہ میمنوں والا واقعہ ہوا اور میاں اللہ یار اپنی حرکتوں سے باز آیا۔

مدھو نے اسرار کے چہرے کو دیکھا۔اس کا رنگ اتنا ہی سفید اور نقش اتنے ہی سبک تھے، جتنے عرفان صاحب کے،اس کے بال مدھو کی طرح گھونگھریالے تھے اور مدھم پڑتی ہوئی سانسوں کے باوجود اس کے رنگ میں ہلکی سی گلابی کی آمیزش تھی۔

مدھو نے ملتجی نظروں سے عرفان صاحب کو دیکھا۔سالوں بعد، اس طوفانی سہ پہر کے بعد آج درمیان کے اتنے برس ایک منجمد گلیشیئر کی طرح ان دونوں کے درمیان خاموش پڑے تھے۔جنڈ کی شاخوں میں پناہ لینے والی چڑیاں شور مچا رہی تھیں اور دور آخری کمروں میں منظور کی بیوی کے، باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

اس نظر میں آج بھی عجیب اسرار تھا۔عرفان صاحب پوری جان سے لرز گئے۔انہیں یوں لگا، ان کے جسم میں کہیں دور کسی لاوے کی چٹان میں کوئی ابال اٹھا ہے اور ایک زلزلہ انہیں کہیں سے کہیں پٹخنے والا ہے۔

”اسے بچالیں اسے کچھ ہوگیا تو میں بھی مر جاؤں گی“ ابھی ان الفاظ کی بازگشت باقی تھی جنڈ کی شاخوں میں بیٹھے ہریل نے بلاوجہ زور سے پر پھڑپھڑائے۔

عرفان صاحب اپنی جگہ بیٹھے تھے وہ اسے کیسے بچاتے؟ ان کے پاس ایسا کوئی علم نہ تھا جس سے زخم بھر جائیں اور بیمار ٹھیک ہو جائیں۔

وہ تو علم کے بے کنار دریا سے ایک قطرہ کشید کر کے حیران تھے۔آگہی نے ان کی زندگی بدل ڈالی۔وہ دن جب انہیں معلوم ہی نہ تھا کہ جو کچھ ہوا اور جو کچھ وہ کرنے والے تھے وہ سب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ان دنوں وہ کتنے خوش رہتے تھے۔ان کے پاس دیکھنے کو حسین خواب اور کرنے کو خوبصورت باتیں تھیں۔ان دنوں میں وہ ریشم اور کم خواب جیسے دنوں میں جیتے تھے۔سچ کا کھدر پہن کے، کس نے چین پایا؟

انہوں نے دکھ سے اسرار کو دیکھا۔کاش وہ اسے بچا سکتے، وہ سمجھتے تھے استعفیٰ دے کے، لاہور سے بھاگ کے۔مدھو اور اس کے بچے کو بھی یہاں لا کے وہ بچ جائیں گے۔لیکن موت سانپ بن کے اسرار کو ڈس گئی۔

مدھو نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔اسی وقت دادی جھکی جھکی اندر داخل ہوئی اور اسرار کے تلوے

ملنے لگی۔ ہلدی، تیل اور کافور کی بو سارے میں پھیل گئی۔ دور کسی اوراوٹ میں سنر بتراہا آواز بلند ایک سمندر کا ذکر سنا رہی تھیں، جسے دیوتاؤں کا سمندر کہا جاتا ہے اور منظور کی بیٹی کے ہنسنے کی آواز اور تیرنے کے چھپاکے سنائی دے رہے تھے اور سب طرف سے سائیں سائیں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ سب جن کے حصے کی زمین پہ انسان قابض ہو گیا تھا، وہ سب اپنی فتح کردہ سلطنت میں آسودہ تھے اور اتنے بڑھ چکے تھے کہ زمین کے نیچے اور اوپر، ایک انچ بھی ان سے خالی نہیں تھا۔

اسرار نے آنکھیں کھولیں۔ چند لمحے وہ خالی خالی نظروں سے کٹی کی چھت کو دیکھتا رہا، جہاں گکرونڈے، ون اور لسوڑوں کے پھل آپس میں گتھ کریوں لٹک رہے تھے کہ لگتا تھا برقی قمقمے لٹک رہے ہوں۔

پھر اس نے گردن گھما کے مدھو کو دیکھا اور اس کے چہرے پہ شدید الجھن نمودار ہوئی۔ یہ عورت کون تھی؟ اور یہ کالا بجنگ آدمی اور یہ جگہ؟ اتنی اجنبی جگہ؟ وہ ایک دم اٹھ کے بیٹھ گیا اور تب اس کی نظر بڑھیا پر پڑی۔ اس قدر بوڑھا انسان، اس نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ وقت بڑھیا کے آگے عاجز آ چکا تھا۔ ایک سوکھی لکڑی کی طرح وہ ٹیڑھی ہو چکی تھی سر پہ ذرا ذرا سے چھدرے بال اور پوپلا منہ، جسم پہ جھولتے چند چیتھڑے اور کرنجی آنکھوں میں جیئے چلے جانے کی ہوس۔ اسرار کو وہ بہت دلچسپ لگی۔ لیکن اس کے اٹھتے ہی وہ بھی اٹھی اور بلی کی سی تیزی سے وہاں سے غائب ہو گئی۔

"آپ لوگ کون ہیں؟" وہ بولا تو اس کی آواز کی نغمگی پہ وہ دونوں جھوم اٹھے۔ اسرار کی آواز بھی اسی کی طرح خوبصورت تھی۔ مدھو نے عرفان صاحب کو دیکھا وہ دونوں اسے کیا بتاتے کہ وہ کون تھے؟ جو کچھ ان پہ بیتا تھا۔ اسے سن کے کون ان کو بے گناہ مانتا؟ اسرار اس ساری کہانی پہ کیسے یقین کرتا؟

"آپ لوگ کون ہیں اور یہ کیا جگہ ہے؟"

بعض اوقات، سادہ ترین سوالات کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ وہ لوگ کون تھے اور یہ کیا جگہ تھی؟ اس سوال کا جواب کون دیتا؟ مدھو کے سب اختیارات اس روز کے بعد سے جیسے سلب ہو گئے تھے۔ واقعات کا ایک منہ زور اور پرشور سیلاب اسے اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہا تھا اور وہ اس کے ساتھ بہے جا رہی تھی۔ ایسے میں وہ کون تھی اور کہاں تھی کا سوال تو وہ خود بھی فراموش کر چکی تھی۔ عرفان صاحب کے اس فرار میں ان کا ساتھ دیتے ہوئے اس نے کچھ نہ سوچا تھا۔ وہ بس جینا چاہتی تھی۔ اسرار کو زندہ رکھنا چاہتی تھی۔ اسرار جسے دادی لے کر بھاگ گئی تھی اور پھر مدھو نے اسے عرفان صاحب کے گھر میں جا پکڑا تھا۔ وہ اسرار سمیت وہیں چھپی ہوئی تھی۔ پھر وہ سب بیل گاڑیوں پہ لد کے یہاں آ گئے تھے۔ یہ کیا جگہ تھی؟ نہ مدھو نے سوال کیا، نہ اسے جواب ملا، لیکن اب اسرار کو جواب چاہیے تھا۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اسرار کو اب اس جگہ سے الجھن سی ہونے لگی اور جھاڑیوں کے بیچ میں کچی زمین پہ پھٹے حالوں بیٹھے ان لوگوں سے وحشت۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اٹھے اور یہاں سے بھاگ جائے۔ لمبی لمبی جستیں لگاتا واپس اپنے دوستوں اور کالج کے ساتھیوں کے درمیان پہنچ جائے۔ جہاں زندگی اپنی پوری رنگینی کے ساتھ چلے جا رہی ہوگی۔

اس خیال سے اس کے چہرے پہ مسکراہٹ سی آ گئی۔ عرفان صاحب جو اسے غور سے دیکھ رہے تھے جان گئے کہ وہ اپنی زندگی سے خوش ہے اور ان کا دل دکھ سے بھر گیا۔ کیا وہ اپنے بیٹے سے، اپنی واحد اولاد سے جینے کی خوشی چھین سکتے تھے؟ ان کی آنکھوں کے زمرد جھلملائے اور انہوں نے کھنکھار کے گلا صاف کیا۔ جب وہ بولے تو ان کی آواز بہت صاف تھی۔

"تمہیں سانپ نے ڈس لیا تھا اور وہ لوگ تمہیں یہاں علاج کے لیے چھوڑ گئے۔"

"اچھا؟ سانپ نے کہاں ڈسا؟ کہاں ہے نشان؟ اسرار نے اپنے ہاتھ پاؤں ٹٹولے۔ عرفان صاحب جانتے تھے، وہ ایسی ہی کوئی بات کرے گا۔ وہ بھی اسی طرح کی باتیں کرتے تھے۔ ہر بات کی تاویل مانگتے تھے اور جب ان کو تاویلات دکھائی گئیں تو ان کا دماغ ہل کے رہ گیا۔

"یہ وہ سانپ نہیں، جو کاٹتا ہے۔ یہ سانپ سانس کے ذریعے اپنا زہر شکار کے منہ میں پہنچاتا ہے اور......" اس سے پہلے کہ عرفان صاحب کچھ کہتے اسرار نے زور سے تالی بجائی اور ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گیا۔

"نو وے! یعنی اب آپ مجھے ایک fictional سانپ سے ڈسوا کے اس...... عجیب سے سیٹ پہ لا کے میرے اباجی سے کوئی موٹی رقم اینٹھنے کے چکر میں ہیں؟"

ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ کھڑا ہوا تو اس کا سر جنڈ کی نچلی شاخوں سے جا لگا۔ کئی ننھی ننھی چڑیاں اپنے گھونسلوں سے گھبرا کے اڑ گئیں۔ شاید وہ اسرار کے گھنگریالے بالوں سے ڈر گئی تھیں۔

پھر اس نے چٹکی بجائی اور انہیں بتایا کہ وہ وکیل بن رہا ہے اور اس قسم کے نوسربازوں کو بخوبی جانتا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مذہب کے نام پر مسجدیں اور دارالعلوم بنا کے قیمتی جائیداد پہ قبضہ کرنے والوں اور ان لوگوں میں کوئی فرق نہیں۔ نیز یہ کہ انہوں نے چند قدرتی واقعات اور آفات کو آپس میں مربوط کر کے جو خوف اباجی یعنی میاں اللہ یار کے دل میں بٹھا کے ان بھوریوں پہ قبضہ کر رکھا ہے لیکن اب وہ شہر سے واپس آ گیا ہے اور نہ ہی وہ اپنے باپ یعنی اللہ یار کی طرح ان پڑھ ہے اور نہ ہی مینے کی طرح سہل پسند، تو بہتری اسی میں ہے کہ اپنا باسن اٹھائیں اور یہاں سے چلتے بنیں۔

یہ سب کہنے کے بعد اس نے ایک حقارت بھری نظر مدھومتی عرف زینب بترا پہ ڈالی جو ایک بدرنگی چندیاں جڑی ساڑھی باندھے اسے دیکھ رہی تھیں اور ایک دھمکی آمیز ہنکارا ابھرتا، جنڈ کی شاخوں سے الجھتا، ان شاخوں میں رہنے والی مخلوقات کو پریشان کرتا، باہر نکلا۔

آسمان پہ جولائی کا چاند نکلا ہوا تھا اور ٹیلوں پہ رہنے والے سب کے سب، اپنے اپنے بلوں اور بانبیوں اور گڑھوں میں جا دبکے، صرف ریت پہ ان کے گھسٹنے رینگنے اور چلنے سے بننے والے نشانات تھے۔ ون اور دب کی جھاڑیاں اور جھاڑیوں سے جھانکتی ہزاروں آنکھیں اور کیکر اور اکانہہ کے دیوقامت درخت اور بھوریوں کا کالا ناگ سب دم سادھے چاندنی میں نہائے دم بخود تھے۔ یہ باؤ اسرار، جسے دنیا میں لانے کے لیے فطرت نے اتنا بڑا ڈرامہ

کیا یہ سب باؤ اسرار کے لیے تھا؟

کیا اور جسے زندہ رکھنے کے لیے عرفان صاحب اور مدھو نے اتنے پاپڑ بیلے اور جس کو پالنے کے لیے کتنے ہی لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے وہ باؤ اسرار، اتنا بودا، اتنا سطحی، اتنا کمینہ نکلا؟ میاں اللہ یار سے بھی زیادہ سفلہ، اسے ان بھوریوں کی ہوس تھی، وہ بھی ان پہ قبضہ جمانا چاہتا تھا۔ ان سب کو زمین بدر کرنا چاہتا تھا۔ اسے بھی پانیوں کا لالچ تھا، اسے بھی یہ ساری زمین چاہیے تھی، ساری آکسیجن ساری خوراک اور جو وہ حاصل نہ کر سکتا تھا اس میں وہ زہر گھول دینا چاہتا تھا۔

دادی نے کٹی کے دروازے پہ کھڑے ہو کے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسے لمبے لمبے ڈگ بھرتے، میاں اللہ یار کے سرسبز کھیتوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ شیو جی جیسی لمبی لمبی جٹائیں ہوا میں اڑ رہی تھیں لیکن اسے ان سب کی اور ان سب کی جو اس کے منتظر تھے کوئی پروا نہ تھی۔ جب اسے چند کلومیٹر کے اس ریتلے ٹکڑے کی اتنی خواہش تھی تو وہ پوری وادی، جو ان سب کی تھی اور جسے وہ واپس لینا چاہتے تھے، اس وادی کا کیس وہ کیسے لڑ سکتا تھا؟ وہ جو شہر سے وکیل بن کے آیا تھا۔ دادی کی آنکھ سے آنسو کا ایک بڑا سا قطرہ پھسلا اور چہرے کی نشیبی جھریوں میں غائب ہو گیا۔

اسرار بھوریاں پار کر کے اپنے دونوں بھائیوں سے جا ملا جو اسے اپنے پیروں پہ چل کے آتا دیکھ کر خوشی سے ناچ رہے تھے اور بکرے بلا رہے تھے اور انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ سب کیا ہے؟

(۲۷)

یونیورسٹی لاء کالج میں وہ سب سے حسین لڑکی، اسرار پہ عاشق ہوگئی اور یہ خبر ایک برقی رو کی طرح پورے کیمپس میں پھیل گئی کہ باؤ اسرار جو کسی زمیندار کا بیٹا تھا اور اپنی ذاتی کار پہ ہاسٹل سے یونیورسٹی آتا تھا اس کے کندھوں پہ عشق کا ہما آبیٹھا ہے۔

نازنین، نام ہی کی نازنین نہیں تھی اسم بامسمیٰ تھی۔ اس کی تعریف کے لیے کوئی بھی لفظ استعمال کیا جاتا۔ کم ہی رہتا۔ لیکن باؤ اسرار کو اسے دیکھ کر بارش کا دھیان آتا تھا۔ ساون کی بارش جو بس سیدھی سیدھی برس رہی ہو۔ اس پانی میں جو حسن، رعنائی اور زندگی کا احساس ہوتا ہے، مٹی پہ پڑنے سے جو خوشبو پھوٹتی ہے۔ کچھ ویسی ہی کیفیت نازنین کو دیکھ کر اس پہ طاری ہو جاتی تھی۔ اسے لگتا تھا بارش میں نہا نہا کے اس کی پوریں گل گئی ہیں اور سارا جسم کپکپا رہا ہے اور ہونٹوں پہ ایک ایسے پانی کی نمی ہے جسے ابھی زمین نے نہیں چھوا۔ وہ اسے پاگلوں کی طرح دیکھتا رہتا تھا اور دیکھنے والے اس کی محویت پہ ہنستے تھے۔

نازنین، خود ہی اسرار پہ عاشق ہوئی تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ پوری یونیورسٹی میں اسرار کے جوڑ کا کوئی دوسرا کب تھا۔ نازنین لاہور ہی کی رہنے والی تھی۔ یونیورسٹی میں ان کی پہلی ملاقات لائبریری میں ہوئی۔ جہاں نازنین نے اسرار کو بتایا کہ وہ اس کی کلاس فیلو ہے۔

چند دن بعد نازنین کی سالگرہ تھی اور یہ سالگرہ اس نے ہمیشہ کی طرح اپنے گھر میں منائی۔ یونیورسٹی کے سب ہی لوگوں کو مدعو کیا گیا۔ رسمی تقریب کے بعد سب نے خوب ہاؤ ہو کی۔ کچھ لڑکے لڑکیوں نے بڑی سنجیدگی سے گانا گانے کی کوشش بھی کی۔ لیکن کسی کی پیش نہ چلی۔

میوزیکل چیئر کھیلنے کی کوشش کی گئی لیکن مارے ہنسی کے دوروں کے یہ بھی نہ ہو سکا۔ پاس دا پارسل کھیلتے ہوئے وہ ہڑبونگ مچی کہ اللہ کی پناہ۔

کسی طرح دس بجے تک یہ ہنگامہ تھما اور سب اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔ ہاسٹل کے لڑکے لڑکیاں اتنی رات گئے واپس نہ جا سکتے تھے چنانچہ مقامی دوستوں کے گھروں کا رخ کیا۔ سب ہی لوگ چلے گئے، سوائے باؤ اسرار

کے۔ نازنین نے جیسے دانستہ اس سے پوچھا ہی نہیں کہ وہ کیوں نہیں جارہا۔

نازنین ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بیشتر امیر اور پڑھے لکھے ماں باپ کی طرح انہیں اپنی بیٹی پہ ایک اندھا اعتماد تھا جو صرف جدید سوچ رکھنے والے ماں باپ ہی کو اپنی اولاد پر ہوتا ہے غریب اور پسماندہ لوگ ہمیشہ اپنی اولاد کی طرف سے بدگمانی میں مبتلا رہتے ہیں۔ (واہ!)

اسی اعتماد کے تحت وہ لوگ بڑی جلدی پارٹی میں سے اٹھ کر چلے گئے تھے اور اب تک غالباً سو بھی چکے تھے۔ لڑکے لڑکیوں کے جانے کے بعد جب وہاں صرف اسرار اور نازنین رہ گئے تو نازنین نے اسرار سے ایسے کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

''لان میں بیٹھیں؟'' اسرار چابی والے گڈے کی طرح بڑی سعادت مندی سے اس کے ساتھ چلتا ہوا لان میں آیا اور ایک گدے دار کرسی پہ نیم دراز ہوگیا۔

لان میں ٹشو پیپر، گڈی کاغذ کی پنیاں، استعمال شدہ پیپر کپ اور تحفوں پہ سے اتارے گئے رنگین کاغذ اچھلے ہوئے تھے۔ ایک ملازم کالا تھیلا تھامے خاموشی سے کوڑا چن رہا تھا۔ چاند سامنے درختوں کے جھنڈ کے پیچھے سے طلوع ہو چکا تھا۔ لان میں رات کی رانی کی اکساد ینے والی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور باؤ اسرار کو لگ رہا تھا کہ اگر نازنین نے اسے جلد ہی جانے کا نہ کہہ دیا تو شاید وہ یہیں پتھر کا بن جائے گا اور پھر کوئی بھی اسے وہاں سے نہ اٹھا پائے گا۔

نازنین دھم سے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ اس کی نیلی جینز کے پائنچے ذرا اٹنگے تھے اور جالی کی سفید قمیض کا کشتی نما گلا ایک کندھے کی طرف کو ڈھلکا ہوا تھا، جس سے اس کے گول ڈھلائی شانے نظر آ رہے تھے۔ اسرار اپنی کرسی میں پتھر کا بن کے بیٹھا رہا۔

اس رات انہوں نے لان میں بیٹھ کے اتنی باتیں کیں کہ آسمان کا رنگ مدھم پڑ گیا اور درختوں پہ بسیرا لینے والے پرندے جاگ کر شور مچانے لگے۔ واپسی کے راستے میں اسرار کو بے شمار دودھ والے ملے جو اپنے اپنے ریڑھوں، موٹر سائیکلوں اور ویگنوں پر دودھ کے سنہری دولٹو ہے اور جستی کین رکھے قریبی دیہاتوں سے شہر کا رخ کر رہے تھے۔

اگلی شام پھر اس کا رخ خود بخود نازنین کے گھر کی طرف ہوگیا۔ نازنین کے ماں باپ کھانے کے وقت تک تو ان کے ساتھ بیٹھے پھر ذرا دیر میں اٹھ کے سونے چلے گئے۔ اس رات بھی، طلوع سحر تک وہ دونوں وہیں بیٹھ کے باتیں کرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی بے ضرر باتیں۔ گھر کے قصے، بچپن کی باتیں، ان وقتوں کی باتیں جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ نہ تھے۔

اسرار مسلسل چالیس دن نازنین کے ہاں جاتا رہا۔ چالیسویں رات انہیں لگا کہ باتیں ختم ہوگئی ہیں۔ اب وہ صرف اپنے آپ کو دہرا رہے ہیں اور اس چیز نے انہیں ڈرا دیا۔ کیونکہ باتیں ختم ہو جانے کے بعد وہ اپنی نظروں کو کیسے قابو کرتے جو بلا وجہ غلط غلط طرح سے غلط طرف اٹھنے لگتی تھیں۔ نازنین بولتی تو اسرار کی آنکھیں اس کے ہونٹوں

سے جھک جاتیں اور وہاں سے اٹھتیں تو عیاش بڈھوں کی طرح اس کی گردن اور کانوں کی لوؤں کو چھونے لگتیں۔

چنانچہ دونوں نے گھبرا گھبرا کے ادھر ادھر کی ہانکنی شروع کر دی اور نازنین نے لان کی دیوار کے پار نظر آنے والے درختوں کے جھنڈ کے بارے میں ایک محیر العقول واقعہ سنانا شروع کر دیا۔

''پاپا بتاتے ہیں کہ مدھو آنٹی اور عرفان انکل ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ پہلے تو مدھو آنٹی نے شاہدہ آنٹی سے دوستی کی اور اس بہانے ان کے گھر آتی جاتی رہیں۔ پھر جب انہیں لگا کہ شاہدہ آنٹی کو کچھ اندازہ ہو گیا ہے تو انہوں نے چھپ چھپ کے ملنا شروع کیا۔

عرفان انکل کا کوئی رشتے دار نہیں تھا اور شاہدہ آنٹی کی فیملی بہت امیر تھی۔ یہ گھر وغیرہ سب ان کا دیا ہوا تھا۔ اس لیے انکل انہیں چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ پھر ان دونوں نے پلان کیا کہ آنٹی کو مینٹل ٹارچر کر کے مار دیا جائے۔ عرفان انکل نے عجیب حرکتیں شروع کر دیں، جاب چھوڑ دی، عجیب سا حلیہ بنا لیا اور گھر میں عجیب جانور پالنے شروع کر دیے۔ سانپ، بچھو، مینڈک، مچھلیاں اور پتا نہیں کیا کیا؟

آنٹی شاہدہ بے چاری اتنی ریفائنڈ عورت، وہ بہت پریشان رہنے لگیں۔ اس پہ مدھو آنٹی ان سے جھوٹی ہمدردی جتاتی تھیں اور وہ بے چاری سب جانتے ہوئے بھی انہیں کچھ نہیں کہتی تھیں۔''

وہ سانس لینے کو رکی۔ اسرار کو یہ کہانی بہت دلچسپ لگی۔

''بے وقوف تھیں، پہلے ہی دن کان سے پکڑ کے باہر نکال دیتیں۔'' اسرار نے اپنے دیہاتی انداز میں سوچا۔

''پھر پتا ہے کیا ہوا؟ شاہدہ آنٹی اتنی سٹریسڈ ہو گئیں کہ انہوں نے سب سے ملنا بند کر دیا۔ پھر ایک دن......''

وہ کچھ کہتے کہتے جھجک گئی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کی خود اعتمادی لوٹ آئی اور وہ بڑے آرام سے بارش والے دن کا واقعہ سنانے لگی۔

''ایک دن آنٹی شاہدہ نے ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ لان میں، آنٹی اتنی دکھی ہوئیں کہ ان کو ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ لیکن ماما کہتی ہیں کہ ایسا نہیں تھا۔ انہیں مارا گیا تھا۔ مدھو آنٹی اور انکل عرفان نے انہیں ڈرانے کے لیے سارے لان میں مچھلیاں پھینک دیں اور کہا کہ آسمان سے مچھلیوں کی بارش ہو رہی ہے۔''

''مچھلیوں کی بارش؟'' پانی پیتے ہوئے اسرار کو اچھو لگا۔

''ہاں مچھلیوں کی بارش۔ انہیں اتنا ڈرا دیا کہ بے چاری کا دل بند ہو گیا۔''

''اوہو! بہت ہی برے ہوں گے وہ دونوں۔''

اسرار کو اس قصے سے خواہ مخواہ دلچسپی پیدا ہونا شروع ہو گئی۔

''پھر مدھو آنٹی کے ہاں بیٹا ہوا اور اتنا ہنگامہ مچا کیونکہ بچے کی آنکھیں نیلی تھیں، عرفان انکل جیسی۔''

''ارے، آنکھیں تو میری بھی نیلی ہیں، میرے پیدا ہونے پر تو کوئی ہنگامہ نہیں مچا تھا۔''

''اوہو! بے وقوف، ان کے گھر میں کسی کی آنکھیں نیلی نہیں تھیں نا اس لیے۔''

''تو میرے گھر میں بھی کسی کی آنکھیں نیلی نہیں ہیں۔''

''چھوڑو نا، یہ تو ظاہری بات تھی نا، اتنے لوگوں کو پتا تھی اس لیے شور مچا، ورنہ کبھی کبھار بچوں میں ایسی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں جو ماں باپ میں نہیں ہوتیں اور اس کی وجہ اکثر میوٹیشن ہوتی ہے۔''

''ہاں میوٹیشن، میں نے بھی پڑھا تھا کہ ارتقاء کے لیے خام مال میوٹیشن ہی فراہم کرتی ہے، اکثر عجیب الخلقت بچے پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اصل میں وہ اپنے وقت سے پہلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر کبھی ماحول میں کوئی ایسی تبدیلی آئی جو ہمارے لیے نا قابلِ قبول اور ان عجیب الخلقت لوگوں کے لیے ٹھیک ہوگی تو ان کی نسل تیزی سے بڑھے گی اور۔۔۔۔''

'چپ بھی کرو اسرار! اتنی بور باتیں مت کرو، میں تمہیں گوسپ سنا رہی ہوں، ماما کی کٹی پارٹی والی فرینڈز کی ہائسٹ گوسپ اور تم مجھے بیالوجی کا لیکچر دے رہے ہو۔ میں نے بھی ''ٹین ایج میوٹنٹ ننجا ٹرٹلز'' دیکھے ہوئے ہیں۔''

''بھئی تم نیلی آنکھوں کی بات کر رہی تھیں تو مجھے دھیان آ گیا کہ یہ تو ایسی بات نہ تھی کہ اس پہ ہنگامہ مچایا جاتا۔''

''اچھا بس نا، اب آگے سنو، اس بچے کے پیدا ہونے پر مدھو آنٹی کے ہزبینڈ نے خودکشی کر لی اور ان کی پردادی جو بہت بوڑھی تھیں، اس بچے کو لے کر کہیں بھاگ گئیں۔

پھر پتا چلا کہ یہ جھوٹ ہے دراصل انکل بترا نے مدھو آنٹی، دادی اور اس بچے کو مار کے ان کی لاشیں انکل عرفان کے گھر میں پھینک دی تھیں اور شاید انکل عرفان کو بھی مار دیا اور پھر ان کے گھر کو آگ لگا دی۔''

''واقعی؟'' اسرار کو اب اس کہانی نے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

''اور ہاں، ماما یہ بھی بتاتی ہیں کہ مدھو آنٹی وغیرہ کے قتل سے پہلے عرفان انکل کے کوارٹرز میں ایک عجیب بچی پیدا ہوئی تھی۔ جس کا نچلا دھڑ مچھلی کا اور اوپر کا جسم انسان کا تھا۔''

''نہیں''!! اسرار اضطراری طور پہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہاں نا!'' وہ اور بھی وثوق سے بولی اور اٹھ کے اسرار کے پاس چلی گئی۔ چڑھتے چاند کی راتیں تھیں، نو یا پھر دس تاریخ تھی۔ رات کی رانی کی وہی خوشبو جس پہ ناگ مست ہو کے ناچنے لگتے ہیں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ درختوں کے نیچے نقرئی چاندنی کے غبار سے بچے سبزے پہ سیاہ سائے تھے اور ان سایوں میں چھپ کے بیٹھنے کو خواہ مخواہ ہی دل چاہنے لگتا تھا۔ نازنین نے کوئی خوشبو لگا رکھی تھی جس کا بھپکا اسرار کے نتھنوں میں گھسا اور وہ گھبرا کے واپس بیٹھ گیا۔

''واقعی اسرار! ماما کہتی ہیں ہمارے ڈرائیور کی بیوی نے خود دیکھا تھا، وہ ایسی ہی تھی۔''

''جل پری؟'' اسرار نے حیرت، خوف اور تجسس کے ملے جلے جذبات سے پوچھا۔

''ہاں، ہاں، جل پری''، نازنین نے اثبات میں سر ہلایا۔

''پھر وہ جل پری کہاں گئی؟''

''اس کی ماں اسے لے کر نہر میں کود گئی۔'' نازنین نے تاسف سے بتایا اور واپس کرسی میں بیٹھ گئی۔ چاندنی اس کی قمیض پہ ٹنکے ایک نگ میں جیسے قید سی ہوئی اور پھر وہ نگ ان نقرئی کرنوں کی پکڑ میں آ کے ایسا جھلملایا کہ اسرار کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔

''ہو سکتا ہے وہ جل پری اب بھی کہیں کسی نہر میں زندہ ہو، کتنا پرانا ہے یہ واقعہ.....؟''

''بہت سال ہو گئے، میں تو جب پیدا بھی نہیں ہوئی تھی اور ہاں پھر انکل بترا پہ پولیس کیس بنا تو انہوں نے بھی خودکشی کر لی۔''

''واقعی؟ یہ تو بہت عجیب کہانی ہے۔''

''سنو تو، ابھی ختم کہاں ہوئی؟ انکل بترا کے بعد آنٹی پاگل ہو گئیں، ان کے کاروبار پہ لوگوں نے قبضہ کر لیا اور جب یہ گھر بیچنے کی بات ہوئی تو آنٹی بھی غائب ہو گئیں۔

''اوہ! حیرت انگیز!!''

''آگے تو سنو! جو لوگ گھر خریدنے آئے تھے ان پہ ایک درخت کا موٹا سا ٹہنا گرا اور وہ گاڑی ہی میں پچک کر مر گئے۔''

''بس بھئی نازنین! یہ تو فلم ہو گئی۔''

''ہے نا فلمی؟ اور پھر یہ دونوں گھر ہانٹڈ مشہور ہو گئے۔ انکل بترا کے گھر میں پیپل اور برگد کے اتنے بڑے بڑے درخت اگ آئے اور انکل عرفان کا گھر بھی جنگل بن گیا۔''

اسرار تجسس میں اپنی جگہ سے اٹھا اور باغ کی دیوار کے ذرا قریب جا کے چاندنی میں خاموش کھڑے درختوں کے اس قطعے کو دیکھنے لگا۔

''اور وہاں اب کوئی بھی نہیں جاتا، سب کہتے ہیں وہاں بدروحیں رہتی ہیں۔''

اسرار ایک دم مڑا، اس کی نیلی آنکھیں بچوں کی سی شرارت میں چمکنے لگیں اور اس نے ایک دم نازنین کا بازو کہنی کے اوپر سے پکڑ لیا اور اسے اپنے قریب کر کے تیز سرگوشی میں بولا۔

''نازنین! وہاں چلیں؟''

نازنین ایک لمحے کو ٹھٹھکی پھر اس کی آنکھوں میں بھی اسرار کی آنکھوں کی سی چمک ابھری، نوعمری کی بے فکر، کھلنڈری، مہم جو چمک۔ وہ سب کچھ بھول بھال گئی۔ وہ سب بھوتیا قصے جو اس کی ماما، اپنی سہیلیوں کو ان دونوں گھروں کے بارے میں سناتی تھیں۔ انکل بترا کا سرکٹا بھوت، جسے اکثر لوگوں نے آدھی رات کے بعد سڑک پہ ٹہلتے دیکھا تھا اور وہ جل پری جسے پڑوس کے ڈرائیور بابا نے بھری دوپہر میں گرم سڑک پہ شہوت انگیز انداز میں مچلتے تڑپتے دیکھا تھا اور وہ پانچ بھوت جو احاطہ دیوار پہ قطار بنائے چلتے تھے اور بڑے ردھم سے عرفان صاحب کا پسندیدہ گانا، ''آئے گا، آئے گا، آئے گا، آنے والا'' گاتے تھے۔

اسے اب صرف اتنا یاد تھا کہ وہ اور اسرار سامنے والے بھوت گھر میں جانے والے تھے اور وہاں اگر کوئی غیر از معمول چیز نظر آ بھی جاتی تو اسرار جو ساتھ تھا جس کے بارے میں اسے یہ یقین ہو چلا تھا کہ وہ اسے دنیا کی ہر چیز سے بچا سکتا ہے۔

دونوں چوکیدار کو اونگھتا چھوڑ کر بڑی خاموشی سے باہر نکلے۔ سڑک پہ درختوں کے سایوں کے درمیان چاندنی کا موزائیک بن رہا تھا۔ دونوں مکانوں کی ڈھیتی ہوئی احاطہ دیواروں میں خودرو بیلیں اور پودے اگ آئے تھے۔ وہ عرفان صاحب کے مکان کے زنگ آلودہ گیٹ سے داخل ہوئے جو صرف بھڑا ہوا تھا۔ ہاتھ رکھتے ہی چرچوں کی بھیانک آواز سے کھل گیا۔

اندر قدم رکھتے ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ انہیں روشنی کا کوئی انتظام کر کے آنا چاہیے تھا۔ یہاں درختوں کی وہ بہتات تھی اور ان کی ٹہنیاں آپس میں اس طرح گتھ گئی تھیں کہ چاندنی کہیں اوپر ہی اوپر رہ گئی تھی۔ درختوں کے نیچے ٹھنڈک اور اندھیرا اور ہزاروں حشرات الارض کی سائیں سائیں اور جوہڑوں میں مچھلیوں اور مینڈکوں کے تیرنے کی ہلکی سی چھپ چھپ کی آواز تھی۔

آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو انہوں نے جھاڑیوں اور درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں میں ہزاروں آنکھیں دیکھیں، چمکتی ہوئی آنکھیں۔

نازنین نے خوفزدہ ہو کر اسرار کا بازو تھام لیا۔ اس کا دل نہایت تیزی سے دھڑکنے لگا اور اوپری ہونٹ کے بالائی حصے پہ پسینہ پھوٹ پڑا۔

''ڈرو نہیں۔ یہ چمگادڑیں ہیں، اور شاید بلیاں اور نیولے اور کتے، خرگوش، چوہے، پرندے بھی ہیں۔ ڈرو نہیں۔'' اسرار نے نازنین کے کان کی لو کے قریب سرگوشی کی۔

منظر مزید صاف ہوا تو انہیں لگا کہ جوہڑوں میں جیسے ہلکی ہلکی روشنی پڑ رہی ہے۔ شاید چاندنی کا کوئی زاویہ ایسا بن رہا تھا کہ جوہڑ روشن سے ہو گئے اور ان میں رنگ رنگ کی مچھلیاں اور کچھوے اور کیکڑے اور مینڈک تیرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ دونوں ایک حیرت کے عالم میں یہ سب دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ چند قدم چل کے ایک کھنڈر سا تھا جس پہ مختلف بیلوں نے اپنے پھول اور پتے پھیلا رکھے تھے۔ یہ شاہدہ کے گارڈن ہاؤس کا کھنڈر تھا۔

ایک بہت بڑا پختہ تالاب دراصل عرفان صاحب کے گھر کا تہہ خانہ تھا، جس میں اسرار نے ایک مگرمچھ کو تیرتے دیکھا۔ وہ واقعی مگرمچھ تھا اور اپنا منہ بند کیے ایسے تیر رہا تھا، جیسے کسی سوچ میں ڈوبا ٹہل رہا ہو۔

اسرار پچھتایا کہ وہ اتنی رات گئے نازنین کو لے کر یہاں کیوں آیا؟ واپسی کا راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ بترا صاحب کے مکان تک آ گئے۔ یہاں برگد کے بڑے بڑے جٹادھاری درخت تھے اور ان کے درمیان دیواروں کی اینٹیں جیسے اجنبی لوگوں کی طرح کھڑی تھیں۔ کھڑکیاں دروازے سب نابود ہو چکے تھے۔ شطرنجی فرش چاندنی میں چمک رہا تھا، جیسے کوئی اسے صاف کرتا رہا ہو۔

ایک شکستہ کمرے کے آتشدان سے پیپل پھوٹا تھا اور آتشدان کے کارنس کو پھاڑ کے خوب پھیل گیا تھا۔ یہاں آ کے اسرار کو اندازہ ہوا کہ وہ لوگ راستہ بھول گئے ہیں۔ لیکن وہ نازنین کے سامنے یہ بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کے پہلو سے چپکی پتے کی طرح کانپ رہی تھی اور اس کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ اسرار کو لگ رہا تھا کہ نازنین کی بجائے یہ دل اس کے سینے میں دھڑک رہا ہے۔

چند شکستہ سیڑھیاں چڑھ کے وہ برگد کی شاخوں اور جڑوں میں الجھے ایک ایسے چبوترے پہ پہنچے جہاں ایک مورتی رکھی تھی۔ مورتی کے عین اوپر چھت میں ایک گول سوراخ تھا اور وہاں سے چاندنی سپاٹ لائٹ کی طرح مورتی پہ پڑ رہی تھی۔ ناک کٹی مورتی بڑے پراسرار انداز میں مسکرا رہی تھی۔

اب نازنین کا ضبط جواب دے گیا اور وہ زور سے اسرار سے لپٹ گئی۔ منہ سے نکلتی بے ساختہ چیخوں کو گھونٹنے کے لیے اس نے اسرار کے کندھے میں دانت گاڑ دیے۔ کندھوں میں دانت گاڑ دیے

خوف کے مارے اسرار کا سارا جسم پتھر کے تودے کی طرح بے جان ہو گیا۔

اسے بس اتنا یاد تھا کہ وہ نازنین کو قریباً گھسیٹتے ہوئے بڑ کی جڑوں سے الجھتے، بیلوں کو پرے ہٹاتے دیوار میں بنے ایک بڑے سے سوراخ سے باہر نکلا تو ان درختوں سے ہزاروں پرندے بھرّ امار کے اڑے اور چاندنی میں ان کے پروں کے رنگ آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہے تھے اور ان کی آنکھیں ہیرے کی کنی کی طرح چمک رہی تھیں اور ان کی چونچوں کی دمک پہ کسی دھات کا دھوکا ہوتا تھا اور وہ ہر نوع کے تھے، ہرے، لال، نیلے، پیلے، شتری قرمزی، عنابی، ڈھڈ ہے گلابی، نارنجی، زمردی، ہر رنگ کے اور وہ بڑے بھی تھے اور چھوٹے بھی۔ ایک شکر خورا جو فقط چند انچ لمبا ہو گا۔ اتنا نیچے آ گیا کہ اسرار کے کندھے سے بہتے خون کو اپنی چمکیلی چونچ میں بھر کے پھر اوپر اڑ گیا اور پھر چاند کی روشنی میں وہ اتنا اونچے اڑے کہ نظروں سے اوجھل ہو گئے اور وہ دونوں ہکا بکا، سڑک پر کھڑے رہ گئے۔ اس دن کے بعد نازنین کبھی یونیورسٹی نہیں آئی۔ اسرار نے جب بھی فون کیا اس کی ماما نے اٹھایا اور ہر بار بہت رکھائی سے جواب دیا کہ نازنین سو رہی ہے۔

''آخر کوئی کتنا سو سکتا ہے؟'' اسرار نے سوچا اس کے کندھے پہ جہاں نازنین نے اپنی چیخیں روکنے کے لیے دانت گڑوئے تھے، تین نشان بن گئے تھے۔ اوپر دو گہرے اور نیچے ایک ذرا ہلکا نشان۔

اب ان نشانوں پہ کھرنڈ سا آ گیا تھا لیکن چھیڑنے پہ اب بھی میٹھا میٹھا درد ہوتا تھا۔ وہ رات ایک الف لیلوی یاد بن کے اس کے حواس پہ طاری ہو گئی تھی۔ دن بھر وہ یونیورسٹی کے لانز میں کسی بنچ پہ گم صم بیٹھا اس رات کو یاد کرتا اور ہر بار اسے لگتا کہ یہ جھوٹ تھا۔ کسی قسم کا کوئی شعبدہ یا نظر بندی۔ پھر اسے نازنین کا خیال آتا۔ اس نے بھی تو وہ سب دیکھا تھا۔ آخر اس کے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا کہ اسے اب نہ یونیورسٹی آنے کی اجازت تھی اور نہ ہی اسے کسی سے ملنے دیا جا رہا تھا۔ اسرار کے علاوہ اور بھی بہت سے لڑکے لڑکیوں نے نازنین سے ملنے کی کوشش کی لیکن کسی کو بھی کامیابی نہ ہوئی۔

شام ہوتے ہی وہ ہاسٹل کا رخ کرتا اور اسی طرح سر منہ لپیٹ کے پھر پڑ جاتا۔ کئی مہینے ایسے گزر گئے۔ گاؤں سے خط آتا تو وہ جواب میں لکھ بھیجتا کہ نامی گرامی وکیلوں سے ٹیوشن پڑھ رہا ہے اس لیے گھر نہیں آ سکتا۔

پھر ایک دم سب نے دیکھا کہ اس نے میوزک سوسائٹی میں جانا شروع کر دیا اور دنوں ہی دنوں میں اس کا حلیہ بدل گیا۔ گیروے رنگ کے کرتے، لمبے بال، گلے میں تعویذ، اس کی آواز بہت خوبصورت تھی، گو اس نے باقاعدہ سیکھا نہ تھا لیکن جب گاتا تو سب خاموش ہو کے سننے لگتے۔ وہ بہت ہی رقت انگیز قسم کے گانے گاتا تھا۔ ہوتے ہوتے پوری یونیورسٹی میں مشہور ہو گیا کہ اسرار اور نازنین کی بات بگڑ گئی ہے اور اس غم میں اسرار نے جوگ لے لیا ہے۔ یونیورسٹی میں پڑھنے والے بچے نہ جوگ کا مفہوم جانتے ہیں نہ انہیں کسی کی بن کے بگڑنے اور لگی ہوئی ٹوٹنے پہ کبھی حال آتا ہے۔ یہ عمر تو بس ہنسنے اور بے وجہ ہنستے رہنے کی ہوتی ہے۔

ایک دن اسرار اسی طرح بال جھلاتا، دیوانہ بنا نازنین کے گھر پہنچ گیا۔ شاید کوئی تقریب تھی۔ پورا گھر بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ باریک برقی قمقمے جنھیں "پریوں کی روشنی" کہا جاتا ہے پورے گھر پہ روپہلی جال کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ گلاب اور گیندے کی لڑیاں بیرونی دیواروں تک پہ سجی ہوئی تھیں۔ پوری گلی خوشبو کے جھونکوں سے طبلۂ عطار بنی ہوئی تھی۔ لیکن سامنے والی دونوں جڑواں کوٹھیوں پہ وہی وحشت چھائی ہوئی تھی ان کے درخت اسی بدتمیزی سے سینہ تانے آس پاس کے گھروں میں تانک جھانک کر رہے تھے۔

اسرار نے جنگل کی طرف نظر بھر کے بھی نہ دیکھا اور نازنین کے گھر کے باہر گاڑی لگا کے اس وقت تک بیٹھا رہا جب تک آخری مہمان بھی رخصت نہ ہو جائے اس وقت تک چاند آسمان کے بالکل بیچوں بیچ آ چکا تھا اور اس کی کرنیں ایک پاگل کر دینے والی بے ساختگی سے ہر کونے کھدرے میں گھسی جا رہی تھیں۔

چوکیدار نے ابھی گیٹ کا کھٹکا نہیں لگایا تھا یا شاید اسے جان بوجھ کر کھلا رکھا گیا تھا۔ بہر حال اسرار بڑے آرام سے گھر میں داخل ہو گیا۔ لان میں ابھی تقریب کے لیے ایستادہ کیا گیا خیمہ جسے اب سب "مرکی" کہنے پہ مصر تھے لگا ہوا تھا۔ گول میزیں اور ان کے چاروں طرف رکھی کرسیاں گو ذرا بے ترتیب ہو گئی تھیں لیکن خیمے کی چھت سے ہر میز پہ لگائے گئے گیند نما گلدستے جوں کے توں معلق تھے۔ لکڑی کا فرش جو خیمے کے دروازے سے لے کر آخری کونے تک پھیلا ہوا تھا خیمے میں جلتی بجھتی روشنیوں میں چمک رہا تھا۔ فرش پہ سٹیج تک جانے کے لیے جو چوبی راستہ بنا ہوا تھا اس پر بھی "پریوں کی روشنیوں" سے حاشیہ بنایا ہوا تھا۔

سامنے اسٹیج پہ گیندے کی لڑیوں سے آراستہ جھولے پہ حسب توقع نازنین بیٹھی تھی، اکیلی، تنہا اور منتظر۔

اسرار خاموشی سے جا کے اس کے پاس فرش پہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔ ہوا میں مرغن کھانوں اور پھولوں اور ولائتی عطر کی خوشبو ٹھہری ہوئی تھی۔ نازنین نے کسی عجیب سے کپڑے کا لمبا سا روپہلی لہنگا اور اونچی چولی پہنی ہوئی تھی۔ جس میں سے اس کے مرمریں پیٹ کا کچھ حصہ عیاں تھا اور سر پہ جالی کا کامدار دوپٹہ ٹکا ہوا تھا۔ کانوں میں موتیے کے بڑے بڑے بالے تھے۔ ماتھے پہ پھولوں کی سراسری، بازوؤں میں گجرے اور گلے میں موتیے کا موٹا سا

سکتا۔ اس کی آنکھیں جو پہلے ہی کھوئی کھوئی، موتی گئی، راستہ بھلا دینے والی تھیں، اس وقت کا جل کے کرشمے سے مزید قاتل اور نشیلی ہو رہی تھیں۔

اسرار نے نظر بھر کے اسے دیکھا اور پھر نظر جھکا کے اس کے لہنگے کے بارڈر پہ لگے نگوں کو گھورنے لگا۔ جیسے اس کے سب سوالوں کا جواب ان نگوں میں بند ہے۔ ذرا دیر دونوں خاموش رہے پھر نازنین بے تعلق سے لہجے میں بولی۔

"دوبارہ آئے نہیں تم۔"

اسرار نے نظر اٹھا کے دیکھا چولی پہ ٹنکے ستارے جھلملا رہے تھے لیکن اس کی آنکھیں بجھی بجھی تھیں۔

"تمہاری شادی ہو رہی ہے؟"

جب وہ بولا تو اس کی آواز خود اسے اوپری سی لگی۔ جیسے اس کی جگہ پہ کوئی اور ہو۔ کون کوئی اور؟ شاید عرفان صاحب؟ لیکن عرفان صاحب کیوں؟ اس نے مزید الجھ کر سوچا۔ ایک آدمی جو بہت سے پراسرار واقعات میں ملوث تھا، اسے خود پہ اس کا دھوکا کیوں ہو رہا تھا؟

"سب کا خیال ہے مجھ پہ اثر ہو گیا ہے۔ ماما کو بس اتنا پتا ہے کہ میں سامنے گئی تھی، اتنا معلوم ہوتے ہی وہ گھبرا گئیں اور فوراً میری شادی کا فیصلہ کر لیا۔" نازنین گہرا سانس لے کے جھولے پہ ایک طرف کو کھسک گئی۔

"آؤ یہاں بیٹھ جاؤ۔" اس نے اسرار کو بلایا۔ نازنین کے پاس بیٹھتے ہی اسرار کو لگا وہ عجیب خوشبوؤں کے حصار میں آ گیا ہے۔ ابٹن کی ہلکی ہلکی خوشبو، مہندی اور ولایتی سینٹ اور موتیے کی دماغ کو مفلوج کر دینے والی خوشبو اور ان سب خوشبوؤں سے بالا، نازنین کے اپنے جسم کی خوشبو، بارش کے پانی کی سوندھی خوشبو۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر نازنین نے جیسے سرگوشی سی کی۔

"تمہیں وہ پرندے یاد ہیں جو اس روز درختوں سے اڑے۔"

"ہاں! یاد ہیں۔"

"وہ کتنے تھے؟"

"شاید چند سو، یا پھر ہزار۔"

"نہیں۔" نازنین نے نفی میں سر ہلایا۔

"ہزاروں نہیں وہ لاکھوں تھے اسرار، لاکھوں رنگین پرندے، جو میں نے اس روز سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے اور وہ مگر مچھ۔" وہ بولی تو منٹ کی خوشبو کا باسی بھپکا سا آیا۔

"لاکھوں؟ مگر لاکھوں پرندے ان چند درختوں پہ کیسے رہ سکتے ہیں؟"

"ہاں نا، اور پرندے بھی وہ کیسے عجیب عجیب تھے۔ میں نے اتنے رنگ اکٹھے کبھی نہیں دیکھے، وہ کیا تھا اسرار؟"

"پتا نہیں، مگر کیا تم دوبارہ اس طرف گئیں؟"

"نہیں، میں وہاں سے آنے کے بعد بیمار ہو گئی تھی، مجھے بہت تیز ٹمپریچر رہا، دو ماہ تک، ڈاکٹروں کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ سب ٹیسٹ بھی کلیئر تھے پھر ایک دن......" اس نے گہرا سانس لیا اور بازو اٹھا کے سر پہ ٹکے جالی کے دوپٹے کو ذرا سا کھسکایا۔

"ایک دن میں نے لان میں ایک درخت کے تنے پہ اسے دیکھا۔"

"کسے؟" اسرار گھبرا کے بولا۔

"اسی مگرمچھ کو۔" وہ بالکل سرگوشی میں بولی حالانکہ سارا پنڈال خالی پڑا تھا۔ جانے سب لوگ دلہن کو یہاں اکیلا چھوڑ کے کہاں چلے گئے تھے۔

"مگرمچھ؟ نہیں نازنین، وہ گوہ ہو گی، تمہیں دور سے مگرمچھ لگا ہو گا۔"

"نہیں وہ وہی تھا۔ اسی طرح موٹی سی کھال، مجھے مگرمچھ کی پہچان ہے، ماما کے پاس اس کی کھال کا والٹ ہے، وہ تھائی لینڈ سے لائی تھیں، وہاں مگرمچھوں کو پال کے ان کی کھال، پرس اور جوتے وغیرہ بنانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔"

"اچھا تو، وہ وہی مگرمچھ تھا؟" اسرار کو تھائی لینڈ کی برآمدات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن اسے حیرت ہو رہی تھی کہ جن مخلوقات کو وہ اپنی نظر کا دھوکا سمجھ رہا تھا وہ واقعی تھیں۔ ایسے ہی جیسے کسی بھی آبادی میں کسی متروکہ مکان کے کھنڈر میں آ کے بسنے والے جانور، نیولے، چھپکلیاں اور گرگٹ، جو کبھی کبھار دوسرے گھروں میں بھی نکل آتے ہیں تو کیا مگرمچھ اسی طرح ٹہلتا ہوا یہاں نکل آیا تھا؟

"ہاں! اور اسے دیکھ کے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں ٹھیک ہو گئی، میرا بخار اتر گیا اور رات کو نیند بھی ٹھیک سے آنے لگی۔"

اسرار کو حیرت ہوئی۔ مگرمچھ کو اپنے باغ میں دیکھ کے اسے خوشی کیوں ہوئی؟

"دیکھو نا اسرار، اگر کسی انسان کو یہ لگنے لگے کہ وہ پاگل ہو چکا ہے اور اس نے ایک پوری رات جو کچھ دیکھا وہ اصل میں تھا ہی نہیں تو وہ کتنا اپ سیٹ ہو گا، ہے نا؟"

"ہاں! مگر نازنین وہ مگرمچھ پھر گیا کہاں؟"

"وہیں، واپس چلا گیا ہو گا۔" اس نے کندھے اچکائے "یعنی اس وقت تمہارے پڑوس میں ایک مگرمچھ رہ رہا ہے۔"

"بات سنو اسرار" وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور اسرار کو یوں لگا۔ آسمانی بجلی کا ایک کوڑا سا ہوا میں لہرایا ہو۔ روپہلی لباس جیسے اس کے جسم پہ رکھ کر سیا گیا تھا اور اس کے بازوؤں پہ کہنیوں تک جو مہندی لگائی گئی تھی، اس کے باریک باریک بیل بوٹوں کے درمیان سے ہاتھی دانت جیسی جلد اتنی بے ایمانی سے چمک رہی تھی کہ اسرار کی آنکھوں کے آگے ترمرے سے ناچ گئے۔

"میرے پڑوس میں جا ہے، میمتھ رہے، چاہے ڈائنوسار، میں اب کسی چیز کی کھوج نہیں کروں گی، پچھلے چند مہینوں میں، میں جس عذاب سے گزری ہوئی میں ہی جانتی ہوں اور مجھے اس محاورے کا مطلب اچھی طرح سمجھ آ گیا ہے کہ Curiosity ever kills a cat۔

مجھے اس رات وہاں نہیں جانا چاہیے تھا اور اسرار۔"

وہ سانس لینے کو رکی اور پھر جانے کس خیال کے تحت جھکی اور اسرار کے گریبان کے سب بٹن کھول ڈالے اور اس کا کرتا ایک طرف کو کندھے پر یوں کھینچا کہ اس کا داہنا شانہ عریاں ہو گیا۔ دانتوں کے نشان اب بھی وہیں تھے۔ نازنین نے مہندی کے نقش و نگار سے مزین، خوشبو میں مغرق، اپنی مخروطی انگلی، جس کے سرے پہ گلابی ناخن، مرجان کی طرح چمک رہا تھا اس زخم پہ پھیری "اور یہ، یہ دیکھو اسرار، میں نے اس دن انسانی خون چکھا اور....." نازنین نے گھبرا کے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور بے دھیانی میں اپنی سرخ زبان دانتوں پر پھیری۔

"اور اسرار، یہ سب ٹھیک نہیں، میری چھٹی حس نے کہا، یہ سب غلط ہے۔ وہ سب باتیں، جن کے بارے میں ہمیں معلوم نہیں ہوتا، وہ سب جگہیں جو ہمیں پر اسرار لگتی ہیں اور وہ مخلوقات، جن سے ہمیں ڈر لگتا ہے، ہمیں ان سے ڈر جانا چاہیے اور دور رہنا چاہیے، اور اسرار....." وہ اسرار کے سامنے دو زانو بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پہ پسینے کے ننھے ننھے قطرے سے نمودار ہو رہے تھے اور جانے ایک دم موتیے کی خوشبو حواس پہ یلغار سی کیوں کرنے لگی تھی۔

"اور اسرار! مجھے تم سے بہت ڈر لگتا ہے۔ تمہاری آنکھیں نیلی ہیں۔" اس کی آواز میں دہشت تھی۔

"ہاں میری آنکھیں نیلی ہیں، تو اس میں ڈرنے کی کیا بات ہوئی نازنین۔" وہ نرمی سے بولا۔

"اور تمہارے گھر میں کسی اور کی آنکھیں نیلی نہیں؟ ہے نا؟"

"ہاں، میرے گھر میں کیا، ہمارے پورے علاقے میں کسی کی بھی آنکھیں نیلی نہیں، ہاں کمو تائین جس نے مجھے پالا تھا، اس کی آنکھیں سبز ہیں۔"

"ہاں تو اسرار، کبھی سوچا کہ تمہاری آنکھیں نیلی کیوں ہیں؟"

اسرار اس بات پہ مسکرایا اور نازنین کے گجرے سے جھڑنے والی پتیوں کو اپنے گھٹنے سے چنتے ہوئے بولا۔

"میوٹیشن، اس دن تم ہی نے تو کہا تھا۔"

"نہیں اسرار! میوٹیشن پہ غور کرو، میوٹینٹس اچھے لوگ نہیں ہوتے، وہ مختلف ہوتے ہیں.....اور.....اور....." کسی انجانی دہشت سے اس کے ہونٹ کپکپائے۔

"اور وہ چاہتے ہیں کہ یہ دنیا، ہماری دنیا یہ سب کچھ تباہ ہو جائے اور دنیا ویسی ہو جائے جس میں وہ رہ سکیں، پھل پھول سکیں، اپنی نسل آگے بڑھا سکیں۔"

اسرار نے بڑی سنجیدگی سے نازنین کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دہشت تھی۔ اسرار نے اس کا ماتھا چھوا جو برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا نازنین؟''
''پلیز اسرار! مجھے بچوں اور پاگلوں کی طرح ٹریٹ نہ کرو۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ تمام لوگ جو عام انسانوں سے مختلف ہوتے ہیں خطرناک اور خودغرض ہوتے ہیں ان سے دور رہنا چاہیے اور، ممکن ہو تو ان کو مار دینا چاہیے، جیسے سب دنیا کرتی ہے، بڑے لیڈرز، صوفی، اولیاء، جن سب کو مارا گیا وہ میوٹینٹس تھے، وہ چاہتے تھے دنیا ویسی ہو جائے جیسی ان کو چاہیے۔ مگر اسرار کیا، وہ دنیا کروڑوں عام انسانوں کی دنیا ہوگی؟ اچھائی، نیکی، رواداری، صبر، قناعت، کیا پوری دنیا ان باتوں پر چلنا چاہتی ہے، نو! بالکل نہیں اور پھر میوٹینٹس کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ انقلاب، ماردو، خود سے مختلف سب لوگوں کو مار ڈالو۔''
''خدا کے لیے نازنین! صرف اس لیے کہ میری آنکھیں نیلی ہیں، تم نے اتنی بہت سی باتیں گھڑ لیں؟''
''گھڑی نہیں اسرار! یہ سچ ہیں، یاد کرو، ہم نے پڑھا تھا کہ پرانے رومن، ایبنارمل بچوں کو مار دیا کرتے تھے۔ کیوں؟ کیونکہ وہ جانتے تھے، ایب نارمل کچھ نہیں ہوتا، یہ میوٹینٹس ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دنیا ان کے رہنے کے لیے ان کے قابل بن جائے، باقی لوگ جو اس پرانی دنیا کے رہنے والے ہیں، جن کی کامیابی کی بنیاد، جھوٹ، چالاکی، مار پیٹ، دھوکا دہی اور عیاری پہ ہے، وہ، وہ سب اس دنیا میں کیسے رہ سکتے ہیں؟'' نازنین کی آنکھیں کسی دہشت میں پوری کھلی ہوئی تھیں اور اس کا جسم ہلکے ہلکے لرز رہا تھا۔ یقیناً وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، جو کچھ وہ سوچ اور سمجھ رہی تھی، اس سب کو الفاظ کا جامہ پہنانا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔

اسرار نے جھک کے اس کے ہاتھوں کو دیکھا، مہندی کے گنجلک نقش و نگار کو دیکھ کر اسے لگا کہ وہ عرفان صاحب کے گھر کے جنگل میں اگی بیلوں میں الجھ گیا ہو۔ اس نے گھبرا کے نظر ہٹائی۔ نازنین اسے ہی دیکھ رہی تھی۔
''سمجھے اسرار؟ میں تم سے خوفزدہ ہو گئی ہوں، نہ صرف تم سے بلکہ ایسے تمام لوگوں سے جو عام لوگوں سے مختلف ہیں۔ جن کی زندگی میں عجیب واقعات گزرے، یا جن کی سوچیں عام لوگوں سے مختلف ہیں، جن کے بالوں کے رنگ، آنکھیں، کان، انگلیوں کی ترتیب، توازن اور رنگ میں ہم سے فرق ہیں ایسے سب لوگ تباہی لاتے ہیں۔ یقیناً انکل عرفان بھی عام آدمی نہیں تھے، ان کے ساتھ نے، ان کی موجودگی نے بے شمار انسانوں کو مار ڈالا، دو گھر تباہ کر دیے اور اگر وہ اس روز آگ میں جل کر نہ مرے ہوئے تو وہ مزید تباہی لائیں گے۔ جہاں بھی ہوں گے وہیں بربادی آئے گی۔''

اس نے گہرا سانس لیا اور اسرار سے نظریں چرا کے مرکی کی چھت سے لٹکتے فانوس کو دیکھنے لگی اور جب دوبارہ بولی تو اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔
''میرا ہونے والا شوہر ایک بزنس مین ہے بہت عام، پانچ فٹ دو انچ قد، سادہ بال، سادہ چہرہ، عام آواز، عام سی ذہانت، اس نے کبھی کسی مشکل بات پر غور نہیں کیا، اسے کبھی آسمان پہ ایک ساتھ لاکھوں پرندے اڑتے نظر نہیں آئے، اور میں چاہتی ہوں جلد از جلد کل کا دن آئے اور میں اس منحوس پڑوس سے دور چلی جاؤں۔ اس کے

پارک لین والے فلیٹ میں، جہاں کوئی برگد کا درخت ہو، نا کسی تہہ خانے سے نکلا ہو گر مچھ اور نہ ہی کوئی باؤ اسرار ہو۔''

نازنین نے جھلملاتی آنکھوں سے اسرار کو دیکھا۔ اسرار خاموش تھا۔ اسے نازنین کی صرف ایک بات سمجھ آئی تھی اور وہ یہ کہ باوجود اس کے کہ وہ ایک عام سا انسان تھا، لیکن نازنین نے عورتوں میں پائی جانے والی حد سے بڑھی ہوئی چھٹی حس کے تحت یہ معلوم کر لیا تھا کہ وہ عام آدمی نہیں ہے اور وہ اس سے دور ہونا چاہتی تھی۔

ٹھیک ہے، یہ اس کی زندگی تھی، اسے حق حاصل تھا کہ وہ جس کے ساتھ مرضی گزارے، لیکن اسرار کو اس پہ خواہ مخواہ غصہ آ رہا تھا۔

سامنے والے مکان کا قصہ بھی تو اسی نے شروع کیا تھا اور وہاں جانے کے لیے بھلا اسرار نے اس کے ہاتھ پاؤں جوڑے تھے؟ ایک بار ہلکا سا کہا تھا نا۔ منع کر دیتی اور اگر وہاں کچھ محیر العقول مناظر دیکھ بھی لیے تھے تو اس میں اسرار کا کیا قصور؟

وہ دل ہی دل میں نازنین سے ناراض ہو گیا۔ ہاں بھئی ایک امیر، عقل کے اندھے انگلستان میں رہنے والے کامیاب تاجر کے سامنے، چند ایکڑ زمین کے مالک اسرار کی کیا حیثیت تھی؟ لیکن اس طرح، اسی کو مطعون کر کے، اسی پہ الزام دھر کے اور ایک عجیب سی تاویل گھڑ کے وہ اسرار کو یوں بیچ راستے میں نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

''نازنین! تم نے عقلمندی کا فیصلہ کیا، لیکن باقی جو سب کچھ بھی تم کہہ رہی ہو، مجھے سمجھ نہیں آ رہا، ہاں تمہاری باتوں سے ایک بات یاد آئی ہے۔''

''کہو! کیا بات ہے؟''

''جب میں بہت چھوٹا تھا۔ اتنا چھوٹا کہ دودھ پیتا تھا اور میرے دانت بھی نہ نکلے تھے۔'' دانتوں کے ذکر پہ اسرار کو اپنے شانے پہ نازنین کے کاٹے کا دھیان آیا اور جانے کیوں اسے جھرجھری سی آئی۔ اسے لگا وہ اور نازنین دو بالکل فرق دنیاؤں کے باسی ہوں اور اس روز وہ بھولے سے نازنین کو اپنی دنیا میں لے گیا ہو جہاں جا کے نازنین کو یہ دھیان آیا ہو کہ اگر وہ جلد از جلد یہاں سے نہ بھاگی تو وہ بھی اس دنیا کا حصہ بن جائے گی اور خود کو اس طلسم سے محفوظ کرنے کے لیے اس نے اسرار کو کاٹ کھایا۔ اسی طرح جیسے کوئی بلی یا کتا اپنے حملہ آور سے خود کو محفوظ کرنے کے لیے اسے کاٹ لیتا ہے کیونکہ اس کے پاس دانتوں اور ناخنوں کے سوا کوئی ہتھیار نہیں ہوتا۔

''ہاں تو پھر کیا ہوا؟ جب تم بہت چھوٹے تھے اور تمہارے دانت بھی نہ نکلے تھے۔''

''ہاں، تب کی ایک بات اماں شاماں سناتی ہے، کہ ابا جی نے ایک جوگی کو اس علاقے سے بے دخل کرنے کی کوشش کی جس پہ وہ قابض ہو کے بیٹھا تھا تو بڑی آفتیں آئیں، مینڈے آدم خور ہو گئے اور چوہوں نے سانپوں کا تعاقب شروع کر دیا پھر ایک زور کا زلزلہ آیا اور زمین پھٹ گئی پھر دوسرے جھٹکے سے زمین برابر ہو گئی۔ وہ جوگی آج بھی اسی جگہ بیٹھا ہے۔''

''ان ہی باتوں سے مجھے خوف آتا ہے اسرار، تمہاری دنیا میں جوگی ہیں، سانپ اور آسمان پہ اڑتے ہزاروں،

نہیں لاکھوں نایاب پرندے اور یہ دنیا میری دنیا کو کھا جائے گی، ہم سب کو تباہ کر دے گی۔'' نازنین تھک کے جھولے کے پائے سے ٹیک لگا کے بیٹھ گئی۔

''مگر نازنین، وہ بات تو تم نے خود چھیڑی تھی اور یہ جنگل تمہارے گھر کے پاس ہے، یہ میری دنیا کیسے ہو گیا؟''

نازنین کے چہرے پہ ایک تھکی تھکی مسکراہٹ ابھری اور اس نے اسرار کو بازو سے پکڑ کے اپنے برابر گھسیٹ لیا اور اپنا چہرہ اس کے چہرے کے بالکل مقابل لا کے انکشاف کرنے کے انداز میں بولی۔

''ہاں اسرار وہ تمہاری دنیا ہے کیونکہ میں اس روز سے پہلے کئی مرتبہ وہاں جا چکی ہوں، اور وہاں مجھے وہ سب کچھ کبھی بھی نظر نہیں آیا جو تمہارے ساتھ جانے پہ نظر آیا۔'' اسرار نے جھک کر نازنین کی آنکھوں میں جھانکا جو اتنے قریب ہونے پہ دو ایسے سمندروں کی مانند نظر آ رہی تھیں، جہاں سورج ڈھل رہا ہو اور اس ڈھلتی دھوپ میں ساحل پہ پڑے ریت کے ذرے اور سیپیاں چمک رہے ہوں۔

''یعنی وہ ہزاروں جانور، جن کی چمکتی آنکھیں ہم نے دیکھی تھیں اور وہ مچھلیاں اور وہ پرندے، وہ سب تمہیں پہلے کبھی نظر نہیں آئے تھے؟''

''نہیں اسرار! وہ سب تمہاری وجہ سے تھا اور میں دوبارہ کسی ایسے بھیانک تجربے کا حصہ نہیں بننا چاہتی خدا حافظ!!'' نازنین نے اسے ہلکا سا دھکا دیا اور اٹھ کے کھڑی ہو گئی۔ اسرار وہیں بیٹھا اسے لکڑی سے بنے راستے پہ جس کے دونوں طرف ''پریوں کی روشنیاں'' جگمگا رہی تھیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ روپہلی جالی نما کپڑے کا لہنگا فرش پر گھسٹ رہا تھا اور کمر پہ چولی کی ڈوریاں مرمریں پشت میں گڑی جا رہی تھیں اور اس ہر قدم پہ جو اسے اس سے دور لے جا رہا تھا، اس کے گجروں سے پھولوں کی پتیاں جھڑتی جا رہی تھیں۔ یہاں تک کہ جب وہ پنڈال کے آخری سرے پہ پہنچی تو اس کے گلے کا کنٹھا، کانوں کے بالے، ماتھے کی سراسری، چٹلا اور بازوؤں کے گجرے مکمل طور پہ پھولوں سے محروم ہو چکے تھے وہ بغیر رکے یا پیچھے دیکھے اسی طرح بقیہ لان عبور کر کے کوٹھی میں غائب ہو گئی اور اس دن کے بعد باؤ اسرار نے اسے دوبارہ کبھی نہ دیکھا، ساری زندگی، اور جب دیکھا تو زندگی رہ ہی کتنی گئی تھی؟

میاں اللہ یار کے ڈیرے میں رونقیں لگی ہوئی تھیں۔ پلاؤ زردے کی اشتہا انگیز خوشبو ساری فضا پہ چھائی ہوئی تھی۔ گاؤں اور شاملات دیہہ کے کئی دوسرے گاؤں سے معززین، سفید پگڑیاں باندھے کلف لگے شلوار قمیض ڈانٹے، موڑھوں پہ تنے بیٹھے تھے۔ مونچھیں مروڑی جا رہی تھیں۔ بھنوئیں اچکائی جا رہی تھیں اور بآواز بلند کی جانے والی باتوں کے ساتھ ساتھ ایک سرگوشی بھی سارے میں جولائی کی دھوپ کی طرح پھیل رہی تھی۔ ''باؤ اسرار بچا کیسے؟''

میاں اللہ یار کے ساتھ دوسرے موڑھے پہ اونچے طرّے والا پگڑ باندھے، شلوار قمیض پہنے یہ باؤ اسرار، وہ اسرار تو نہیں تھا جو فقط دو روز پہلے گاڑی سے نکلا تھا تو اس پہ کسی پٹے ہوئے میراثی کا گمان ہوتا تھا۔ بکائن اور نیم کی گھنی چھاؤں میں ڈھلتی دوپہر کی دھوپ مدھم پڑ رہی تھی اور پیڈسٹل فین جو ہوا پھینک رہے تھے اس میں ایک عجیب سی کیفیت تھی، جسے کوئی نام تو نہیں دیا جا سکتا تھا، لیکن صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ جلد ہی بارش ہونے والی ہے۔ ڈیرے کی دیوار کے ساتھ ساتھ کئی دیگیں دم پہ رکھی ہوئی تھیں۔

کمو نائین اپنے مہندی لگے لال بال چُنی میں چھپائے بڑی مستعدی سے اندر باہر بھاگی پھر رہی تھی۔ گو اندر، جنت بی بی، شاماں، میاں اللہ یار کی دوسری بہوؤں اور چند ملازماؤں کے سوا کوئی اور نہ تھا لیکن کمو کی دوڑ بھاگ سے باہر کی دعوتی فضا گھر کے اندر بھی چلی آئی تھی۔

شاید اسی لیے شاماں نے اپنا زہر موہرے رنگ کا گوٹے کے کام کا جوڑا نکال کے پہن لیا تھا۔ شلوار اور دوپٹے پہ ماہی جال تھا اور قمیض پہ گوٹے کے گول گول ٹھپے ٹنکے ہوئے تھے۔ دنداسے سے رنگے ہونٹ اور بڑی بڑی آنکھوں میں چھلکتا کاجل، شاماں آج بھی ایسی تھی کہ میاں اللہ یار اگر بھولے سے ایک نظر ڈال بیٹھتے تو گھنٹوں مینے کو کوستے، ''گھنا، ماں کا یار'' اور پھر بھی دل نہ بھرتا تو جنت بی بی کو اتنی گندی گالیاں دیتے کہ آخر کار خود ہی شرما جاتے۔ شاماں نے وقت کو پچھاڑ دیا تھا اور روز بروز جوان تر ہوتی جا رہی تھی۔

آج وہ یوں بھی بہت خوش تھی، اسرار، جسے وہ اپنی اولاد ہی کی طرح چاہتی تھی زندہ بچ گیا تھا۔ جس رات وہ اپنے گھر سے بھاگی تھی، اس نے کچھ بھی نہ سوچا تھا۔ وہ صرف شادی کرنا چاہتی تھی۔ ایک ضد تھی اور اسی ضد کے تحت

وہ اپنے گھر سے نکلی، ذخیرے میں سے ہوتی ہوئی میاں اللہ یار کے ڈیرے پہ آئی اور صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ میاں اللہ یار اس بات پہ خوفزدہ تو تھا لیکن اس کے تاثرات سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ بہت خوش ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی شادی شاماں سے ہو جائے۔

تب جنت بی بی نے اس سے پوچھا کہ آخر وہ یہ سب کیوں چاہتی ہے؟ شاماں نے اسے بتایا کہ وہ چاہتی ہے کہ اس کی اولاد ہو۔ بس، اس کے علاوہ اس کی کوئی خواہش نہیں۔ اگر وہ کسی جوان پٹھے کے ساتھ بھاگتی تو دنیا یہ ہی کہتی کہ کیسی بدکردار عورت ہے۔ اب لوگ بات کرتے ہوئے بھی ہزار بار سوچیں گے اور وہ آدمی جس کے چھ لڑکے ہوں، یقیناً اس عمر میں بھی اور اولاد پیدا کر سکتا تھا۔

یہ سن کر جنت بی بی ذرا دیر خاموش رہی پھر گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے اٹھتے ہوئے بولی، ''لے بی بی اگر تیری یہ ہی خواہش ہے تو پھر تو میئے سے شادی کر لے'' شاماں بہت سیانی تو نہ تھی لیکن اسے اتنی سمجھ ضرور تھی کہ جنت بی بی کی بات مان لے۔ جنت بی بی جیسے لوگ جھوٹ نہیں بولتے۔ اس لیے کہ دنیا ان کے سچ کے باوجود ان کی مطیع اور فرمانبردار رہتی ہے۔ جھوٹ تو غریب گھروں کی مجبور عورتیں بولتی ہیں جن کا کوئی بس نہیں چلتا۔ چنانچہ اس نے میئے سے شادی کر لی۔ مگر اس کے نصیب میں اولاد نہ تھی۔

فضل بی بی کے بعد جب اسرار اسیر ہو گیا تو شاماں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ لیکن اس بے چارے کو بکری کا دودھ نہ تو موافق تھا اور نہ ہی اس کا پیٹ بھرتا تھا پھر ایک روز جب شاماں، اسرار کو پچھلے صحن میں پنگھوڑے میں ڈالے جھلا رہی تھی تو اسے اونگھ سی آ گئی۔ شاید اس نے خواب میں دیکھا، یا پھر وہ حقیقت تھی۔ ایک لمبے بالوں والی بے حد حسین عورت جس نے سرخ ساڑھی باندھی ہوئی تھی اسرار کو جھولے میں لٹا رہی تھی اور اسرار کے چہرے پہ بہت سکون تھا۔ اس کا ننھا سا پیٹ مینڈک کے پیٹ کی طرح پھولا ہوا تھا اور وہ ہچکیاں لے رہا تھا۔ عورت نے اسرار کو پنگھوڑے میں لٹایا اور ٹاہلی کے درختوں کے پیچھے ایک پرانی کوٹھڑی میں غائب ہو گئی۔ یہ وہی کوٹھڑی تھی جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کے نیچے سانپوں کی پرانی بانبی ہے۔ جس میں اتنا بڑا خزانہ مدفون ہے کہ میاں اللہ یار کو پتا چل جائے تو وہ پاگل ہی ہو جائے۔ اس بانبی کی یہ شہرت بھی تھی کہ اس میں ایک ایسی ناگن رہتی ہے جو سو سال سے زیادہ عمر کی ہے۔ جب جی چاہتا ہے ناگن بن جاتی ہے اور جب جی چاہتا ہے انسان۔

ان سب کہانیوں کے باوجود شاماں نے اس معاملے میں خاموشی اختیار کر لی۔ اسے کچھ سمجھ تو نہ آیا تھا، لیکن اس کی چھٹی حس اسے بتا رہی تھی کہ باؤ اسرار عام بچہ نہیں۔ اور پھر اس نے بکری اور اس کے دونوں میمنوں کو ذخیرے میں چھڑوا دیا، جہاں بعد ازاں خونریز واقعات پیش آئے۔

باؤ اسرار پل گیا۔ شاماں نے اس دن کے بعد کبھی اس عورت کو نہ دیکھا، لیکن اسے اس کی موجودگی کا احساس تھا۔ وہ اسرار کو اکثر کوٹھڑی میں اکیلا چھوڑ آتی تھی۔ اسرار دن بدن ایسا گول مٹول ہوتا گیا کہ ہر شخص کو پیار آتا تھا۔

پرسوں جب اس نے اسرار کو آدھا جیتا آدھا مرا پلنگ پہ پڑا دیکھا تھا، تو پہلا خیال اس کے ذہن میں یہ ہی آیا تھا کہ ناگن وار کر گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اسے اپنے خیال پہ ندامت ہوئی۔ اس رات جب تک اسرار اپنے پیروں پہ چل کے گھر نہیں آیا، شاماں جلے پیر کی بلی کی طرح سارے میں گھومتی رہی، یہاں تک کہ متذکرہ کوٹھڑی میں بھی ہو آئی۔ جہاں باقی کوٹھڑیوں کی طرح فرش پہ ریت کی تہہ تھی اور اس کے اوپر پرالی کی موٹی تہہ جمادی گئی تھی۔ کوٹھڑی میں اندھیرا اور سیلن تھی اور لگتا تھا سالوں سے وہاں کوئی بھی نہیں آیا۔

ابھی وہ وہاں سے واپس پلٹی ہی تھی کہ اس نے دیکھا اسرار، جسے مینا اور محسن، تو تھمو کر کے لے گئے تھے اپنے پیروں پہ چلتا ہوا ڈیرے کے عین درمیان میں کھڑا تھا۔ اس کے گھونگھریالے بال کندھوں پہ بکھرے ہوئے تھے اور نیلی آنکھیں ایک وحشت میں چمک رہی تھیں۔

وہاں کھڑے ہو کے اس نے اعلان کیا کہ وہ واپس آگیا ہے اور اب میاں اللہ یار کو بالکل فکر کرنے کی ضرورت نہیں، نہ وہ بھوریوں والے کلوں کو بنجر رہنے دے گا اور نہ ہی ذخیرے میں سالوں سے انسانی داخلے پہ بندش کو برقرار رہنے دے گا۔

اس نے بالکل میاں اللہ یار کے انداز میں جوگی کی ماں اور بہن کے بارے میں بہت نادر افکار کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ ہوتا کون ہے ان کے علاقے میں جنگل اور اجاڑ بنانے والا؟

اسرار کی آواز اور انداز ہو بہو میاں اللہ یار والے اور اس لمحے زندگی میں پہلی دفعہ شاماں کو اپنے فیصلے پر شدید پچھتاوا ہوا اور جنت بی بی سے نفرت محسوس ہوئی۔

اسرار کی ہر ہر ادا سے ثابت تھا کہ وہ ہی میاں اللہ یار کا اصلی سپوت ہے۔ باقی کے چھ کپوت احمقوں کی طرح منہ کھولے اس کی باتیں سن رہے تھے۔

اسی وقت اس نے ایک دعوت کا اعلان کیا جس میں وہ علاقے کے سرکردہ لوگوں کو بلا کے اپنے فیصلے کا اعلان کرنا چاہتا تھا۔

اسرار کی دعوت پہ آئے ہوئے سب لوگ خوب سیر ہو کے پلاؤ زردہ کھا چکے تھے۔ کامے ہاتھ دھلانے اور حقے تازہ کرنے کے بعد اپنے اپنے گھروں میں کھانا پہنچانے چلے گئے تھے اور یہاں ٹاہلیوں اور دھریکوں کی چھاؤں میں، شکم سیر مہمان کھانے کے خمار میں ذرا بہکی بہکی ہنسی ہنستے ہوئے اپنے بارے میں خود ساختہ قصے سنا رہے تھے۔

اسرار کی مہمان نوازی سے وہ لطف اندوز تو ہوئے تھے لیکن اندر ہی اندر انہیں یہ خوف پڑ گیا تھا کہ وہ کسی طرح اسرار سے کم تر تو نہیں اور کیا وہ بھی اپنے ڈیروں پہ ایسی ہی دعوت بپا کر سکتے ہیں اور اگر وہ دعوت کریں گے تو کیا وہ ایسی ہی بھرپور اور پر لطف ہو گی؟

ان واہموں کو ٹالنے کے لیے وہ اپنے بارے میں بڑی بڑی باتیں کر رہے تھے اور نشیلی ہنسی ہنس رہے تھے تب ہی اسرار نے بنا کسی تمہید کے انہیں آج کی تقریب کی غرض و غایت سے آگاہ کرنا شروع کیا۔

پہلے تو انہیں سمجھ ہی نہ آئی اور جب سمجھے تو لگے آپس میں چہ میگوئیاں کرنے۔ اسرار پاگل ہو گیا تھا کیا؟ یہاں بیس گاؤں ادھر اور بیس گاؤں ادھر، کون ایسا شخص تھا جسے یہ معلوم نہ ہو کہ میاں اللہ یار کی بھوریوں والی زمین کو جس کی ملکیت ہنوز مشکوک تھی، آباد کرنے کی خواہش کا کیا انجام ہوا تھا؟

ذخیرے میں غائب ہونے والے نوجوانوں، آمے اور غفورے کے خاندان آج بھی یہیں آباد تھے اور ان کے بچے جو جوان ہو جانے کے باوجود اب بھی ''ہائے بے چارے'' ہی کہلاتے تھے، ان کی موجودگی میں کس کی جرأت تھی کہ وہ بھوریوں کو آباد کرتا؟

''وہ جوگی، جسے آپ سب لوگ پتا نہیں کیا سمجھتے ہیں، ایک شعبدہ باز اور چالاک آدمی ہے۔ آپ سب کو ڈرانے کے لیے جھوٹی کہانیاں سناتا ہے۔ قدرتی آفات کو اپنی کہانیوں میں شامل کر کے اس نے کروڑوں روپے کی زمین پہ قبضہ کر رکھا ہے۔ ذخیرے میں اگنے والی گھاس اور درختوں کا بالن، سب حرام موت جاتا ہے۔ اتنے سارے لوگوں میں کسی کی ہمت نہیں کہ آگے بڑھ کے اس ڈرامے کا خاتمہ کرے؟''

مہمانوں کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ باؤ اسرار جو لاہور سے وکالت پڑھ کے آیا تھا اور جو آتے ہی سانپ کے کاٹے سے ادھ موا ہو گیا تھا۔ یوں ان کے سامنے کھڑا، کیسی باتیں کر رہا تھا؟ ایسی باتیں تو کبھی میاں اللہ یار نے بھی نہ کی تھیں جو بڑا ابد بنا اور سرکش تھا۔

''میں آج آپ لوگوں کو صاف صاف بتا رہا ہوں کہ آپ سب بلاوجہ ایک چالاک آدمی کے ہاتھوں بے وقوف بن رہے ہیں۔ میں کل ہی کرین منگوا کے بھوریوں کی مٹی پلٹواتا ہوں، ریت صرف اوپر ہے، نیچے مٹی ہے اور رہ گئے ٹوبے اور ڈھکیاں، تو کرین ہزاروں من مٹی اٹھا لیتی ہے۔ دنوں میں سب ٹوبے بھر جائیں گے۔''

یہ سن کر مینا تڑپ اٹھا۔ مینا جو پیدائشی کانا تھا۔ اس نے اپنی ایک آنکھ سے ان ٹوبوں میں ایسی ایسی حسین مچھلی دیکھی تھی کہ یہ سوچ کر ہی اس کا دل ڈوب گیا تھا کہ ان ٹوبوں کو اجاڑ دیا جائے۔ وہ اسرار کے سامنے اٹھ کھڑا ہوا۔ گو نہ تو قد اور نہ ہی وجاہت میں وہ کسی طرح اسرار کا ہم پلہ تھا۔ لیکن آخر وہ اس کا بڑا بھائی تھا اور مانا کہ اسرار شہر سے وکالت پڑھ کے لوٹا تھا لیکن اگر کل وہ اسے جوگی کے پاس نہ لے جاتا تو آج وہ سب کے سامنے کھڑا یوں چڑ چڑ نہ بول رہا ہوتا۔

مینا آگے بڑھا اور اس نے اسرار کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

''آرام سے کاکا، آرام سے، ابھی آئے ہو، چار دن گزار لو، سوچ لو، سمجھ لو، ہم بھی ذرا اصلاح مشورہ کر لیں۔ پھر بات کرتے ہیں۔ ایسے آتے ہی کیا غصہ کرنا؟''

پھر سب نے دیکھا اسرار نے نہایت حقارت سے مینے کا وہ ہاتھ جو اس کے کندھے پر تھا، جھٹک دیا۔

''میں آپ لوگوں کو بتا رہا ہوں کہ یہ جوگی خطرناک آدمی ہے، اس نے انسانی آبادی کے قریب نہایت ضرر رساں جانور پال رکھے ہیں۔ سانپوں کے کاٹے سے ہر سال کتنے ہی لوگ مر جاتے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ یہ

سانپ کہاں سے آتے ہیں، خود میری مرحومہ والدہ......"

بات کرتے کرتے اسرار کی نظر میاں اللہ یار پہ پڑی جو اپنے موڑھے میں مرا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور آنکھوں میں ایک خوف چھایا ہوا تھا۔

اسرار نے نظر چرائی اور اسی طرح اونچی آواز اور مضبوط لہجے میں بولتا چلا گیا۔

"ہمیں پر ایکڑ پیداوار بڑھانی ہے، دنیا کی آبادی نہایت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اگر ہم نے بروقت ڈیم نہ بنائے، بنجر زمینوں کو آباد نہ کیا تو قحط پڑ جائے گا ہم سب بھوک سے مر جائیں گے۔"

اجتماعی موت کے تصور نے ان سب کو لرزا کے رکھ دیا۔ حقوں کی نئے منہ میں دبائے دبائے کئیوں نے سوچا کہ بات تو باؤ اسرار سچی کرتا ہے۔

"......اور یہ بھوریاں ایک چھوٹی سی مثال ہیں، ایک مائنڈ سیٹ، ایک سوچ، اسی سوچ کے مالک افراد ہر ترقیاتی کام میں روڑے اٹکاتے ہیں، کیوں؟ کیونکہ یہ خود غرض لوگ ہیں۔ اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کے پیچھے پوری انسانیت کو داؤ پہ لگا دیتے ہیں۔ ذرا سوچیے، بھوریوں کے آباد ہونے سے ہمارے علاقے کی پر ایکڑ پیداوار ایک دم بڑھ جائے گی۔ لوگوں کو روزگار کے مواقع ملیں گے اور جنگلی جانوروں کے خوف سے جو سر شام ہی گھروں میں بند ہو جاتے ہیں وہ رات گئے تک بے خوف و خطر باہر گھوم سکتے ہیں، اور پھر......" وہ سانس لینے کو رکا۔

"جب یہ بھوریاں آباد ہوں گی تو دیکھیے گا وہ تمام ڈیم اور بجلی گھر اور صحراؤں کی آبادکاری کے منصوبے، جنہیں اس جوگی جیسے خود غرض لوگ روکے ہوئے ہیں ایک ایک کر کے بن جائیں گے۔ پھر نہ بجلی کی کمی ہو گی، نہ پانی کی، یعنی ٹیوب ویل بھی چل سکیں گے اور نہری پانی کی بھی فراوانی ہو گی۔"

یہ ایک ایسی بات تھی جو وہاں بیٹھے کم و بیش ہر فرد کو سمجھ آ گئی اور انہوں نے مزید کچھ سننے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی اور بے ساختہ تالیاں پیٹنے لگے۔ مینا ہراساں سا کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اسے ایک خوف نے دبوچ لیا۔ اسرار جو کچھ کر رہا تھا، وہ غلط تھا اور بہت غلط یہ تو اسے معلوم ہی تھا، لیکن سب کا اس پاگل پن میں شامل ہو جانا بہت ہی غلط تھا۔

لیکن اس وقت وہ اجتماعی پاگل پن کے شکار اس مجمع کو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، جو شکم سیر بھی تھا اور اس خماری کی کیفیت میں باؤ اسرار کی گرما دینے والی تقریر نے ان کی سوچنے سمجھنے کی سب طاقتوں کو سلب کر لیا تھا اور وہ ایک جنون کے عالم میں بکرے بلا رہے تھے اور ناچ رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ مینا خوف سے پسینہ پسینہ ہوا، یہ سب دیکھ رہا تھا، یہ سب جو یقیناً بہت غلط تھا۔

(۲۹)

اس رات بھوریوں پہ، جنڈ کی اس کٹی میں کوئی نہ سویا۔ سالوں بعد وہ سب ایک جگہ بیٹھے تھے۔ منظور کی بیٹی صحنچی میں موجود ننھے سے جل کھمبیوں والے تالاب کے کنارے بیٹھی تھی۔ وہ سب وہاں تھے اور ایک دوسرے کی برہنگی سے نظر چرائے ہوئے تھے۔

دادی جوا مجور کی پھانک کی طرح چرمرا چکی تھیں مگر زندہ تھیں بالکل خاموش تھیں۔ مسز بترا مدھم آواز میں مسلسل ایک ''کنڈ'' کی کہانی سنا رہی تھیں۔ جہاں سے ایک دریا نکلتا تھا اور اس کے کنارے بیٹھے ایک رشی نے دیوتاؤں کی ضد اور اپنے علم کی ہیکڑی میں ایک نئی سورگ بنائی تھی۔ وہ اسے بنا تو بیٹھا تھا، لیکن چلا نہ پایا تھا۔

یہ قصہ وہ گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح بار بار دہرا رہی تھیں۔ ان کا انداز نہایت غیر دلچسپ اور آواز میں ایسی بیزار کن یکسانیت تھی کہ دل گھبرا رہا تھا۔

مدھو چپ تو تھی لیکن اس کے چہرے پہ دکھ کی واضح چھاپ تھی۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہ تھا کہ اسرار ایسا نکلے گا۔ ہر ماں کی طرح وہ بھی اپنی اولاد کو اپنی خواہشوں کا پرتو دیکھنا چاہتی تھی اور ہر ماں کی طرح اس کی یہ ہی خواہش تھی کہ وہ اپنے باپ کا فرمانبردار ہو۔ گزرے ہوئے ان تمام برسوں میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کون سا خوف تھا، جس نے عرفان صاحب کو استعفیٰ دینے اور پھر یہاں آنے پر مجبور کیا تھا۔ دریا کا خوف!!

وہ جان گئے تھے کہ دریا بے جان نہیں ہوتے۔ انسانوں کی طرح وہ بھی ذہن رکھتے ہیں۔ ان کی ایک سوچ ہے۔ ایک پورا نظام فکر ہے۔ وہ دیوتاؤں کی طرح اپنے فیصلے خود کرتے ہیں اور ان کے فیصلوں سے جہاں بہت سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہے، وہیں بہت سی مخلوقات کا فائدہ بھی ہوتا ہے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ دریا پہ بند باندھنے اور اس کا رخ موڑنے کا نتیجہ کتنا بھیانک نکلے گا۔ ایک سیلاب جو اتنا بڑا ہوگا کہ اس کی زد سے کوئی بھی نہ بچ پائے گا۔ انہوں نے سالوں، بھوریوں کے ٹبوں اور ٹیکریوں پہ کھڑے ہو کے آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ شاید کوئی اشارہ، کوئی غیبی مدد کچھ تو آئے۔ لیکن آسمان کے در بند رہے۔ خالق اپنی مخلوق کو بارہا تنبیہ کر چکا تھا۔ ہر ہر زمانے میں بتا چکا تھا اور اب بشارتوں کے زمانے گزر چکے تھے۔ فقط عذاب کا دور تھا۔

وہ یہاں بیٹھے تھے صرف اس انتظار میں کہ اسرار بڑا ہو گا ان کی مدد کرے گا۔ جانے کیوں انہیں یقین تھا کہ جس طرح قدرت نے اسرار کا بیج بویا اور اسے پیدا کیا، وہ ضرور اس سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے۔

کل جب انہیں معلوم ہوا کہ اسرار کو سانپ نے ڈس لیا ہے تو منتظر تھے کہ اب جلد ہی وہ اسے یہاں لے کر آئیں گے۔ باوجود اس کے کہ ان کے پاس سانپ کے کاٹے کا کوئی تریاق نہ تھا، لیکن وہ اسرار کے منتظر تھے اور جب دادی کے لگائے لیپ سے اسرار ہوش میں آ گیا تو انہیں امید تھی وہ ان سب کی ہیئت کذائی سے بہت متاثر ہو گا اور کچھ نہیں تو منظور کی بیٹی کو دیکھ کر تو واقعی مان جائے گا کہ وہ کچھ خاص لوگ ہیں اور کسی خاص مشن کے تحت یہاں بیٹھے ہیں اور پھر وہ ان کی مدد کرے گا۔

وہ ان کی کیا مدد کرے گا، یہ انہوں نے کبھی نہ سوچا تھا۔ بھلا دو بڑے ملکوں کے باشندوں کو بلکہ پوری دنیا کو یہ کیسے باور کرایا جا سکتا تھا کہ دریاؤں کے ساتھ جو چھیڑ چھاڑ وہ کر چکے ہیں وہ بہت خطرناک ہے اور اس سے بچت کا صرف ایک طریقہ ہے، رو ول بیک، دریاؤں کو ان کی اصل شکل میں لے جا کے پیچھے ہٹ جاؤ۔ اپنی آبادیاں، جوان کی گزرگاہوں اور بستیوں میں بنائی تھیں۔ ہٹا دو۔ ان کے راستے سے ایسے ہی ہٹ جاؤ جیسے ایک بڑی طاقت کے راستے سے چھوٹی طاقتیں ہٹ جاتی ہیں۔ جھک جاؤ، دریاؤں کے آگے جھک جاؤ۔ تب تو شاید اس تباہی سے بچ جاؤ جو لازمی آنے والی ہے۔ ورنہ بس ایک کہانی ہو گی۔ ریت کی تہوں میں دفن آبادیاں نکلیں گی اور آنے والی نسلیں حیران ہوں گی کہ یہ لوگ جن کا نہ اب نام رہا نہ نشان، کیا شاندار لوگ تھے اور انہوں نے کیا عالی شان شہر بسائے تھے اور کیا عمارتیں بنائی تھیں اور پھر کیا ہوا، ان پہ کیا آفت نازل ہوئی؟ یہ کیوں ناپید ہوئے اور ان میں سے کچھ اپنے ہونے پہ حیران ہوں گے کہ وہ کیوں ہیں اور کہاں سے آئے؟ آیا ان برباد ہو جانے والوں میں ہمارے اب وجد بھی تھے یا ہم کوئی اور ہی نسل ہیں؟

کٹی میں جولائی کی رات کا حبس تھا اور جل ککھمیوں کے گلنے سڑنے کی ہلکی سی بو۔ منظور کی بیٹی، ایک چھلنی چھلنی چولی پہنے عجیب شرمندہ سی بیٹھی تھی۔ اس کے بال جو بے تحاشا لمبے اور سنہری تھے اس کے شانوں پر جٹاؤں کی صورت بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے بچپن سے اسرار کے بارے میں سن رکھا تھا اور وہ ذہنی طور پہ اس کی منتظر تھی۔ وہ جانتی تھی اور اسے باور کرایا گیا تھا کہ جب باؤ اسرار وکیل بن کے لوٹے گا تو ایک روز یہاں آئے گا اور یہاں آنے کے بعد جب وہ اسے دیکھے گا تو عرفان صاحب کی سب باتوں پہ یقین کر لے گا اور ان کی مدد کرے گا۔ لیکن اسرار نے کسی کو بھی نظر بھر کے نہ دیکھا۔ یوں لگتا تھا وہ پہلے ہی سے ان کے بارے میں رائے قائم کر چکا تھا اور اب اس رائے میں کوئی تبدیلی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

عرفان صاحب نے حبس سے گھبرا کے کچھ شاخیں ہٹا کے ایک کھڑکی بھر جگہ خالی کی جہاں سے چڑھتے چاند کی روشنی اور بھوریوں پہ چلتی ہلکی ہوا دونوں اندر آئے۔ باہر اکانہہ کے اونچے درخت چاندنی میں چمک رہے تھے اور رات کے پرندے اپنے اپنے شکار کا تعاقب کرتے پھر رہے تھے۔

عرفان صاحب کا دل بہت بھاری تھا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ دریاؤں کی اس تقسیم سے تین دریا سوکھ جائیں گے تو انہیں عجیب تو لگا تھا۔ لیکن جب جوگی ان کو سانپ کا تحفہ دے کر گیا تو ان پہ بہت سی باتیں کھلیں۔ وہ سانپ جو وہ منگلا کی پہاڑیوں سے بچا کر لایا تھا۔ وہ سانپ اصل میں کیا تھا یہ تو ان کو بہت بعد میں معلوم ہوا۔ اور جب معلوم ہوا تو ان کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ وہ سانپ اور بہت سے، اربوں کھربوں دیگر سانپ، یہ سب تو انسان کی آنول تھے، وہ آنول نال جس کے ذریعے وہ اس زمین سے پیوستہ تھے اور خوراک لے رہے تھے اور جی رہے تھے۔ جو باتیں ان کو پتا چل رہی تھیں ان کو کوئی بھی ذی ہوش آدمی نہ تو سنتا اور نہ ان پہ کسی بھی طور یقین کرتا۔

آہستہ آہستہ ان پہ سب کچھ کھل گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی کھوج سے دنیا کو آگاہ کرتے اور دریاؤں کے بچاؤ کی کوئی مہم چلاتے، پے در پے ایسے واقعات پیش آئے کہ عرفان صاحب کو اندازہ ہوگیا کہ ان کو صرف آگاہ کیا گیا ہے اور یہ آگہی انہوں نے آگے منتقل کرنی ہے، باؤ اسرار تک۔

باؤ اسرار نے کیا کرنا تھا؟ یہ انہیں بھی معلوم نہ تھا اور کیسے معلوم ہوتا؟ ان کے اپنے ابا میاں رحمٰن احمد نے کبھی یہ سوچا تھا کہ ان کا بیٹا جسے وہ علی گڑھ سے انجینئر بنا رہے ہیں ایک دن ایک اجنبی جگہ، اجنبی لوگوں کے درمیان یوں ننگ دھڑنگ، بے سروسامان بیٹھا کچھ اجنبی دریاؤں اور ایک اجنبی نسل کی بقاء کی جنگ لڑ رہا ہوگا؟

تو جب رحمٰن صاحب کو اس وقت تک، جب تک حملہ آور نے ان کے سر پہ کرپان کا وار کیا اور ان کا کاسۂ سر لڑھکتا ہوا ریل کی کھڑکی سے باہر جھجھر کی نیم صحرائی زمین پر گرا اور ان کی آنکھیں موت کی حیرت میں کھلی رہ گئیں۔ اس وقت تک بھی انہیں عرفان صاحب کے مستقبل کا کچھ پتا نہ تھا، تو عرفان احمد کو کیسے معلوم ہوتا کہ اسرار نے کیا کرنا ہے؟

اس رات کٹی ہی میں رت جگا نہیں تھا۔ میاں اللہ یار کے ڈیرے پر بھی جگراتا تھا۔ مینا، محسن، میاں اللہ یار اور اسرار بڑی گہری بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ مینے کے علاوہ دونوں لڑکے بھوریوں کو آباد کرنے پہ مصر تھے۔ مینا دھیمے دھیمے لہجے میں انہیں سمجھا رہا تھا اور میاں اللہ یار حقے کی نَے میں منہ دبائے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔

''میں ایک لمحہ بھی ان لوگوں کو یہاں برداشت نہیں کرسکتا۔ جانتے ہو، جو میں مرتا مرتا بچا ہوں، یہ سب ان کی کارستانی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ میں آتے ہی ان کے دباؤ میں آجاؤں اور وہ وہاں خرمستیاں کرتے رہیں۔'' اسرار نے غصے سے نتھنے پھلا کر کہا۔

''بات تمہاری غلط نہیں اسرار جی، لیکن بات یہ ہے کہ اس طرح ایک دم جذباتی ہو کے اتنا بڑا فیصلہ کرنا غلط ہے۔ تم نے خود ہی کہا ہے کہ وہ جوگی بہت چالاک ہے اور قدرتی آفات تو آتی ہی رہتی ہیں اور ایک بات یہ بھی مانو کہ ایسے چالاک لوگوں کا قدرت بھی ساتھ دیتی ہے۔ تو اگر تمہارے کرین منگانے اور ان کو بھگانے کے دوران کوئی اس قسم کا واقعہ پیش آگیا، جیسا کہ وہ میمنوں والا واقعہ، تو پھر ہم کبھی ان بھوریوں کو زیرِ کاشت نہیں لاسکیں گے، کیوں ابا جی؟'' مینے نے دادطلب نظروں سے میاں اللہ یار کو دیکھا جو ایک گہری سوچ میں گم تھے۔

تینوں لڑکے منتظر نظروں سے باپ کو دیکھ رہے تھے۔ اس وقت شاماں ٹرے میں دودھ کے گلاس رکھے صحن میں آئی۔ زہر مہرے رنگ کا ریشمی جوڑا، چاندنی میں اس کے گورے رنگ پہ اتنا کھل رہا تھا کہ میاں اللہ یار کو اچھو لگ گیا۔ مینا جانتا تھا کہ یہ اچھو ان کا دفاعی ہتھیار ہے اور جب وہ کسی بات کا جواب نہیں دینا چاہتے تو اسی طرح کھانسنے لگتے ہیں۔ وہ بے زاری سے انہیں کھانستے ہوئے دیکھنے لگا۔ لیکن شاماں کو اندازہ ہو گیا کہ بات بگڑ چکی ہے دوڑ کر آئی اور ان کی پیٹھ ملنے لگی۔ میاں اللہ یار کا سانس سینے میں نہ سما رہا تھا اور ان کے دیدے حلقوں سے باہر نکلے آ رہے تھے اور زبان منہ سے باہر لٹک رہی تھی اور پھر ان کے حلق میں گھنگھرو بجنے لگا اور شاماں اپنی ساری عقل مندی بھول کے سر پہ ہاتھ رکھ کے بین کرنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے میاں اللہ یار کا سانس اکھڑنے لگا اور گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔

تب اسرار ایک دم اپنی جگہ سے اٹھا اور نیم بے جان اللہ یار کو گود میں اٹھا کر جس قدر تیز وہ دوڑ سکتا تھا، دوڑتا ہوا بھوریوں کی طرف روانہ ہوا۔

محسن اور مینا حیران پریشان اپنی جگہ کھڑے رہ گئے۔

جب وہ آدھی بھوریاں عبور کر چکا تو عرفان صاحب کی نظر اس پر پڑی۔ ریت میں پیر کھبو کھبو کر چلتا، میاں اللہ یار کے وزن سے ہلکان وہ کٹی کی طرف ہی آیا تھا۔ یہ منظر صرف عرفان صاحب ہی نے نہیں دیکھا بلکہ دادی اور منظور کی لڑکی سمیت سب نے دیکھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔ جنڈ کی شاخوں میں رہنے والی کسی فاختہ نے خون خشک کر دینے والی آواز میں ''غوں، غوں'' کرنا شروع کر دیا۔

وہ سب سالوں کے انتظار سے شل ہو چکے تھے اور اسرار کے رویے نے انہیں کچھ ایسا بدل دیا تھا کہ اب کسی کو بھی کسی اچھی بات کی امید نہیں رہی تھی۔ اسرار، کسی بے ہوش انسان کو لیے ان کی طرف آ رہا تھا۔ آنے دو، جب وہ پہلی بار ہی نہ کچھ سننے پہ آمادہ تھا اور نہ ان سب کے لیے جو سالوں سے اس کے منتظر تھے اس کی نظروں میں کوئی محبت تھی تو آج اس کا آنا ان سب کے لیے بے معنی تھا۔ وہ بھوریوں کی مٹی پلٹونا چاہتا تھا اور یہاں کے باسیوں کو ترقی پار کرنا چاہتا تھا۔ ذخیرے میں، جہاں سالوں سے انسانوں نے قدم نہ رکھا تھا، حد یہ کہ جنگلات کے محکمے والے بھی لکڑی کاٹنے نہ آتے تھے۔ وہاں، انسانوں کی آمد و رفت دوبارہ بحال کرانا چاہتا تھا۔

وہ سب اسی طرح بیٹھے رہے۔ دادی کی مٹھی میں ڈیلے کے پھل تھے اور وہ اپنے بناء دانتوں کے مسوڑھوں سے ڈیلے چبا رہی تھی۔

اسرار کٹی کے دروازے پہ پہنچ کے زور زور سے پکارا۔ اس کی آواز سن کے درخت کی شاخوں میں پناہ لینے والے، وحشت زدہ ہو کے اجنبی سمتوں میں اڑ گئے۔ جب کسی پکار کا کوئی جواب نہ ملا تو وہ میاں اللہ یار کو اٹھائے اٹھائے اندر داخل ہوا۔ آج اس نے غور سے دیکھا۔ یہ چونے، مٹی گارے سے بنا ہوا گھر نہیں تھا۔ مگر اس میں وہ سب کچھ تھا جو ایک گھر میں ہوتا ہے۔ دیواریں، چھت اور فرش اور پھر ایک لمبی راہداری سے گزر کے وہ وہاں پہنچا، جہاں وہ سب بیٹھے ہوئے تھے اس نے دادی کو بھی دیکھا، مدھو کو بھی، مسز بترا کو، عرفان صاحب کو، منظور کی بیوی اور اس کی

بیٹی کو بھی، جو جل کنبھیوں والے تالاب کے کنارے بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ ایسا تھا جیسے اس کے چہرے پہ ملتانی مٹی کا لیپ کر دیا گیا ہو۔ آنکھیں عام انسانوں کی طرح لمبی ہونے کی بجائے ذرا گول تھیں اور اتنی شفاف کہ لگتا تھا شیشے کی گولیاں ہوں اس کے ہونٹ اتنے سرخ تھے جیسے پکے ہوئے گکرونڈے اور بالوں کا سونا، ڈھلانی شانوں سے پھسلتا ہوا جل کنبھیوں والے تالاب میں گھل رہا تھا، چاندنی، جنڈ کی شاخوں سے نکل کے اس طرح اس پہ پڑ رہی تھی کہ اس کے زریں جسم کے چانے چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔

اسرار اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ جوگی ایک عجیب انسان ہے، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے پاس عجیب عجیب مخلوقات ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ لاہور کی ایک کوٹھی کے کوارٹر میں ایک جل پری پیدا ہوئی تھی اور اس کی ماں نے اسے لے کر نہر میں چھلانگ لگا دی تھی۔ اسے وہ رات بھی اچھی طرح یاد تھی جب وہ نازنین کے ساتھ اس کوٹھی میں گیا تھا اور وہاں ہزاروں طرح کے جانور اور نایاب پرندے نظر آئے تھے جو چاند کی روشنی میں پرواز کرتے کرتے نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے اور پھر وہ رات جب نازنین اس سے آخری بار ملی تھی۔ پھر سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ محسن کی طرح صرف حافظ تھانہ مینے کی طرح بھلکو سیانا، اسے باتوں کو یاد رکھ کے ان سے نتیجے نکالنے خوب آتے تھے اور اسے معلوم تھا کہ اس کی آنکھیں نیلی ہیں، مدھو کے بچے کی طرح نیلی اور اس کے خاندان میں دور دور تک کسی کی آنکھیں نیلی نہیں تھیں۔

چاندنی اور سایوں کے درمیان بیٹھی وہ جل پری کس دنیا کی مخلوق تھی؟ عبرانی زبان میں ایک روایت ہے کہ اس آدم سے پہلے ایک حوا بنائی گئی تھی، جو اکیلی تھی اور ظاہر ہے اس کی نسل آگے نہ چل سکتی تھی اور وہ روتی تھی۔

تنہا جل پری تالاب کے کنارے بیٹھی تھی۔ اسرار جیسے نیند میں چلتا ہوا اس کے سامنے پہنچا اور میاں اللہ یار کے بے ہوش وجود کو اس کے سامنے اس طرح رکھ دیا جیسے بھینٹ چڑھا رہا ہو۔

کٹی میں خاموشی تھی۔ باہر ریت پہ رہنے والوں کی سائیں، سائیں اور اپنے ٹھیئے پہ واپس لوٹتے بڑ باگلوں کے ایک جھلڑ کے پروں کی مہیب پھڑ پھڑاہٹ کے علاوہ سب طرف خاموشی تھی۔ منظور کی لڑکی نے جب اسرار کو دیکھا تو اضطراب کی ایک لہر سی اس کے وجود میں اٹھی۔ اس کی دم جو آدھی پانی میں ڈوبی ہوئی تھی، کسی راستہ بدلنے والی کشتی کے چپوار کی طرح ہلی اور ساکت پانی میں ہلچل مچی۔ اس آواز سے خاکستری چڑیوں کا ایک جوڑا بیدار ہو گیا اور بری طرح شور مچانے لگا۔

''یہ میاں اللہ یار ہے، اسے بچالیں۔'' اسرار نے ملتجی انداز میں عرفان صاحب سے کہا۔ وہ سب جان گیا تھا، اسی دن جان گیا تھا جب نازنین نے اسے ان دو کوٹھیوں کا قصہ سنایا تھا، جن پر جنگل دوبارہ اپنا قبضہ جما چکا تھا اور جہاں ایک مسمار شدہ تہہ خانے میں کئی برساتوں کا پانی کھڑا تھا اور اس میں ایک مگرمچھ تیرتا پھر رہا تھا۔

اپنی پیدائش اور فضل بی بی کی موت کے بارے میں اس نے کئی آدھی ادھوری کہانیاں سن رکھی تھیں۔ ان کہانیوں کے درمیانی ٹکڑے، کچھ تو اسے نازنین کی سنائی ہوئی کہانی سے مل گئے تھے اور باقی اس نے خود گھڑ لیے تھے۔

اس طرح جو تصویر بنی تھی وہ اس کو پڑھائے اور سکھائے گئے اصولوں کی روشنی میں ایک بے حد گھناؤنی کہانی تھی اور اس کہانی کا ایک لعنتی کردار وہ خود تھا۔ وہ کیونکر عرفان صاحب سے نفرت نہ کرتا؟ نازنین بھی کچھ نہ کچھ تو جان ہی گئی تھی جو اس نے اسے چھوڑنے کا ارادہ کیا تھا۔

اسے بناء دیکھے عرفان صاحب اور مدھو سے نفرت ہو گئی تھی۔ یہ دونوں، وہ افراد تھے جنہوں نے اپنی ہوس کی خاطر، دو گھرانوں کو برباد کیا۔ دو بسے بسائے گھر اجاڑے اور وہ دو کوٹھیاں جو خوبصورت طرز تعمیر کا نمونہ تھیں اور جن میں سجی ایک ایک چیز، صدیوں کی تہذیب اور تمدن کی آئینہ دار تھی صرف ان دو لوگوں کی وجہ سے جنگل بن گئیں۔ وہ گھر جہاں، خوش اندام، خوش پوش، خوش اطوار انسان اجلے گہلے پھرتے تھے، آج وہاں جانوروں کے بھٹ اور کمین گاہیں قائم ہو گئی تھیں۔ صرف اور صرف ان دونوں کی وجہ سے۔

اسی لیے جب دو روز پہلے اسے ہوش آیا تو وہ فوراً ہی سمجھ گیا تھا کہ بات کیا ہے اور وہ کہاں، کن لوگوں کے درمیان ہے۔ تب اس کے دل سے نفرت کی ایک لہر اٹھی تھی۔ جس نے ہر منظر اور شکل کو دھندلا دیا تھا اور اسے بس یہ یاد رہ گیا تھا کہ اسے ان عجیب قسم کے رویوں کے مالک لوگوں کو ختم کرنا ہے۔ ان پہ عرصۂ حیات تنگ کرنا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ مختلف تھے۔ ان کے زندگی گزارنے کے اصول، ان کے نظریات ان کی سوچ ان کی وضع قطع سب فرق تھی۔

(۳۰)

میاں اللہ یار کو بچایا نہ جا سکا، عرفان صاحب کے پاس کوئی طاقت نہ تھی، کوئی خاص علم نہ تھا، وہ تو صرف اتنا جانتے تھے کہ ایک با کردار ہیرو کی طرح، دریا جو مار پہ مار کھا رہا ہے۔ جب بپھرے گا، تو کسی کو نہیں چھوڑے گا۔ اس علم سے وہ آخری سانسیں لیتے اللہ یار کو کیسے بچاتے؟

اللہ یار مر گیا! گاؤں میں کہرام بپا ہو گیا۔ اندر ہی اندر ایک سرگوشی پھیل گئی کہ یہ سب باؤ اسرار کی ضد کی وجہ سے ہوا ہے۔ نہ وہ بھوریوں کو آباد کرنے کی ضد کرتا اور نہ ہی یہ مصیبت آتی۔ کچھ بڑے بوڑھے جن میں گونگا آما بھی شامل تھا، برملا کہتے پھر رہے تھے کہ باؤ اسرار کے پیدا ہونے کے بعد سے ہی گاؤں پہ آفتیں نازل ہونا شروع ہوئی ہیں اور یہ کہ جب تک وہ گاؤں سے باہر رہا سب خیریت رہی، ساری مصیبت ہی اس کے ہونے سے آتی ہے۔

تدفین، سوئم، دسویں تک یہ سرگوشیاں بڑھ کر بیانات بن چکی تھیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ان باتوں کے پیچھے اسرار کے سوتیلے بھائی تھے۔

کوئی کہتا تھا مینا ان میں شامل نہیں۔ کوئی کہتا تھا شامل تو ہے لیکن اتنا سیانا ہے کہ کسی کو پتا نہیں چلنے دیتا۔ بولنے والوں کی زبانیں اتنی لمبی ہوں گی کسی کو اندازہ ہی نہیں تھا۔ پیشے کے کمی اور ذات کے کمین، ان کی جرأت ظاہر ہے کسی کی عطا کردہ تھی اور محسن کے علاوہ وہ کون ہو سکتا تھا؟

باؤ اسرار سارا سارا دن دھریکوں کی چھاؤں میں بیٹھا لوگوں کی باتیں سنا کرتا۔ زبانیں جواب دہن سے نکل کر کاندھوں پہ آ پڑی تھیں اور دہن جو چر کے ایک کان کی لو سے دوسرے کان کی لو تک پھیل گئے تھے۔ یہ وہ لوگ ہی نہ تھے جن سے اسرار میاں اللہ یار کی زندگی میں واقف تھا۔ تابعداری اور جی حضوری کے شیرے میں لتھڑی زبانوں پہ طعن و تشنیع کا کوڑتمبا اگ آیا تھا اور اس کڑواہٹ سے سارا ماحول مکدر رہتا۔

کمو نائین کی ہری آنکھوں میں حقارت بھری ہوئی تھی اور اسے بھول ہی گیا تھا کہ باؤ اسرار وہی ننھا بچہ ہے، جسے اس نے لوریاں دے کر پالا ہے۔

دن پر دن گزرتے رہے دھریکوں کے پتے زرد پڑے اور ڈوڈیاں پک کے گچھوں کی شکل میں لٹکنے لگیں۔

کھیتوں سے زرے کی فصل اجاڑنے کے بعد چھڑیوں کی ٹرالیاں بھر بھر کے آنے لگیں۔ لوگ باگ سرما کے لیے ایندھن ذخیرہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ میاں اللہ یار کی قبر پکی کرا دی گئی اور اس کے سرہانے لگایا گیا نیم قبرستان کے لینڈ سکیپ کا ہی ایک حصہ لگنے لگا۔

ان ہی شیر گرم دنوں میں ایک روز جب باؤ اسرار دھریک کے نیچے بان کی کھری چارپائی پہ شاماں کے ہاتھ کے کڑھے تکیے پہ سر رکھے آسمان کے ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا جو درخت کی چھدری شاخوں میں فیروزے کے ٹکڑوں کی طرح جھلک رہے تھے، دھریک کے زرد پتے ایک ایک کر کے اسرار پہ گر رہے تھے اور ان زرد پتوں کے بستر پہ وہ بے حس و حرکت لیٹا جانے کیا سوچ رہا تھا۔

جو کچھ وہ سوچ رہا تھا اگر اس کی بھنک بھی گاؤں والوں کو پڑ جاتی تو سب اس کی ہی نہیں، عرفان صاحب کی جان کے لاگو بھی ہو جاتے۔ وہ خاموش تھا اور اسی خاموشی میں عافیت تھی۔

لیکن یہ خاموشی صرف باؤ اسرار کی خاموشی تھی۔

محسن اب بھرا بیٹھا تھا، اور آج اس کا پیمانہ چھلک گیا۔ دھریکوں کی قطار سے ذرا پرے کھڑے ہو کر اس نے اسرار کو للکارا اور طعنہ دیا کہ اس نے شریکوں والی حرکت کی اور باپ کو ایسی مشکل میں ڈالا کہ اس کا دل ہی بند ہو گیا اور یہ کہ وہ بھوریوں کو آباد کرنے کے بہانے کھیتی باڑی کے کام پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔

اسرار بنا گردن موڑے یہ سب باتیں سنتا رہا اور پھر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ کپڑے جھاڑے اور کسی سے بھی، کوئی بھی بات کیے بغیر بھوریوں کی طرف چل پڑا۔

جب وہ گاؤں کی گلیوں سے گزر رہا تھا تو سب لوگ اچک اچک کے اسے جاتا دیکھ رہے تھے اور چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ان کے خیال میں اسرار شہر جا رہا تھا، جہاں سے وہ اپنے جیسے کسی اور اعلیٰ پائے کے وکیل کو لے کر محسن وغیرہ پہ چڑھائی کرنے والا تھا۔

باؤ اسرار لمبے لمبے ڈگ بھرتا بھوریوں کی طرف روانہ رہا۔

یہ اس کی آخری جھلک تھی جو گاؤں والوں نے دیکھی۔ اس کے بعد جب تک وہ گاؤں وہاں رہا، کسی نے باؤ اسرار کو نہ دیکھا۔

مینے کو جب اسرار کے غیاب کی خبر ملی تو وہ تڑپ اٹھا، محسن کو برا بھلا کہا اور کندھے پہ کلہاڑی رکھ کے بھوریوں کی طرف روانہ ہوا۔ اسے اپنا بھائی واپس چاہیے تھا، گل گوتھنا، اسرار، جو اسے اپنی اولاد کی طرح ہی پیارا تھا۔ اسے رہ رہ کے محسن پہ غصہ آ رہا تھا۔ بھلا زمین کے ایک ذرا سے ٹکڑے کے لیے کوئی اس طرح کی حرکت کرتا ہے؟ ایک باپ کی اولاد ہو کر، چھوٹے بھائی کے لیے اتنا بغض؟

غصا سے جنت بی بی پہ بھی تھا اور شاماں پہ بھی لیکن اس وقت وہ صرف اسرار کو واپس لانے کی دھن میں نکلا۔

کہنے والے کہتے ہیں اسے کسی گوشت خور جانور نے مارا لیکن صدیوں سے زراعت کے لیے استعمال ہونے

والی زمین پہ دور دور تک کوئی ایسا جانور نہیں پایا جاتا جو اتنے لمبے چوڑے انسان پہ حملہ کر کے اسے جان سے مار سکے۔ لے دے کے ایک گیدڑ بچے تھے۔ان کی اتنی اوقات کہاں؟ مینے کی لاش بھوریوں کی حد سے ایک ادھ واڑا، یعنی چار کنال کے فاصلے پہ اوندھے منہ پڑی ہوئی ملی تھی۔ کسی جانور نے اس کا نرخرہ چباڈالا تھا۔حملہ کرنے والے جانور کا وار اتنا سریع تھا کہ اسے اپنی کلہاڑی استعمال کرنے کا موقع بھی نہ ملا اور وہ جس طرح صافے میں بل دے کر گھر سے چلتے ہوئے کندھے پہ لٹکائی گئی تھی اب بھی اسی طرح اوندھے منہ گرے مینے کے کندھے پہ ٹکی تھی۔دونوں ہاتھ کسی غیبی سہارے کو تھامنے کے لیے کھلے ہوئے تھے مگر آسمانوں کے در کب کے بند ہو چکے ہیں۔

پولیس آئی اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لے جانے لگی۔اس وقت شاماں نے پردہ ایک طرف رکھا اور بپھری شیرنی کی طرح تھانے دار کے سامنے ڈٹ گئی۔وہ اس مینے کو، جس نے اپنی ایک آنکھ سے دنیا کی سب خوبصورتیاں، بھوریوں میں بنے ٹوبوں میں رنگ برنگی مچھلیاں، ساون کی رات کے سیاہ آسمان، بہار کی چمکیلی دھوپ اور کھیتوں میں پھوٹتے نئے اکھوے دیکھے تھے، وہ اس مینے کو کیسے، ہسپتال کے شقی القلب لوگوں کے حوالے کر سکتی تھی؟

اس نے چلا چلا کر اور کلیجہ پیٹ پیٹ کر آسمان زمین ایک کر دیئے۔ آخر سب لوگوں کو پسپا ہونا ہی پڑا۔مینے کو غسل دے کر راتوں رات، فضل بی بی کی طرح روسی ٹریکٹر کی بتیاں جلا کر دفن کر دیا گیا۔

مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے جنازے کا اعلان بار بار کیا گیا کہ اگر اسرار بھوریوں میں موجود ہے تو شاید یہ اعلان سن کر ہی لوٹ آئے۔

مگر بھوریاں اسی طرح ویران رہیں۔خزاں کی ہوا ریت پہ نئی لکیریں بناتی اور وہاں ایستادہ درختوں کے پتے گراتی، خاموشی سے لہر در لہر بہتی رہی۔کوئی جنبش، کوئی حرکت کسی کے ہونے کا کوئی احساس، زندگی کی کوئی رمق، کچھ نظر نہ آیا۔شاماں نے خود کو ٹھے پہ کھڑے ہو کے دیکھا بھوریوں کی طرف جانے والے راستے ویران تھے اور ان پہ مویشیوں کے کھروں کے نشان تھے۔دھریکوں کی برہنہ شاخوں پہ سوکھی ڈوڈیوں کے گچھے لٹک رہے تھے کپاس کے اجڑے ہوئے کھیتوں میں بھورے اور سرخی مائل کاہی پتے، چھڑیوں سے چمٹے، ہلکے ہلکے جھول رہے تھے، روئی کا کوئی ایک آدھا پھول جو چننے والیوں کے ہاتھوں سے بچ گیا تھا اس خاکستری اور کاہی منظرنامے میں تنہا بگلے کی طرح دور سے نظر آرہا تھا۔مگر اسرار کہیں نہ تھا۔اس نے اپنے بھائی کے مرنے کی خبر سنی مگر وہ آخری بار اس کا چہرہ دیکھنے کا روادار بھی نہ تھا۔

شاماں اتنا روئی تھی کہ اب اسرار کی بے اعتنائی پہ اس کی آنکھ میں ایک آنسو بھی نہ آیا۔شاید اسے اندازہ تھا کہ اسرار کیوں نہیں آیا؟ وہ آتا بھی کیوں؟ شاماں کو اس کا انتظار تو تھا، لیکن امید نہ تھی۔ جنت بی بی اس کے قریب خاموش بیٹھی تھی۔سیہی کے کانٹے، اس کے گھر میں گڑ گئے تھے، شوہر، بیٹا، دو ناگہانی موتیں، اسرار لاکھ سوکن کا جنا سہی پلا تو نظر کے سامنے ہی تھا۔بھرا صحن اجڑ گیا۔محسن کے چہرے پہ بھی لالچ اور خود غرضی کی ایسی پھٹکار برس رہی تھی کہ دونوں عورتیں خود کو بے آسرا ہی سمجھ کے قریب قریب سمٹ آئی تھیں۔

آتی سردیوں کی اس شام، ہوا میں ایک روز پہلے کیے گئے سنڈی مار سپرے کی بو تھی اور کھاد کے زائد استعمال

سے سیاہ پڑتی مٹی کی مدھم گندھ۔ اسرار گاؤں سے چلا تھا تو مطلع بالکل صاف تھا۔ سال کے ان دنوں میں یوں بھی بارشیں نہیں ہوتیں۔ جب وہ جنڈ کے جھنڈ میں پہنچا اس وقت بھی بارش کے کوئی آثار نہ تھے۔ عرفان صاحب کٹی کے دروازے پہ ہی بیٹھے تھے اور خاکستری چڑیوں کا ایک جوڑا عین ان کے سر کے اوپر شور مچاتا اڑ رہا تھا۔

اسرار ٹھہرا تو اس کا لمبا سا سایہ ریت پہ عرفان صاحب کے سامنے بچھا ہوا تھا۔ انہوں نے نظر اٹھا کے دیکھا اور بناء کچھ کہے اپنی جگہ سے ذرا سا کھسکے، گویا اسے بیٹھنے کی دعوت دے رہے ہوں۔ اسرار خاموشی سے ان کے پاس بیٹھ گیا۔ چڑیوں کا جوڑا، اسرار کے بیٹھتے ہی پھر ّ امار کے کہیں جنڈ کی شاخوں میں غائب ہو گیا۔

بھوریوں کی حد سے، جنڈ کے کنج تک خاموشی تھی۔ اسرار نے کچھ بولنا چاہا لیکن اس کی آواز حلق میں مچھلی کے کانٹے کی طرح پھنس گئی۔ آخر وہ یہاں ان نفرت انگیز لوگوں میں کیوں آیا تھا؟ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ کون ہیں؟ یہ وہ لوگ تھے جو فنا کی آواز سن چکے تھے، جنہیں کسی نہ کسی طرح یہ پیغام مل گیا تھا کہ فنا قریب ہے اور وہ اس فنا سے ہاتھ ملا چکے تھے۔ یہ سب جاننے کے باوجود وہ اپنے جیسے لوگوں کو چھوڑ کے ان لوگوں میں کیوں آیا تھا؟ میاں اللہ یار تو اس کا باپ بھی نہ تھا۔ پھر بھی اس کے مرنے پہ ساری مٹھی کیوں کھل گئی؟

ہوا میں آتی سردی کی تنہائی تھی اور مسجد کے لاؤڈ سپیکروں پہ کوئی اعلان بار بار نشر ہو رہا تھا۔ باؤ اسرار، اس اعلان کو سننا ہی نہیں چاہتا تھا اس نے اپنی نظریں ریت پہ گاڑ دیں اور ہوا کے چلنے سے بننے اور بگڑنے والی لکیروں کو اتنا گھورا کہ آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔

عرفان صاحب نے بھی وہ اعلان سنا اور پھر وہ ایک وحشت کے عالم میں ریت کھود کھود کے کچھ گڑھے، کچھ ٹیلے بنانے لگے۔

''جب مجھے کہا گیا کہ ہم مغربی دریاؤں کا پانی مشرقی دریاؤں میں ڈالیں گے، تو مجھے خوف محسوس ہوا، پھر یہ خوف بڑھتا گیا اور اس دہشت نے میرا رنگ جلا دیا، مجھے ختم کر دیا، یہ دیکھ رہے ہو، یہ کیا ہے؟''

اسرار اپنے سامنے بنے ٹیلوں اور گڑھوں کو گھورتا رہا۔ یہ پہاڑ تھے اور دریا اور ڈیم۔ اسرار کو بغیر سمجھائے بھی سب کچھ سمجھ آ گیا۔ اس نے ترحم آمیز نظروں سے عرفان صاحب کو دیکھا اور اونچی آواز سے جیسے کسی تیسرے سے بولا۔

''اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا!!''

اس جملے نے عرفان صاحب کو ریت کی بھربھری دیوار کی طرح ڈھا دیا۔ اکڑوں بیٹھے ہوئے ان کے دونوں بازو گھٹنوں پہ ٹکے ہوئے تھے۔ یہ جملہ سننے کے بعد وہ بازو ٹوٹے ہوئے جہاز کے مستولوں کی طرح دکھائی دینے لگے۔

اسرار کو ان سے ہمدردی تھی مگر وہ کیا کر سکتا تھا؟

سالہا سال سے مغربی دریاؤں کا پانی مشرقی دریاؤں میں ڈالا جاتا رہا تھا۔ ڈیموں میں موجود مردہ پانی نہروں سے ہوتا ہوا سمندروں میں پہنچتا رہا تھا، یہ سب پوری دنیا میں ہو رہا تھا اس سب کے نتیجے میں کرہ ارض پہ برف

پگھلنے کا تناسب بڑھ گیا تھا، ساری دنیا کا خیال تھا کہ یہ آلودگی کے سبب ہو رہا ہے۔ مگر بند بنانے والے بھول گئے کہ ہمیشہ عظیم تہذیبوں کو دریاؤں کے کنارے ہی پھلتے پھولتے دیکھا گیا اور یہ بھی بھول گئے کہ عظیم تہذیبیں اپنے باندھے گئے بندوں کے پانیوں میں ہی ڈوب کر ختم ہوئی ہیں، وہ یہ بھی بھول گئے کہ اب تمام انسان ایک ہی تہذیب کا حصہ ہیں ایک عظیم تر تہذیب کا حصہ جو لاتعداد دریاؤں کے کنارے آباد ہے اور انہوں نے لاتعداد بند بنا لئے تھے کیونکہ وہ سب کچھ بھول چکے تھے۔

انہیں تو یہ بھی شائد یاد نہیں تھا کہ جب پانی مرنا شروع ہوتا ہے تو زلزلے آتے ہیں اور ان زلزلوں نے ہی وہ عظیم تباہی لائی تھی جو عرفان صاحب کو نظر آ گئی تھی لیکن یہ اس سب کے بہت بعد کی بات ہے جب مچھلیوں نے انسانی گوشت چکھا تھا اور کچھوؤں کی آنکھیں اس خون سے چچیا گئی تھیں۔

اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا، عرفان صاحب ہارے ہوئے جواری کی طرح ریت پہ بیٹھے تھے۔ گوشت خور میمنے جو اب بڑھے بکرے بن چکے تھے،۔ دور، اکانہہ کے جھنڈ میں ایک موٹی گوہ کو گھیرے، کریہہ آوازوں میں ہاں، ہاں کر رہے تھے۔ ہوا میں نحوست اور آنے والی بربادی کے آثار ٹھہرے ہوئے تھے۔

''اگر تم نے بھی کچھ نہیں کرنا تھا، تو اس روز جب آسمان سے مچھلیوں کی بارش برسی ہے، تو اس روز اس روز تمہارے دنیا میں آنے کے سامان کیوں ہوئے تھے؟ وہ سب کیوں ہوا تھا؟''

وہ نڈھال سے اپنے ہی سہارے بیٹھے تھے۔ آسمان پہ چنڈور اڑ رہی تھیں اور کسی کے پاس ان کے سوال کا کچھ جواب نہ تھا۔ مدھو، منظور کی لڑکی، دادی اور باقی سب، جو جنڈ کے جھنڈ سے نکل آئے تھے، خاموش کھڑے تھے۔ سب سے زیادہ شرمندہ منظور کی لڑکی تھی۔

اسرار نے اسے نظر بھر کے بھی نہ دیکھا تھا اور وہ ان لوگوں کی مدد کرنے پہ بالکل بھی آمادہ نہ تھا اور اس سب کی وجہ وہ خود ہی تھی۔ اس نے اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے سر کے سنہری بال سمیٹے اور گھسٹتی ہوئی تالاب والی کچی میں چلی گئی۔ جہاں جل کنبھیوں والے تالاب میں نیم دراز ہو کے وہ تا دیر روتی رہی۔ یہ اسرار کیسا آدمی تھا؟ اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا؟ کیا اسے معلوم نہ تھا کہ جب دریا بپھرے گا تو کیا ہوگا؟ اور جب، وہ سب ہوگا تو کوئی بھی نہیں بچے گا اور جو بچے گا۔ اس سے اسرار کا رشتہ کیا ہوگا؟ کیا اسرار کو یہ سب معلوم نہ تھا؟ اگر اسے یہ سب معلوم نہ تھا تو آخر سالوں اس کا انتظار کیوں کیا گیا؟

رات بھوریوں پہ چھائی، ذخیرے پہ اور گاؤں پہ۔ راستے کی تاریکی ایک گاڑھے دھوئیں، آکٹوپس کی سیاہی کی طرح سب طرف پھیلتی گئی اور گاؤں والوں کی لمبی زبانیں اپنے اپنے دہنوں میں خوابیدہ سانپوں کی طرح کنڈلی مارے پڑی رہیں۔ محسن اب میاں اللہ یار کا غیر اعلانیہ وارث تھا اور اسرار ایک بھگوڑا، گاؤں کے لوگ جنگ جیت جانے کے بعد کی بے خودی میں سرشار، اپنی اپنی دھوتیاں اور چنیاں اوڑھے سو رہے تھے۔ صرف دریا بہہ رہا تھا۔ خاموشی اور وقار سے اس کا ارادہ کیا تھا؟ کون جانے؟

(۳۱)

اسی رات نازنین کے ہاں، لندن کے ایک ہسپتال میں لڑکی پیدا ہوئی ڈاکٹر اگرچہ بہت سیانی اور سمجھ دار تھی۔ لیکن اس کی نیلی آنکھوں سے جھلکتے خوف نے نازنین کو بہت کچھ سمجھا دیا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب ہی ہوگا، اسی لیے اس رات کے بعد اس نے اسرار سے ملنے کی کوشش نہ کی تھی۔ وہ جانتی تھی مگر ایک امید تھی کہ شاید، شاید وہ سب نہ ہو، لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے؟

نازنین کی لڑکی بھی جل پری تھی۔ ہسپتال والوں نے اپنی پیشہ ورانہ دیانت داری سے کام لیتے ہوئے منہ سی لیے مگر نازنین کا کم عقل شوہر نیم پاگل سا ہو گیا۔ کبھی اپنا سر پیٹتا تھا اور کبھی بچی کو دیکھتا تھا۔ جس کی گول گول کنچوں جیسی آنکھوں میں حیرانی تھی۔ صرف حیرانی اور سر پہ سمندری گھاس جیسے سنہری بال تھے۔

اسے یقین تھا کہ یہ اس کی کاروباری بدعنوانیوں کا عذاب ہے، جو اس بچی کی صورت اس کے گھر پیدا ہوا ہے کبھی اپنے ہاتھ کاٹتا تھا، کبھی خود کو چٹکیاں لیتا تھا کہ شاید ہوش میں آجائے اور یہ سب ایک خواب ہو۔ مگر حقیقت تلخ ذائقے کی طرح وہیں کی وہیں تھی۔

ہسپتال سے گھر آنے کے بعد کئی دن تک نازنین کا میاں جائے نماز پہ بیٹھا رو رو کے اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔ کس کس طرح اس نے اپنے روپے کو بڑھانے کے لیے دوسروں کا معاشی قتل کیا تھا، آگے بڑھنے کی دوڑ میں، ساتھ چلنے والوں کو کچلا تھا، سربلندی کی خواہش میں، درست کو غلط اور غلط کو درست کہتا آیا تھا۔

نازنین خاموشی سے اسے دیکھتی رہتی تھی۔ جب اسے معلوم تھا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے، غلط ہے، تو اس نے وہ سب کیوں کیا؟ اور اب وہ کیا چاہتا تھا؟ معافی سے اس کا مطلب کیا تھا؟ یہی کہ وہ بچی مر جائے؟

نازنین بچی کی گول کنچوں جیسی آنکھیں، ننھے سے دہانے اور گلابی گالوں کو دیکھتی رہتی تھی اور جب کبھی اس کی نظر، اس کے زیریں بدن کے چانوں پہ پڑتی تھی تو اسے ان میں ہزار ہا رنگوں کی جھلک نظر آتی تھی جو اس رات، چاند کی طرف بلند ہونے والے پرندوں کے پروں میں عیاں تھے۔

ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اس قسم کے بچے لاکھوں کروڑوں میں کوئی ایک جنم لیتے ہیں۔ لیکن ان کی صرف دونوں

ٹانگیں آپس میں جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ جبکہ اس بچی کے جسم پر چانے اور ہاتھوں کی انگلیوں کے درمیان جھلی بھی ہے۔

یہ ہی نہیں، اس کی دم بھی تھی۔ بالکل فلمی کہانیوں کی جل پری۔

گھر آنے کے تیسرے روز نازنین نے دیکھا کہ اس کا شوہر گوشت کاٹنے کا بغدہ لیے بچی کے پنگھوڑے کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کے چہرے پہ نیند میں چلنے والے شخص کے سے تاثرات ہیں۔

نازنین نے دوڑ کر اسے راستے ہی میں جالیا۔ پکڑے جانے پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور قسمیں کھانے لگا کہ اسے خواب میں ایک سیاہ پوش آ کر کہتے رہے ہیں، یہ بچی دنیا پہ عذاب لے کر آئی گی، اس لیے اسے مار دو۔ مسلسل تین راتوں سے وہ یہ ہی خواب دیکھ رہا تھا اور آج مجبور ہو کر اس حکم کی تعمیل کرنے آ گیا تھا۔

نازنین کو کچھ حیرت نہ تھی ظاہری سی بات تھی انسان کی سرشت ہی یہ ہی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ زمین صرف اس کے لیے بنی ہے۔ باقی تمام چرند، پرند، نباتات، جمادات، صرف اس کے فائدے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ وہ ہر شے میں صرف اپنا مفاد دیکھتا ہے اور ہر وہ شے، جو اسے اپنی حکمرانی کے راستے میں رکاوٹ نظر آتی ہے اسے ختم کر دیتا ہے چاہے وہ بلند پہاڑ ہوں، یا بہتے دریا۔ اس کا بس چلے تو سمندروں کو خشک کر دے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس کا بس نہیں چلتا۔

بجلی کی روشنی میں سٹین لیس سٹیل کا بغدہ جگر جگر کر رہا تھا۔ بچی اپنے پنگھوڑے میں سکون سے لیٹی ہوئی تھی۔ بے ضرر، معصوم، بے خبر۔ بغدے کے ایک ہلکے سے وار سے وہ ختم ہو سکتی تھی اور اس کے ساتھ ہی خوف کی وہ کہانی، جو اس رات اسرار کے ساتھ ان کوٹھیوں میں جانے سے شروع ہوئی تھی۔ نازنین نے اپنے ٹھگنے شوہر کو دیکھا جو گھٹنوں کے بل جھکا زار و قطار رو رہا تھا۔

اسرار اب کہاں ہوگا، لیکن وہ جہاں بھی ہوگا، اس بچی کا وہیں پہنچنا بہتر تھا مگر نازنین دوبارہ اسرار سے نہیں ملنا چاہتی تھی۔ اسی کشمکش میں اس نے ایک فیصلہ کیا اور اپنے شوہر کی طرف بڑھی۔ جو ابھی تک ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ خدا آدم زادوں پہ فیصلے کے اتنے بڑے بوجھ کیوں لادتا ہے؟ وہ تو پہلے ہی بقاء کی تنی ہوئی رسی پہ بمشکل چلے جا رہے ہیں۔ وہ رسی جو وادئ فناء پہ تنی ہے۔ اس سفر کا مقسوم فنا ہے فنا!

خدا اور انسان
خدا وسیلہ

(۳۲)

محسن سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسرار اتنی آسانی اور خاموشی سے اس کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ رسہ کشی کی کھیل میں مقابل کے اچانک رسی چھوڑ دینے سے جیسے کوئی چاروں خانے چت جا گرے، اسی طرح محسن اسرار کی چھوڑی ہوئی چارپائی پہ دھریکوں کے نیچے بیٹھا رہتا تھا۔ دھریکوں کی ٹہنیاں اب کالی پڑ چکی تھیں اور ان پہ ایک پتا بھی نہیں تھا، فقط ڈوڈیوں کے گچھے۔

میدانی علاقوں کی ٹھنڈ سب طرف اپنے قدم جما چکی تھی اور محسن نے پہلی بار رزمے کی پوری فصل کی وصولی کی تو اس کے پیر ڈگمگا گئے۔ اتنے سارے روپوں کا وہ کرے گا کیا؟ چھوٹے چاروں نکھٹوؤں کو ان کی ضرورت سے زیادہ دینے کے باوجود اس کے پاس بہت پیسے تھے۔

وہ دل ہی دل میں میاں اللہ یار کو گالیاں دیتا تھا۔ بڈھے نے ساری زندگی اسے ٹکے ٹکے کے لئے ترسایا۔ سارا روپیہ اپنی انٹی میں رکھا، یا پھر اس نامرد، بڑھاپے کی پیدائش اسرار پہ لگایا جو آج پٹے ہوئے کتے کی طرح دم چوتڑوں میں دبائے، بھوریوں کی طرف فرار ہو گیا تھا، ''خصی کہیں کا!''

وہ پلنگ پہ پڑا پڑا قہقہے لگایا کرتا تھا اپنی فتح اور اسرار کے فرار پہ۔ اسے یہ سوچ کر بھی بہت خوشی ہوتی تھی کہ آج اسرار ان ہی بھوریوں میں پناہ گزین ہے، جن کو ختم کرنا اس کا منصوبہ تھا۔ یہاں آ کر وہ پھر میاں اللہ یار کی ماں بہن کو چیدہ چیدہ گالیوں سے نوازتا کہ آخر اتنا روپیہ ہونے کے بعد اسے بھوریوں کو آباد کرنے کی کیا موت پڑی تھی؟ پھر وہ مینے کی موت پہ کچھ افسردہ ہوتا، لیکن یہ سوچ کر صبر کر لیتا کہ اچھا ہوا، راہ کا ایک کانٹا اور کم ہوا۔ اس سے آگے نہ اس نے کبھی سوچا اور نہ وہ سوچنا چاہتا تھا۔ اسے یاد تو تھا کہ میاں اللہ یار کسی چیز سے خوفزدہ تھا، لیکن وہ اس بات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت سے محروم تھا۔

اسے ذخیرے میں پیش آنے والے واقعات، فضل بی بی کی پراسرار موت، مینے کے قتل اور بھوریوں میں رہنے والوں کا علم تھا لیکن یہ سب اس کے لئے کچھ خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ جس طرح ایک اوسط ذہانت کا تھانے دار ایک جیسے بہت سے لاینحل جرائم کو ایک ہی فائل میں اکٹھا کر کے داخل دفتر کر دیتا ہے، اسی طرح محسن نے ان

حادثات کو اپنی ذہن کے پچھلے حصے میں پھینک دیا تھا۔ اس نے تو اس بات کو بھی اہمیت نہ دی تھی کہ پچھلی کوٹھڑی سے اب قریباً روزانہ سانپ نکلتے تھے۔ یہ لمبے اور کلائی جتنے موٹے۔ ان کا سیاہ رنگ اتنا چمکدار ہوتا تھا کہ آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔

یہ سانپ سراسیمہ سے انسانوں سے تعرض کیے بنا صرف وہاں سے نکل کر باہر بھاگتے تھے۔ سب سے پہلے یہ ناگ شاماں نے دیکھے۔ وہ چپ رہی، پھر کمو نے اور آخر جنت بی بی نے۔

کچھ عرصے میں پورے گاؤں اور ادھر ادھر شاملات دیہہ میں یہ بات پھیل گئی کہ میاں اللہ یار کے ڈیرے سے سانپ نکل نکل کر بھاگ رہے ہیں۔

کہنے والوں نے کہا کہ انہوں نے بھوریوں کی طرف جانے والے راستوں پر سانپوں کے نشان دیکھے ہیں۔ لیکن محسن کو اس بات کی کوئی پرواہ نہ تھی۔

وہ دن رات اپنی فتح کے نشے میں چور، نرے کے پیسے گنتا اور کماد کی ٹوٹیاں ٹٹولتا، شوگر مل والوں سے ایڈوانس پیسے لینے کے منصوبے بناتا، اسرار کے چھوڑے ہوئے پلنگ پہ چوڑا ہوا بیٹھا رہتا۔

ان ہی نشیلے، سردنوں میں گڑ کی چائے پیتے ہوئے اس نے سنا کہ شاماں امید سے ہے اور اسے اچھو لگ گیا، اسی طرح جیسے میاں اللہ یار کو لگتا تھا۔ کھانس کھانس کے اس کا گلا چھل گیا اور پھیپھڑوں میں مرچیں سی بھر گئیں۔ بڑی مشکل سے کھانسی تھمی تو اس نے خبر لانے والی کمو نائین کو گھور کے دیکھا۔

''پانچواں مہینہ ہے، پکی ہے پوری، اسے پتا تھا، مینے کے مرنے پہ بھی لیکن کسی کو نہیں بتایا''۔

محسن کو اچانک شدید خوف محسوس ہوا۔ اسے لگا کہ شاماں کے پیٹ میں بالکل مینے کی شکل کا کانا فیتس کلکاریاں مار مار کے ہنس رہا ہے، ٹانگیں اچھال رہا ہے اور اپنی بند مٹھیوں سے ہوائی مکے چلا چلا کر اسے للکار رہا ہے۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ سامنے کھڑی کمو نائین بھی بجھائی نہیں دے رہی تھی۔ اب کیا ہوگا؟ یہ سوال بڑا سا پھن کاڑھے گھنی کوٹھڑی سے نکلے کالے ناگ کی طرح اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

کمو نائین مستفسرانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ذرا ہی دیر میں اس نے اپنے اندر کے خوف پہ قابو پا لیا اور بالکل میاں اللہ یار کے انداز میں عیاری سے رونے لگا اور اس بات پہ ماتم کرنے لگا کہ اس کا بھائی مینا، اولاد کی خوشی دیکھے بغیر اس دنیا سے چلا گیا۔

سردیوں کی اس شام میں جب شام ہی اتنی ٹھنڈی تھی کہ رات میں کہرا پڑنے کا قوی امکان تھا، محسن کے رونے کی آواز نحوست زدہ بلی کے بین کی طرح گاہے گاہے ابھر رہی تھی۔ کمو کو حیرت ہوئی کہ محسن، جسے سب بہت ہی برا سمجھتے تھے، اپنے مرحوم بھائی سے اتنا پیار کرتا تھا؟

اسے وہیں روتا سسکتا چھوڑ کے کمو ڈیرے کی طرف چل پڑی۔ جانے کیوں اسے بہت سال پہلے کی ایک رات یاد آ گئی، جب فضل بی بی کے ہاں اسرار پیدا ہوا تھا۔ خوف کی ایک سرد لہر اس کے پہلے سے ٹھٹھرے وجود میں

دوڑ گئی۔

اس رات جو بھی ہوا تھا، وہ اسے آج بھی نظروں کا دھوکا لگتا تھا۔ بھلا ایسا ممکن ہے؟ اس نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا اور سڑک پہ مہاوٹیں نہ برسنے سے اڑنے والی گرد میں پیر جما جما کر چلنے لگی۔

اس رات جو کچھ ہوا تھا، وہ شائد اس کے، نباں دائی اور میاں اللہ یار کے درمیان ایک ایسا مشترک راز تھا، جسے لئے لئے میاں اللہ یار قبر میں جا سویا لیکن کمو کو آج بھی وہ سرد رات یاد تھی جب ڈیرے میں گیلی سوکھی لکڑیوں کو پھونکتے ہوئے وہ فضل بی بی کی زچگی کے لئے پانی گرم کر رہی تھی۔ کوئی کوئی لکڑی چٹختی تھی تو چنگاریوں کی پھلجھڑی سی چھوٹ جاتی تھی۔ ایک بالٹی پانی وہ اندر پہنچا آئی تھی اور دوسرے تاملوٹ کے لئے آدھی ولٹوہی ابھی چولہے پر تھی کہ نباں ہونٹ سفید کئے لرزتی کانپتی اس کے پاس آئی۔

خوف کے مارے اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی اور سوت کے کرتے میں وہ ایسے کانپ رہی تھی جیسے اکانہہ کی شاخ آندھی سے لرزتی ہے۔

بغیر کچھ کہے سنے وہ کمو کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر کوٹھڑی میں لے گئی جہاں فضل بی بی زچگی کے بعد کی نیم بے ہوشی میں پڑی تھی۔ کمرے میں کچے کچے خون کی بو تھی اور پلنگڑی کی پائنتی وہ بچہ کورے کھیس میں لپٹا پڑا تھا۔ وہ بچہ جو اسرار تھا۔

کمو نے چلتے چلتے سر اٹھا کے بھوریوں کی طرف دیکھا اور ایک انجانے خوف سے اس کے چہرے کے روئیں خوفزدہ بلی کے بالوں کی طرح کھڑے ہو گئے اور بالائی ہونٹ پہ پسینہ پھوٹ پڑا۔ وہ وہیں پکے کھال کی پلی پر ستانے کو بیٹھ گئی۔ اب تو اکثر ایسا ہوتا تھا۔ وہی کمو جو ڈیڑھ من کی بوری کندھوں پہ اٹھا کے پانچ میل دور چکی پہ پسوانے کو لے جاتی تھی اور نہ اس کا سانس پھولتا تھا اور نہ ہی چال بگڑتی تھی اسی کمو کو اس رات کے بعد گود کے اسرار کا وزن بھی کھلنے لگا تھا۔

ذرا سا وزن اٹھا لیتی تھی تو لگتا تھا پھیپھڑے ہوا سے خالی ہو گئے ہوں۔ بکری کے لئے چارے کی ننھی سی گٹھڑی بھی اٹھانی پہاڑ ہو جاتی تھی۔

انسان کی روح پہ اگر کوئی وزن لدا ہوا ہو تو اس کا جسم بہت سے وزن اٹھانے سے انکار کر دیتا ہے۔ کمو کے بازؤں نے تو باؤ اسرار کا وزن اٹھانے سے پہلے دن ہی انکار کر دیا اور پھر آہستہ آہستہ کتنے بہت سے بوجھ اس کے کندھوں سے سرکتے گئے لیکن یہ بوجھ سرکنے سے اسے کوئی طمانیت نہیں ملی۔ کیونکہ دیہات میں رہنے والی ایک عورت جب وزن نہ اٹھا پائے تو اس کی آدھی زندگی بے کار ہو جاتی ہے۔ لیکن جو وزن کمو اٹھا رہی تھی، شائد سارا گاؤں بھی نہ اٹھا سکتا۔

کمو نے آنکھیں سکیڑ کے بھوریوں کی طرف دوبارہ نظر ڈالی اور گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے اٹھی۔ دائیں ہاتھ کے کھیت میں ماش کی فصل تیار کھڑی تھی۔ کمو کے اٹھتے ہی کھیت میں سن سن کر کے کچھ ہوا۔ کمو بے پروائی سے کھڑی رہی

۔اسے معلوم تھا، ماش کے کھیت میں ناگ ہی ناگ تھے۔ بھوریوں کو جاتے ہوئے سنانے کو رک گئے تھے۔ یوں بھی اس موسم میں وہ وبائی سے باہر نکلے تھے تو کوئی آفت ہی آئی تھی، جیسے کسی عورت کے رحم سے آنول نال ٹوٹ کے نکلنے لگے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اب بچے کا جسم سے رشتہ غیر فطری طور پہ ختم ہونے والا ہے۔ اتنے سرد موسم میں تو سانپ اپنا بل کبھی بھی نہیں چھوڑتے۔

بلی سے اٹھ کے کوڈیرے کی طرف جانے کی بجائے بائیں ہاتھ کی پگڈنڈی پہ ہولی۔

بکری والے واقعے کے بعد سے ذخیرے کی طرف خال ہی کوئی جاتا تھا۔ ایک دو بار، سرکاری کارندے لکڑی کٹوانے آئے، لیکن انہیں بھی آس پاس کے کسی دیہات سے کسی قسم کی مدد نہ ملی۔ نہ ہی کوئی مزدور وہاں آنے پر آمادہ ہوا اور نہ ہی گاؤں والوں نے درختوں کے چھاپوں کے لئے دلچسپی ہی دکھائی۔

سرکاری کارندے بھی آسمان سے تو نہ ٹپکے تھے۔ ظاہر ہے، بیلدار تو ادھر ادھر کے دیہاتوں ہی کے تھے۔ ایس۔ ڈی۔ او، وغیرہ نے بھی سب کی بددلی دیکھتے ہوئے زیادہ زور نہ دیا۔ نہ کبھی گھاس کاٹی گئی نہ شہد اتارا گیا۔ درختوں کی ٹہنیاں، تیز ہوا میں تھوڑی چٹاخ پٹاخ ٹوٹتیں، گھاس کے فرش پہ گرتیں، ان پہ کائی اور مٹی کی تہیں جمتی جاتیں۔ گھاس بڑھ کے انہیں ایسے ہی ڈھانپ لیتی، جیسے بے آباد قبرستانوں میں قبروں کے تعویذ گھاس کے سمندر وں میں ڈوب جاتے ہیں۔

اب یہ ذخیرہ، عام سرکاری ذخیروں سے فرق ہو گیا تھا۔ یہاں کے درختوں کے تنے زیادہ موٹے، زیادہ سیاہی مائل کالے ہو گئے تھے۔ یہاں اگنے والی دب زیادہ گھنی اور شاید زیادہ روپہلی ہو گئی تھی کیونکہ سرکاری پانی کا کھال جو دیکھ بھال نہ ہونے سے جگہ جگہ سے مٹی سے اٹ گیا تھا، اس کا پانی کناروں سے چھلک چھلک کے گھاس کے میدانوں کو سیراب کر رہا تھا اور کہیں کہیں اس کا پاٹ راجباہ جتنا چوڑا ہو گیا تھا۔

اس کھال کے کنارے جو دب اگ رہی تھی اسے دور سے دیکھ کر لگتا تھا کسی ماہر فن کار نے چاندی کے پھول بنا کے سرکنڈوں پہ جڑے اور یہاں لگا دیئے، لیکن کون عکاس ہے جو اپنی محنت کے پھول یوں ویرانوں میں لگا دے سوائے مصورِ قدرت کے، جس نے اپنی صناعی ویرانوں کے لئے مخصوص کر رکھی ہے۔

ذخیرے کا معاملہ کم و بیش بھوریوں والا ہی ہو گیا تھا۔ سالوں سے کسی انسان نے قدم نہ رکھا تھا۔ درختوں پہ بڑ باٹیں اتنی لٹکتی تھیں اور جانے کہاں کہاں سے طوطے، ہریل، جنگلی کبوتر اور شکر خورے آ آ کر رہنے لگے تھے۔

آسمانی بجلی سے جلے ہوئے کسی کسی درخت پہ چیل کا گھونسلہ بھی دکھائی دے جاتا تھا۔ شہد کی مکھیوں کے غول کے غول بیریوں، کیکروں اور بیلیوں کے پھولوں پہ اترتے تھے۔ درختوں پہ اتنے بھاری بھاری چھتے لٹکتے رہتے تھے، جن میں شہد کی بہتات تھی اور اس قدر تھی کہ ان سے ٹپکنے والا شہد درختوں کی جڑوں پہ گر رہا تھا۔ سنا ہے کہ چاندنی راتوں میں شہد کی مکھیاں عارضی ٹھکانوں پہ بنائے گئے چھتوں سے شہد نکال کے اڑ جاتی ہیں۔ اسی لئے چاند کی چودھویں سے پہلے پہلے شہد اتارنے والے نظر میں رکھے سب چھتے خالی کر لیتے ہیں۔

لیکن ذخیرے کی مکھیوں کو کوئی پروا نہ تھی اور نہ ہی یہ ٹھکانا عارضی تھا، وہ بے فکری سے شہد بناتی تھیں۔ ملکہ مکھی نیم شفاف موم کے ہشت پہلو خانے میں انڈا دیتی تھی اور اسے سفید موم سے ڈھانپ دیا جاتا تھا۔

ملکہ مکھی کو تخلیق کا جنون تھا اور سارا چھتہ اس کی تخلیق کی بقاء کے لئے سرگرم تھا۔ یہ تو صرف انسانوں میں ہوتا ہے کہ نو مہینے تخلیق کی سولی پہ چڑھنے کے بعد، سارا شہد، سارے انڈے بچے، مرد لے جاتا ہے اور عورت خالی چھتے کی طرح ویران رہ جاتی ہے اس کا تو نام بھی بچے کے ساتھ نہیں لگتا۔

خیر، انسان تو یہاں اس ذخیرے میں قدم رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ فرش پہ گھاس میں چوہوں کے بل تھے اور پانی کے کھالوں میں گوہیں تیرتی تھیں۔ ننھی، ننھی مچھلیاں، نہری پانی کے ساتھ بہتی چلی آتی تھیں اور ان ہی کے ساتھ ایک بوڑھا کچھوا جو نئی رابطہ نہریں کھدنے اور دریاؤں کے سوکھ جانے سے دربدر ہو گیا تھا، یہاں آ گیا تھا۔

اس کچھوے کی عمر سو سال سے اوپر ہی ہو گی اور یہ ان کچھوؤں میں سے تھا جنہوں نے اول اول انسانی خون چکھا۔ ایسا ہے کہ پانی کے جانور سب کچھ کھاتے ہیں۔ گھاس بھی، حشرات بھی، مرنے والے دوسرے جانور بھی اور دریاؤں میں بہا دئے جانے والے مردہ انسان اور جانور بھی۔

لیکن وہ جو طبعی موت مرتے ہیں، ان کی بہائی ہوئی لاشیں، ست اور بوڑھے جانور ہی کھاتے ہیں۔ رستے ہوئے جوان خون والی لاشیں تو فسادات اور آفات میں ہی نصیب ہوتی ہیں۔ انسان اپنے مرنے والوں کا بڑا احترام کرتا ہے لیکن جب سوچ لیتا ہے کہ مرنے والا، اپنا نہیں، پرایا ہے تو پھر اس سے بڑا وحشی کوئی نہیں ہوتا۔

اس کچھوے نے جب انسانی خون چکھا اور مانس کا ماس کھایا تو اسے ہری ہری سوجھی۔ وہ جس دلدلی پوکھر میں پیدا ہوا تھا، دریا وہاں سے آدھا میل سے بھی کم کی دوری پہ تھا اور بارش میں جب دریا کا پاٹ میل، میل ادھر ادھر پھیل جاتا تھا تو تب یہ پوکھر بھی کناروں سے چھلکنے لگتا تھا اور جل کھمبیوں کے ڈنٹھل، کاسنی ٹے، ہرے پتے، سب ٹوٹ کے پانی کے دھارے میں بہہ جاتے تھے۔ اسی پانی میں بہہ کر یہ کچھوا بھی کئی ہیڈ ورکسوں سے ہوتا، نہروں سے بہتا، موگھے گزارتا، یہاں اس نالے میں آ گیا تھا اور یہاں ذخیرے میں اس نے دوسری بار انسانی خون چکھا۔

غفور آرے والے کو مارنے والے دونوں مینے ایل من اور بلبل من اسے آدھا ادھڑا چھوڑ کے، اچھلتے کودتے، جانے کہاں چلے گئے۔ تب اس کچھوے نے کھالے سے سر نکالا تھا اور سرخ خون کی خوشبو پہ لپک کے آیا تھا۔ اسی وقت تین آدمی، کلہاڑیوں سے مسلح غفورے کی لاش کو بچانے آئے تھے۔ یہ وہی تینوں تھے جو مینے کے ساتھ آئے تھے اور پیچھے رہ گئے تھے۔ ان کو غفورے کی لاش نظر آ گئی تھی اور کچھ سوچ کے وہ آدھے راستے سے پلٹ آئے تھے۔

گاؤں والوں کو ان کا پتا نشان تک نہ ملا کیونکہ ان تینوں کو مار کے کھانے والے اس ذخیرے میں بہت تھے۔ انسان کے پاس سوائے اس کی بدفطرتی کے اور کیا ہتھیار ہے؟ نہ ناخن ہیں، نہ لمبے دانت، نہ وہ چیتے کی طرح دوڑ سکتا ہے۔ نہ بھیڑیئے کی طرح پھاڑ کے کھا سکتا ہے۔

جب اس کی بدی اس کا ساتھ چھوڑتی ہے تو عناصر اسے آسانی سے ہڑپ کر جاتے ہیں۔ یہ ہی ان تینوں کے

ساتھ ہوا۔ وہ غفورے کی لاش کو جانوروں سے بچانے کے لئے آئے مگر جانے کیوں شہد کی مکھیاں، چراغ پا، ہو کر ان پہ حملہ آور ہو گئیں۔ تینوں تڑپتے رہے اور راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے کھال میں گر گئے تب اس کچھوے نے ان چاروں کو کھایا۔

کمو تائین کچھ نہیں جانتی تھی، نہ ہی ان تینوں کی موت کا حال اور نہ ہی اسے یہاں رہنے والے جانوروں سے کچھ غرض تھی۔ مگر سارے گاؤں میں ایک وہی تھی جو بکری والے واقعے کے بعد بھی یہاں آتی تھی، اس کی مجبوری تھی۔ وہ بوجھ جو اس نے اس رات اٹھایا تھا، وہ بچہ، جو بڑا اسرار نہ تھا اور میاں اللہ یار کے ہاں پیدا ہوا تھا۔

اس بچے کو اس کے اور دائی کے سوا کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ نہ فضل بی بی نے، نہ ہی میاں اللہ یار نے۔ اس بچے کو کمو، دائی سے یہ کہہ کر لے آئی تھی کہ وہ اسے مار کے ذخیرے میں دبا دے گی۔ دائی جہاندیدہ تھی، ہزاروں بچے جنائے تھے۔ اسے معلوم تھا دنیا میں آنے والا ہر بچہ عام نہیں ہوتا۔ درجنوں نہ سہی چند بچے اس نے ایسے ضرور جنائے تھے جو اتنے عجیب الخلقت تھے کہ انسان لگتے تھے نہ جانور۔

ایک بچہ، گھوڑے اور انسان سے مماثلت رکھتا تھا، ہاتھوں کی جگہ کھر، نتھنے بھی گھوڑے جیسے اور کان کھوپڑی پہ۔ سوا اس کے کہ اس کی کھال انسان کی تھی، باقی کسی بھی قسم کی انسانی خصوصیات نہ تھیں۔

اسی طرح ایک بچہ، ایسا تھا جس کا دل جسم سے باہر تھا۔ تین بار ڈاں اور دوسرا والے تو چار بچے جنائے تھے۔ لیکن سالوں کے تجربے سے اس نے یہ سبق سیکھا تھا کہ ان بچوں کو، جنہیں قدرت شائد کسی عجلت میں انسان کی بجائے کچھ اور بنا گئی (قدرت کیا کرنا چاہتی تھی، اس کے لئے نیاں دائی سے مشاورت قطعاً ضروری نہ تھی) انہیں زندہ رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

ماں باپ کے لئے بھی ایک مسلسل ذہنی عذاب اور خود بھی وہ کیسے جئیں گے؟ اور اگر جی بھی لیں گے تو کیا فائدہ ایسی زندگی کا جس میں اپنے جیسا دوسرا کبھی دکھائی نہ دے؟

اسی سوچ کے تحت اس نے باہر آ کے اعلان کیا کہ بچہ وچہ کچھ نہیں تھا ٹھنڈا پھوڑا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ جنت بی بی سے خاموش عہد وفا نبھاتے ہوئے میاں اللہ یار کی مردانگی کو بھی رگید ڈالا تھا۔

کمو ذخیرے میں داخل ہونے سے پہلے ذرا سا جھجکی، اسے یہاں آتے آتے اتنے برس ہو گئے تھے مگر اب بھی اسے لگتا تھا کہ ذخیرے کے بارے میں اڑائی جانے والی ساری خبریں سچی ہیں اور یہاں آنے والا کبھی زندہ بچ کے نہیں جا سکتا۔

اس نے درختوں کے اس قطعے پہ نظر ڈالی جو تا حد نظر پھیلا ہوا تھا۔ ٹھٹھری ہوئی دھوپ میں سدا بہار درختوں کے درمیان، خزاں کے مارے درخت، ٹنڈ منڈ کھڑے تھے۔ کمو نے کان لگا کے سنا، سرکاری کھال میں پانی بہنے کی مدھم ترل ترل سنائی دے رہی تھی۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔ پانی نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

گرے ہوئے زرد اور بھوسلے پتوں پہ پاؤں رکھتی، اٹ سٹ اور ٹنے میں الجھتی وہ تھوڑی دیر میں ہی وہاں

پہنچ گئی جہاں سالوں پہلے اس سرد رات میں وہ اسے چھوڑ کے آئی تھی۔

وہ وہیں بیٹھا تھا، ذخیرے کے درمیان اکانہہ کا ایک بہت پرانا درخت تھا، جس کا تنا اندر سے کھوکھلا ہو چکا تھا باہر کی چھال پھٹنے سے ایک قدرتی غار سی بن گئی تھی۔ پھر اسی درخت کے ساتھ ساتھ بالکل جڑ سے لگ کر دو بیریاں پھوٹی تھیں اور ان بیریوں نے بڑھ کے تناور درختوں کی شکل اختیار کر لی تھی اور ان کی شاخیں بید مجنوں کی ٹہنیوں کی طرح اکانہہ کے ٹھنٹھ پہ پرداڈالے ہوئے تھیں۔

ان درختوں کے بالکل قریب سے سرکاری کھال گزر رہا تھا۔ سالوں صفائی نہ ہونے کے باعث پانی کناروں سے دور دور تک چھلک آیا تھا اور ایک قدرتی گڑھے میں بھی بھر گیا تھا جو شائد کبھی کسی گیدڑ کا بھٹ رہا ہو گا مگر اب ایک خاصا چوڑا تالاب سا بن گیا تھا۔

اس تالاب میں وہ بیٹھا تھا، وہ جو فضل بی بی کے ہاں پیدا ہوا تھا اور جسے کمو نباں سے یہ کہہ کے لے آئی تھی کہ آنول نال کے ساتھ ہی مار کے گڑھے میں دفنا دے گی کیونکہ وہ عام انسان نہیں تھا۔ اس کا نچلا جسم مچھلی کی طرح تھا ایک چمکیلی پونچھ اور سرمئی چانوں سے ڈھکا ہوا۔ اس کے ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان جھلی تھی اور آنکھیں دو چمکدار بٹنوں کی طرح روشن تھیں۔

کمو نائین اسے نہ مار سکی۔ ڈیرے سے ذخیرے تک وہ اس کے کمزور وجود کو چادر کے کونے میں لپیٹ کے چوکنے گیدڑ کی سی چال سے دوڑتی ہوئی آئی تھی اور اس نے اس کے ننھے سے دل کی دھڑکن سنی تھی اور اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اپنی گردن پہ رینگتا ہوا محسوس کیا تھا۔ اس کے پتلے پتلے شہابی ہونٹ دیکھے تھے اور ننھی سی زبان دیکھی تھی منے منے کان اور سر پہ سنہری بال۔

کمو نے اسے اللہ توکل یہیں اکانہہ کی جڑ میں چھپا دیا تھا۔ اگر اللہ نے اس کے نصیب میں موت لکھی تھی تو وہ اپنے سر گناہ کیوں لیتی؟

مگر رات بھر اسے نیند نہیں آئی تھی۔ اسرار کہاں سے آیا؟ اور چند گھنٹے کا بچہ اتنا سنبھلا ہوا اتنا صحت مند کیسے ہو گیا؟ ان سب سوالوں کا ہوش تو اسے تب ہوتا جب ایک لحظے کے لیے بھی وہ اسے بھول پاتی۔ رات بھر وہ شنگرفی ہونٹ، انار کے دانے سے دہکتے گال اور چمکتی آنکھیں اسے بلاتی رہیں۔

صبح ہوتے ہی وہ باہر بیٹھنے کے بہانے سے ذخیرے کو بھاگی۔ حالانکہ جتنی ٹھنڈ پڑ رہی تھی اور ذخیرے میں جس قدر حشرات اور جانور تھے ان کی موجودگی میں کسی نومولود کا بچ جانا قریباً ناممکن تھا۔ لیکن کمو دل ہی دل میں دعائیں مانگتی، کلمے پڑھتی ذخیرے کی طرف جا رہی تھی جب وہ وہاں پہنچی تو اس نے دیکھا کہ ہری گھاس کے فرش پہ وہ اسی طرح لیٹا کلکاریاں مار رہا ہے، جیسے دو ایک ماہ کا بچہ۔

اس سے پہلے کہ کمو اس تک پہنچتی وہ جیسے پھسلتا ہوا سرکاری کھال کے کنارے تک پہنچا اور پھر سرک کر اس میں جا گرا کمو کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ لیکن یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی کہ نہر کے گدلے پانی میں وہ ایک ٹیڈپول کی

سی تیزی سے فر فر تیر رہا تھا۔ پھر اس نے سر اٹھا کے اسے دیکھا اور مسکرایا، ایک سمجھدار بچے کی معصوم مسکراہٹ۔ جیسے گائے بکری کا دن بھر کا بچہ۔ انسان کے بچے کی طرح وہ لاچار نہ تھا۔ کمو اپنی جگہ کھڑی کھڑی خوف سے کانپتی رہی۔ یہ اس نے کیا کیا تھا؟ وہ بچہ واقعی بچہ تھا یا کوئی بلا؟ خدا کا عذاب یا کوئی اجنبی مخلوق؟

کمو کا ننھا سا دماغ کچھ سمجھ نہ سکا۔ لیکن کچھ عجیب سے جذبوں سے مغلوب ہو کر اس نے اسے کھال سے نکالا۔ ساتھ لایا ہوا بکری کا دودھ پلایا اور پھر وہیں، اکا نہہ کے ٹھنٹھ میں چھپا کر چلی گئی۔

ادھر باؤ اسرار پل رہا تھا اور ادھر یہ بچہ۔ جس کا نام کسی نے نہیں رکھا تھا۔ کمو کو بار بار دھیان آتا کہ کسی نے اس کے کان میں اذان نہیں دی ہے۔ آدھا ہی سہی، وہ تھا تو انسان اور اس آدھے انسان کے مسلمان ہونے میں کیا کلام تھا؟

یوں تو مسلمان ہونے کی دوسری شرط کے بارے میں بھی اس نے سوچا، ظاہر ہے وہ نسل نائین تھی، لیکن چونکہ وہ مچھلیوں کی اناٹومی سے ناواقف تھی اس لیے بس حیران رہی۔

کبھی کبھی اسے حیرت ہوتی، لگتا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ اسے پانی میں تیرتے دیکھ کے، ایک مچھلی کی طرح کئی کئی منٹ سطح آب کے نیچے غائب ہوا دیکھ کے اپنے بازوؤں پہ چٹکیاں لیتی، دانتوں تلے انگلیاں دباتی کہ اگر یہ خواب ہے تو ٹوٹ جائے۔

مگر وہ بھیانک خواب اس کے سامنے موجود رہتا۔ اس بچے کے لیے اس کے دل میں بیک وقت نفرت، خوف، رحم اور محبت کے جذبات موجزن رہتے۔ ایک لمحے کو اس کا جی چاہتا کہ قریب گری درخت کی موٹی سی شاخ اٹھا کے اس کے ننھے سے سر پہ اتنے زور سے مارے، جتنے زور سے اس نے ایک بار اپنے مرحوم شوہر کی بیاس میں سے پکڑی ہوئی مچھلی کے سر پہ ماری تھی۔ مچھلی زور سے تڑپی تھی اور ساکت ہو گئی تھی۔ پھر اس نے چاقو سے مچھلی کا پیٹ چاک کیا تھا اور اس کے پیٹ سے گلابی گلابی انڈوں کی تھیلی سی نکلی تھی تب وہ بہت گھبرائی تھی۔ لیکن اس کے شوہر نے مسکرا مسکرا کے اور شوہرانہ بدمعاشی سے اترا اترا کے اسے بتایا تھا کہ سب بنی ہوئی باتیں ہیں کہ فلاں مہینوں میں "ر" نہیں ہوتی اس لیے اس میں مچھلی نہ کھاؤ۔ اصل بات یہ ہے کہ ان مہینوں میں مچھلی انڈے دیتی ہے اور یہ انڈے بہت ہی "طاقت" والی چیز ہوتے ہیں۔ کمو بے چاری لڑکی سی تھی، اسے ان باریکیوں کی کیا خبر تھی۔ اس نے اپنے میاں کے کہے پہ پاؤ بھر دیسی گھی ڈال کے ان انڈوں کو بھون دیا تھا اور بارانی گندم کی لال روٹی جو تندور کے سینک سے دہک رہی تھی، چنگیر میں رکھ کے اس کے سامنے رکھ دی تھی۔

کھانا کھا کے وہ حقہ پینے باہر گیا تھا اور پھر چار کندھوں پہ ہی واپس آیا تھا۔ کمو کی جوانی کا سورج ابھی چڑھا ہی نہ تھا کہ وہ اجڑ گئی۔

گاؤں بھر میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کمو کے شوہر نے سوکھتے ہوئے بیاس کے کسی ٹوبے سے اتنی بڑی سنگھاڑی مچھلی پکڑی تھی اور اس کے پیٹ میں انڈے تھے۔ کمو کسی کو یہ کیوں بتاتی؟ لیکن جب جب وہ اس بچے کو

جس کا کوئی نام نہیں تھا دیکھتی، اس کے دل میں اس رات کی ہیبت تازہ ہو جاتی۔

جانے کیوں اسے لگتا تھا کہ اس عجیب الخلقت بچے کی پیدائش اور اس مچھلی کی موت میں کوئی کڑی مشترک تھی۔ شاید وہ انڈے جو اس مچھلی کے پیٹ سے نکلے، ان کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ آخر کوئی تو وجہ تھی کہ جب دریا سوکھ گیا تو اس کے چھوڑے ہوئے ٹوبوں میں بچی مچھلیاں انڈے دے رہی تھیں۔ ان چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں انڈے بچے دینے کا آخر کوئی تو مقصد ہوگا اور کمو کے شوہر نے اس اہتمام میں خلل ڈال دیا تھا۔

شاید اسی لیے فضل بی بی کے ہاں یہ بچہ پیدا ہوا تھا۔ مگر کمو کی یہ بے معنی سوچیں بھی اسے اس بچے کو مارنے اور بار اسرار سے محبت کرنے پہ نہ اکسا سکیں۔

سال گزر گئے۔ اس بیچ میں بکری والا واقعہ بھی ہوا اور سچ تو یہ ہے کہ جب بکری والا واقعہ ہوا تو کمو تائیں یہ سمجھی تھی کہ کسی نے اسے دیکھ لیا ہے۔ ان سالوں میں جانے کیوں اس نے اس کا نام رکھ دیا تھا۔ فضل الٰہی، فضل الٰہی، فضل بی بی کا بیٹا، فضل الٰہی۔

کمو کا یہ خیال تھا کہ یہ آما موچی جو دیوانہ ہوا جا رہا ہے تو اس نے کہیں فضل الٰہی کو تو نہیں دیکھ لیا؟

زلزلے اور غفورے کی موت کے بعد کوئی وہاں نہیں آیا اور کمو کو یہ بھی لگتا تھا کہ شاید یہ سب انتظام اسی لیے کرایا گیا تھا کہ فضل الٰہی بے خوف و خطر پلتا رہے۔ لیکن یہ انتظام کس نے کرایا تھا؟ اس کے بارے میں کمو کو بالکل علم نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے؟ پے در پے ہونے والے ان محیر العقول واقعات نے اس کی عقل سلب کر لی تھی۔ سوا ایک ایسی حس کے جس کے بارے میں وہ خود بھی نہ جانتی تھی کہ آخر کیوں اسے ذخیرے میں لے جاتی ہے اور فضل الٰہی کے پاس پہنچا دیتی ہے۔

آہستہ آہستہ اس نے فضل کو بولنا، بات کرنا، سکھایا۔ پھر ''عما'' کا پارہ پڑھایا، قرآن پڑھایا، نماز سکھائی، روزے سکھائے، مولوی صاحب سے سنے سارے وعظ جو لاؤڈ سپیکر پہ ہونے کی وجہ سے عورتوں کے کانوں میں بھی پڑتے تھے، اسے سکھائے۔

فضل الٰہی اپنی گول گول کنچوں جیسی آنکھیں، جن کی پلکیں نہیں تھیں، کھولے اس کی باتیں سنتا، اسے بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ وہ جان گیا تھا کہ وہ انسان نہیں ہے۔ انسان کمو جیسے ہوتے ہیں۔

تب سے اس کے دل میں انسانوں کے لیے بہت عقیدت تھی، کیونکہ وہ کمو جیسے ہوتے ہیں۔ جو اس کے لیے کھانے پکا کر لاتی تھی۔ اسے کہانیاں سناتی تھی۔ گاؤں کی چھوٹی چھوٹی باتیں سناتی تھی۔ جنھیں سن کر اس کا دل بھی چاہتا تھا کہ وہ گاؤں میں جائے جہاں کمو جیسے انسان رہتے تھے۔ لیکن کمو اسے ڈراتی تھی اور کہتی تھی کہ اگر وہ کمو کے علاوہ کسی انسان کو دیکھ لے تو فوراً کھال میں چھلانگ لگا دے اور جس قدر تیزی سے تیر سکتا ہے بہاؤ کے مخالف سمت تیرے۔ ذرا دور پہ موگھا ہے جہاں سے وہ بڑی نہر میں چلا جائے گا اور وہاں اس کے چھپنے کی بہت جگہ ہے۔

اسے آج تک یہ سمجھ نہیں آیا تھا کہ کمو کے علاوہ کوئی بھی انسان اس کی جان کا بیری کیوں ہو جائے گا؟ کبھی کبھی

وہ نالے میں بہتی مچھلیوں سے بات کرنے کی کوشش کرتا کیونکہ وہ بھی تو اس جیسی تھیں، لیکن وہ اپنی بے حیا آنکھیں کھولے، چپ چپ منہ چلاتی رہتی تھیں اور کوئی جواب نہیں دیتی تھیں۔ پھر وہ خدا کے بارے میں سوچتا، جس نے سب مخلوقات بنائی تھیں اور اس دنیا کے علاوہ جانے کتنی دنیائیں اور کتنی ہی مخلوقات اور وہ بھی ان ہی میں سے ایک تھا۔ اسے آدم اور حوا کا قصہ یاد آ جاتا جو اسے کمو نے سنایا تھا کہ آدم اکیلا تھا اور پھر اس کا دل بہلانے کے لیے حوا پیدا کی گئی اور جب دونوں جنت میں رہنے لگے تو ایک درخت جو گندم کا پودا تھا، انہیں کھانے سے منع کر دیا۔ مگر حوا نے اس سانپ کی بات مانی جو اصل میں شیطان تھا اور شیطان نے آدم کو سجدے سے انکار کیا تھا اور قیامت تک کی مہلت مانگی تھی کہ وہ قیامت تک انسان کو بہکائے گا اور اس کے بہکائے میں آدم حوا اس زمین پر آ گئے۔

کھال کے کنارے اکیلا بیٹھا وہ قیامت کے بارے میں سوچتا کہ جب وہ آئے گی تو پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑیں گے مگر اسے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ پہاڑ کیا ہوتے ہیں۔ پھر وہ سوچتا کہ وہ کون ہے؟ اس کے ماں باپ بقول کمو کے انسان تھے تو وہ انسان کیوں نہیں تھا؟

ان ہی باتوں کو سوچتے سوچتے وہ بے ایمان ہو جاتا اور یہ بھی سوچتا کہ اگر وہ اپنی وضع کی ایک ہی مخلوق تھا تو وہ خدا، جو ہر شے کو جوڑوں میں پیدا کرتا ہے اس نے اس کا جوڑ پیدا کیوں نہیں کیا؟ اور اگر اس کا کوئی جوڑ پیدا ہو گیا تو پھر کیا ہوگا؟ جس طرح اکا نبہ پہ ایک فاختہ نے گھونسلہ بنایا تھا اور اس میں انڈے دیے تھے اور پھر ان انڈوں سے فاختہ ہی کے ہمشکل بچے نکلے تھے، اسی طرح اس کے بچے بھی ہوں گے؟ اور اگر ہوں گے تو کیا وہ اس ہی جیسے ہوں گے یا وہ بھی انسان ہوں گے؟

وہ سارا دن یہ ہی سوچتا رہتا۔ اسے معلوم بھی نہ تھا کہ چند فرلانگ کی دوری پہ وہ کھوار رہتا ہے جو انسانی خون چکھ چکا تھا اور اسی کے خمار میں یہاں آیا تھا۔

فضل اکیلا تھا، بالکل اکیلا، کمو نے اسے انسانوں سے ذخیرے کے باہر کی دنیا سے اور ان سب چیزوں سے جو اس نے دیکھی بھی نہیں تھیں، اتنا ڈرا دیا تھا کہ وہ سوائے اس تالاب کے، جو برساتی پانی اور کھال کی چھل سے بنا تھا اور نالے میں چند فرلانگ تیرنے کے اور آگے نہیں جاتا تھا۔ بعض اوقات اس کے جسم میں ایک اینٹھن سی ہوتی اور اس کا جی چاہتا نالے کی طوالت میں فرر فرر تیرتا تیرتا دور نکل جائے، جہاں موگھا ہے اور پھر بڑی نہر میں، وہاں سے دریا میں، جو اب سوکھ چلا تھا اور جس کے بارے میں کمو اسے بتاتی تھی کہ تاحدِ نظر پھیلا ہوا تھا اور اس میں سرخی مائل گدلا پانی بہتا تھا اور پھر نا جانے کیوں یہ پانی آنا بند ہو گیا۔ کمو کو سندھ طاس منصوبے کا علم نہ تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ زمین پہاڑ، دریا تو بانٹ لیے جاتے ہیں مگر موسم، بادل، پانی، سورج، ہوائیں اور جانور نہیں بانٹے جا سکتے۔ اور اگر ان کو بانٹا جائے تو جواب نکلتا ہے صفر۔ خیر اتنا علم تو ان کو بھی نہ تھا جو یہ بندر بانٹ کر رہے تھے۔

کمو نے اسے دور ہی سے دیکھ لیا تھا تالاب کے کنارے پہ نچلا دھڑ پانی میں ڈبوئے کہنیاں کنارے پہ ٹکائے وہ کسی سوچ میں گم تھا اس کے چہرے پہ ہلکی ہلکی سنہری داڑھی مونچھ اُگ آئی تھی اور بال شانوں سے بھی نیچے لہرا رہے

تھے۔ بیری کی شاخوں سے چھنتی شام کی مدھم روشنی اس پہ ایسے پڑ رہی تھی، جیسے وہ کسی پرانی کتاب کا کوئی مصور صفحہ ہو، سکے سے بنی ہوئی کوئی تصویر جو جگہ جگہ سے پھیکی پڑ گئی ہو۔

کمو آج کافی دن کے وقفے کے بعد آئی تھی اور فضل الٰہی کی طرح وہ بھی اداس تھی۔ وہ فضل کے پاس ہی ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پہ بیٹھ گئی اور اسے بتاتی رہی کہ اس کا بھائی مینا، جو سب سے سیانا تھا اور اس کا باپ اللہ یار مر گئے۔ اسرار جو اس کی جگہ لیے ہوئے تھا بھاگ کے بھوریوں میں چھپ گیا اور اب مینے کے ہاں کچھ ہونے والا تھا۔

فضل کو کچھ سمجھ آیا، کچھ نہیں۔ مگر مینے اور اللہ یار کی موت کا سن کے اس کے آنسو بہنے لگے۔ اسے خود بھی حیرت ہوئی۔ اس نے تو کبھی ان کو دیکھا بھی نہیں تھا لیکن کمو کا کہنا تھا کہ مینا اتنا سیانا تھا کہ اگر اس روز وہ نباں دائی کے کہے میں اسے لے کر یہاں نہ آتی تو وہ اسے پال لیتا اس طرح دربدر نہ ہونے دیتا۔

فضل اپنی گول گول آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ رشتے، انسان، اس کے اپنے جو اس سے مختلف تھے وہ خاموشی سے بیٹھا اپنی دم ہلاتا رہا۔ ذخیرے میں شام پڑی، درختوں پہ بسیرا کرنے والے، کوؤں اور ہدہدوں اور فاختاؤں نے خوب شور مچایا، لڑے، جھگڑے اور اپنے اپنے گھونسلوں میں بیٹھ گئے۔ تب خاموشی چھا گئی۔ چاند نکلا اور اس کی زرد روشنی بیری کی شاخوں سے ہوتی ہوئی ان دونوں پہ پڑنے لگی۔ سب آوازیں دب گئیں اور گھاس میں رہنے والے حشرات کی تن تن دب دب ذخیرے کی فضا پہ چھا گئی۔ دن بھر درختوں پہ الٹی لٹکے رہنے والی بڑ باگلیں آہستہ آہستہ اتر کے پھل دار باغوں کی طرف اڑنے لگیں اور چاندنی رات میں ان کے مہیب پروں کی پھڑ پھڑاہٹ دل پہ، ہیبت طاری کرنے لگی۔

گاؤں کے کتے اور ذخیرے کے گیدڑ سردی کی لہروں سے بلبلا کے رونے لگے۔ کمو کو احساس ہوا کہ رات ہوگئی ہے اور وہ ذخیرے میں ہے۔

فضل اس کے چہرے سے بھانپ گیا کہ اس کی ہمت نہیں پڑ رہی کہ وہ یہاں سے واپس جائے۔ اسے میمنوں والے واقعے پر یقین تھا اور مینے کی موت کے بعد سے اس کا خوف دو چند ہو گیا تھا۔

''اماں تو رات یہیں رہ جا'' فضل نے اسے مشورہ دیا۔ کمو نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں وہ سو سکتی۔ فضل تو تالاب میں آدھا لیٹا آدھا بیٹھا سو بھی لیتا تھا، جاگ بھی لیتا تھا لیکن کمو تو انسان تھی۔ اسے سونے کے لیے ایک ایسی جگہ چاہیے تھی جہاں وہ عناصر سے محفوظ رہ سکے، کیونکہ نہ تو اس کے جسم پہ بال تھے اور نہ ہی اس کے پنجے تھے، نہ وہ درخت پہ چڑھ سکتی تھی۔ اس کے پاس عقل تھی اور جتنی بھی تھی اس نے اسے یہ ہی بتایا تھا کہ اسے خود کو ہر اس چیز سے محفوظ رکھنا ہے جو اسے نقصان پہنچائے اور یہاں ہر شے اسے ضرر پہنچا سکتی تھی۔

فضل نے بڑی آس سے کمو کو دیکھا۔ کمو نظریں چرا گئی۔ فضل ان سب عناصر کے ساتھ رہ سکتا تھا۔ شاید انسانوں کے ڈیزائن ہی میں کوئی کمی تھی جو ان کو بنانے والے نے اعلان کر دیا تھا کہ ایک روز یہ سب تباہ ہو

جائیں گے۔ اس کے بعد اس سیارے پہ کس نے رہنا تھا؟

کنو گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے اٹھی۔ فضل کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا اور جھل جھل، تتلیوں اور مکھیوں کے سایوں اور چاندنی کی موزائیک کے درمیان سے گزرتی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ فضل دور تک اسے جاتا دیکھتا رہا۔ اس کا دل بے حد اداس تھا اور آج اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اب وہاں مزید نہیں رہے گا۔ وہ اس کھال میں تیرتا تیرتا عالم میں چلا جائے؟ اور دنیا دیکھے گا۔ آخر کیا کریں گے انسان؟ اسے مار ڈالیں گے؟ مار ڈالیں، ایسے جینے سے بہتر تو موت ہے۔

اس نے رندھے ہوئے گلے سے جاتی ہوئی کنو کو دیکھا وہ اسے آج آخری بار دیکھ رہا تھا۔ اس سوچ نے اس کے دل کو مٹھی میں لے لیا۔ ذخیرے کے خاموش رات اور دن، جن میں چڑیوں، بلبلوں اور میناؤں کی آوازوں کے علاوہ طوطوں کی ٹیں ٹیں تھی اور فاختاؤں کی غوں غوں۔ پانی کے بہنے کی آواز اور حشرات کی سنسناہٹیں۔ ان راتوں میں جن میں چاند کی روشنیاں تھیں اور اماوس کی تاریکیاں، سوائے کنو کے کون تھا جو اس سے ملتا، بات کرتا، اسے گلے لگاتا۔ ایسے ہی جیسے اپنے جیسے کسی انسان کو گلے لگاتے ہیں۔

مگر کب تک؟ وہ تھک گیا تھا؟ تنہائی کے اس عذاب سے۔ کنو کی سکھائی نماز پڑھنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ سجدہ جو کنو کر سکتی تھی، فضل نہیں کر سکتا تھا۔ کنو کو جو کچھ دیا گیا تھا۔ اس کا شکر ادا کرنے کا طریقہ بھی بتایا گیا تھا لیکن کیا فضل کو بھی اسی طرح شکر ادا کرنا تھا؟ وہ نالے میں بہتی مچھلیوں کو دیکھتا۔ کنو کہتی تھی کہ سب جانور، پرندے، درخت، شجر و حجر، سب ہر وقت خدا کی تسبیح میں مصروف رہتے ہیں تو کیا وہ بھی ان کے ساتھ اس تسبیح میں شریک نہیں تھا؟ اور اگر وہ ان سے فرق تھا تو کنو اسے گاؤں میں کیوں نہیں لے جاتی تھی؟

کنو ایک موڑ مڑ کے ٹاہلی کے موٹے تنے کی اوٹ میں ہو گئی اس دن کے بعد سے فضل نے کنو کو کبھی نہیں دیکھا۔ نہ ذخیرے میں اور نہ ذخیرے سے نکلنے کے بعد۔

فضل ہی نے کیا؟ کسی نے بھی نہیں دیکھا کیونکہ کنو کی تاک میں جو بیٹھا تھا اس نے کنو کو ایک درخت کی شاخ سے الجھ کے گرتے دیکھا اس کے سر سے بہتے خون کی پتلی سی دھار کو دیکھا اور وہ اپنے جیالوجیکل ٹائم سے نکل کے کنو کے وقت میں داخل ہوا۔

یہ وہ پچھوا تھا جس نے اس وقت انسانی خون چکھا تھا جب انسان یہ سمجھا تھا کہ وہ پانی، بادل، ہوائیں، پہاڑ، بانٹ سکتا ہے اور ایسا انسان اکثر ہی بھٹکتا رہتا ہے۔ تب جانوروں کی ضیافت ہوتی ہے اور وہ اسی طرح انسانوں کو چکھ کر کھاتے ہیں، جیسے زمانہ امن میں انسان انہیں کھاتے ہیں۔ گویا جنگ ہوتی ہی تب ہے جب قدرت کو جانوروں کی ضیافت منظور ہوتی ہے۔ تب وہ انسانوں کو بھرم میں مبتلا کر دیتا ہے۔ وہ عجب مقاصد کے پیچھے اپنے جیسے انسانوں کو مارنے لگتے ہیں۔ یہ سوچے بغیر کہ کیا وہ ان کو کھا سکتے ہیں؟ جب وہ ان کو کھا نہیں سکتے تو مارتے کیوں ہیں؟

اس بات کا جواب کس کو معلوم تھا؟ سوالوں کے جواب تو کسی کے پاس نہیں تھے۔ فضل کے ذہن میں اٹھتے

سوال اور پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں چاند کہرے میں خاموشی سے تیرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور اس چاند سے اوپر آسمان تھا، اس سے اوپر چھ اور آسمان اور پھر سدرۃ المنتہیٰ جہاں ایک بیری کا درخت تھا اور اس کے آگے نور کے پردے تھے اور فضل نے اپنے پھیپھڑوں کے پورے زور سے اپنے خدا کو پکارا۔ اتنے زور سے کہ درختوں پہ پناہ لینے والے پرندے اپنے گھونسلوں سے گھبرا کے اڑ گئے اور شور مچانے لگے۔ وہ آواز اتنی بلند تھی کہ گاؤں والوں نے بھی سنی۔

محسن نے بھی سنی جو ڈیرے کی چھت پہ لحاف اوڑھے لیٹا ہوا تھا اور وہ آواز بھوریوں میں جنڈ کی کٹی میں جل کنھبوں والے تالاب تک بھی سنی گئی جہاں منظور کی بیٹی سو رہی تھی۔

ایک بار، پھر دوبارہ اور پھر جب تیسری بار وہی آواز سنائی دی تو عرفان صاحب بے ساختہ کٹی سے نکل آئے اور اس طرف دوڑنے لگے، جس طرف سے یہ آواز آ رہی تھی۔ ان کے پیچھے پیچھے اسرار تھا۔ دونوں ریت پہ دوڑتے ہوئے گاؤں کی طرف بڑھنے لگے۔ تو یہ ہی تھی وہ آواز جس کا انہیں انتظار تھا۔ یہ ہی تھا وہ اشارہ، عرفان صاحب نے دوڑتے ہوئے سوچا۔ اسرار اب ان کے برابر آ گیا تھا اور وہ دونوں بے تابی سے ذخیرے کی طرف دوڑ رہے تھے۔ یہ اس بڑے زلزلے اور جنگ سے کچھ دن پہلے کا ذکر ہے۔

نازنین اپنی بچی کو لے کر پاکستان چلی گئی۔اس کا شوہر عمرہ کرنے روانہ ہو گیا۔جانے سے پہلے وہ اپنے وکیل سے بات کر گیا تھا پاکستانی قانون کے مطابق وہ نازنین کو طلاق دے رہا تھا۔

نازنین لوٹ آئی اور بندریا کی طرح اپنی بچی کو کلیجے سے چمٹائے رکھتی تھی۔سوائے دور دور سے چہرہ دکھانے کے اس نے بچی کو کبھی نانا، نانی کی گود میں بھی نہیں دیا۔

نازنین کے ماں باپ اس طلاق کو اس طرح صبر کر گئے جیسے بہت زیادہ پڑھے لکھے لوگ اپنے نصیبوں کو رو پیٹ کے چپکے ہو رہتے ہیں۔نازنین اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی اور ان کے خیال میں یہ اچھا ہی تھا، اسے اپنے غم کو خود ہی برداشت کرنا سیکھنا تھا۔

نازنین نے یونیورسٹی سے اسرار کا پتا لیا اور اسے خط لکھا۔ایک خط، دوسرا، تیسرا اور نا جانے کتنے خط میاں اللہ یار کے پتے پر بھیجے مگر ایک کا بھی جواب نہ آیا۔

ان خطوط میں نازنین نے صاف صاف لکھ دیا تھا کہ وہ اس بچی کو نہیں پالے گی۔یہ شعبدہ بازی اسرار کی تھی اور وہ ہی اسے لے کر جائے۔

بار بار ایک ہی مضمون کے خط لکھ کر وہ تھک جاتی تھی اور پھر اپنے کمرے کی کھڑکی سے سامنے کی اجاڑ کوٹھیوں کو دیکھتی تھی ان میں اگے درخت پر اسراریت سے ہلتے اور اسے لگتا کہ ان کی شاخوں پہ عجیب و غریب مخلوقات بیٹھی اسے ہی دیکھ رہی ہے۔

کبھی وہ خواب میں ایک بہت بڑا سمندر دیکھتی، جس کے بیچوں بیچ بس ایک ذرا سا ریت کا ابھرا ہوا جزیرہ تھا، اس جزیرے پہ ناریل کا ایک درخت اور اس سے ٹیک لگائے دو نوجوان لڑکا اور لڑکی بیٹھے ہوتے۔بالکل اس کی بیٹی جیسے آدھا دھڑ انسان کا اور باقی مچھلی کا۔

پھر وہ دیکھتی کہ اس سمندر کا پانی شفاف ہوتا جا رہا ہے۔شیشے کی طرح اور اس کی سطح کے نیچے اسے مسمار شدہ عمارتیں نظر آتیں۔ریزہ ریزہ ہوئے پہاڑ۔اپنے قدموں پہ اوندھے منہ گرے سکائی سکریپر اور ان سب پہ سمندری

کہ اس ہلکورے لیتی اور گھومتے اور ننھی مچھلیاں پھرتیں، اسے لگتا اس کے پھیپھڑوں میں نمکین پانی بھر گیا ہو اور جیسے میں مرچیں سی لگ رہی ہوں۔ تب وہ گھبرا کے جاگ اٹھتی اور اسی عالم میں اسرار کو خط لکھتی۔

جب وہ اسے اکیاون خط لکھ چکی تو آخر تنگ آ کر اس نے گاؤں جانے کا ارادہ کیا۔ اس روز اس کے گھر میں ایک دعوت تھی۔ اس کے ابا، منصور علی صاحب جو کہ فارن سروس میں بائیسویں گریڈ سے ریٹائرڈ ہوئے تھے، اپنے دوستوں اور ساتھی افسران کو دعوت پہ بلا رہے تھے۔

نازنین نے اس شام ہی سے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ آدھی رات کو جب سب سو جاتے ہیں، گھر چھوڑ دے گی۔ اپنی گاڑی میں پٹرول وہ دوپہر کو ہی بھروا آئی تھی، بچی کے اور اپنے کپڑے اس نے گاڑی میں رکھ لیے تھے۔ ضرورت کے لائق پیسے بھی تھے۔

ظاہر ہے گھر میں اس بات کا ذکر وہ کیسے کر سکتی تھی؟ اس نے تو اپنی ماں سے طلاق کے بارے میں بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ یہ ہی سمجھ رہی تھی کہ ابھی صدمے میں ہے وقت کے ساتھ سب کچھ ہی بتا دے گی۔ یوں بھی بتانے کو رہ کیا گیا تھا؟ بیٹی ہونے کی پاداش میں اسے طلاق دی گئی تھی اور یہ ایک عام سی بات تھی مگر وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ عام بات ان کے ساتھ ہو گی۔

ملنے جلنے والے، خاندان، دوست احباب، سب ہی کو معلوم ہو چکا تھا کہ نازنین واپس آ گئی ہے۔ کسی نے کچھ بھی نہ پوچھا اگر کسی کا آمنا سامنا ہو جاتا تو بہت ہی عام سی باتیں کرنے لگتا۔ موسم، فلمیں، کپڑے اور نئے کھانوں کی تراکیب، کبھی کسی کو خیال بھی نہ آیا کہ نازنین کے گھر کی بربادی کا سبب سامنے والی کوٹھیاں بھی ہو سکتی ہیں۔

خود نازنین نے کب سوچا تھا کہ وہ ایک ایسے واقعے سے گزرے گی۔ جس پہ اسے خود بھی یقین نہیں آتا تھا۔ وہ گھبرا گھبرا کے اپنی بچی کے جسم پہ لپٹا کمبل کھولتی اور اسے باتھ روم کے ٹب میں ڈالتی تا کہ اس کا نچلا دھڑ خشک نہ ہو۔ وہ اسے ایک مچھلی کی طرح تیرتا دیکھتی اور پلکیں جھپکتی کہ کاش یہ سب ایک خواب ہو اور وہ اس خواب سے جاگ جائے۔

کبھی وہ بلک بلک کر روتی، کبھی بے وجہ ہنستی اور کبھی سوچتی کہ بچی کو، جس کا نام ہسپتال کے رجسٹر میں جانے کیوں رخسانہ رکھوا دیا تھا، سامنے والی کوٹھی کے تباہ حال تہہ خانے سے بننے والے تالاب میں ڈال آئے۔

وہ یہ بھی سوچا کرتی تھی کہ ویرانے، اجڑے ہوئے شہر اور بستیاں، شاید اسی لیے آباد نہیں ہوتے کہ وہاں ایسی مخلوقات کو رہنا ہوتا ہے۔ اسے کتنے ہی پوکھر، نرسلوں کے جھنڈ، بے آباد مکان اور ویرانے یاد آ جاتے جو بڑی سڑکوں کے دونوں طرف پھیلے ہوتے تھے اور وہ سوچتی تھی کہ آخر ان کو بے آباد کیوں چھوڑ دیا گیا؟

ان سب سوچوں کے باوجود وہ جانتی تھی کہ اس نے رخسانہ کو اسرار کے سپرد کرنا ہے، کیونکہ کسی نہ کسی طرح رخسانہ کا تعلق اسرار سے تھا۔

اس شام جو دعوت نازنین کے والدین نے کی تھی اس میں ملک بھر کے چوٹی کے افراد شریک تھے۔ سیاستدان، دانشور بیوروکریٹ، فوجی جرنیل اور سب سے بڑھ کے بابا جی۔

بابا جی ایک ماڈرن صوفی تھے۔ کلین شیوڈ، سوٹ پہنتے تھے مگر سر پہ جناح کیپ، عمر بھی کچھ خاص نہ تھی، شاید تیس یا بتیس برس کے رہے ہوں گے مگر پچھلے دو ایک سالوں میں ان کی پیش گوئیوں کے باعث ایک دم سب کی توجہ ان کی طرف مبذول ہوگئی تھی۔

سب سے پہلے انہوں نے ایک ملک کے وزیراعظم کے قتل کی پیش گوئی کی، جو دو روز کے اندر اندر پوری ہوگئی۔ پھر ایک ملک میں فوجی بغاوت، ایک ساحل پہ سمندری طوفان اور ایک پہاڑ کے تباہ ہونے کی پیش گوئیاں، ایک ہفتے کے اندر اندر پوری ہوگئیں اور یوں پوری دنیا میں ان کا طوطی بولنے لگا۔ ہر بڑی محفل میں ان کو بلایا جاتا، ان کے ہاتھ پاؤں چومے جاتے اور سوالات کیے جاتے۔ لیکن بابا جی، پچھلے دو سال سے خاموش تھے۔

جہاز کے حادثے کی پیش گوئی کرنے کے بعد وہ بالکل خاموش ہوگئے تھے۔ ہر جگہ جاتے، سب کی سنتے، مسکراتے رہتے۔ مگر کوئی جواب نہ دیتے۔ لوگ ان کی جسمانی حرکات اور چہرے کے تاثرات سے اپنی اپنی مرضی کے نتائج اخذ کر لیتے لیکن بابا جی خود کچھ نہ بولتے۔

کوئی کہتا کہ صرف شہرت حاصل کرنے کا سٹنٹ تھا، کوئی کہتا، عطا تھی، بتانے سے آگے چلی گئی۔ کوئی کہتا تکا لگ گیا، کسی کو یہودی ایجنٹ لگتے کہ اس بہانے، بڑے لوگوں کے راز لیتے پھر رہے ہیں۔ غرض جتنے منہ، اتنی باتیں۔

آج بھی وہ سب لوگوں کے درمیان خاموش بیٹھے تھے۔ مشروبات کا دور چل رہا تھا۔ باوردی بیرے سایوں کی طرح کھانے پینے کی اشیاء اور ٹشو پیپر لیے پھر رہے تھے۔ بحث زوروں پہ تھی۔ سرحدوں پہ جنگ تلی کھڑی تھی اور اس بار ہندوستان، پانی بند کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔

نازنین اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھ رہی تھی۔ بھاری گالوں اور گھنی مونچھوں والے جرنیل چہرہ سرخ کیے انگلی لہرا لہرا کر بتا رہے تھے کہ بس نوے سیکنڈ کے اندر وہ ہندوستان کو صفحۂ ہستی سے مٹا سکتے ہیں۔ ایک آنٹی، جن کے بال سرخ رنگے ہوئے تھے اور سفید کرتے پہ انہوں نے دوپٹہ نہیں اوڑھا ہوا تھا، ان سے نخشنے لگیں کہ کیا جو وہاں مریں گے، وہ انسان نہیں ہوں گے؟ یہ سماجی خدمت گار تھیں۔ اس پہ جرنیل صاحب نے اتنا بھاری بھرکم قہقہہ لگایا کہ گونج نازنین کی کھڑکی تک آئی اور اپنی پرگوشت انگلی، خاتون کی ناک میں قریباً گھسیڑتے ہوئے کہا کہ فوج ہوتی ہے، اگر آپ کی اپنی نہیں، تو ہمسایہ ملک کی ہوتی ہے، فیصلہ آپ کا ہے، اپنی فوج یا ہمسایہ ملک کی۔

خاتون کے پاس الفاظ تھے مگر جرنیل صاحب کی منطق پہ لحہ بھر کو خاموشی سی طاری ہوگئی۔ نازنین نے دیکھا کہ بابا جی سب سے الگ تھلگ ایک صوفے پہ بیٹھے بہت انہماک سے جرنیل صاحب کی باتیں سن رہے ہیں اور ان کے چہرے پہ بچوں جیسی مسکراہٹ ہے۔ پھر اسے لگا کہ وہ اسے دیکھ رہے ہیں۔ کھڑکی کے اندھے شیشے کے اس پار سے بھی اور ان کی نظروں کی تپش ایسی تھی کہ وہ شدید سردی میں بھی پسینے پسینے ہوگئی۔

جنرل صاحب نے اپنے چوڑے نتھنے مزید پھلا کر اعلان کیا کہ اگر انہیں فری ہینڈ دے دیا جائے تو وہ بہتر گھنٹوں کے اندر اندر بنیئے کو گھٹنوں پہ لے آئیں گے۔

ان کی باتوں پہ شیروانی میں ملبوس ملک صاحب بے وجہ کھسیانے سے ہو کر مسکراتے تھے اور مدد طلب نظروں سے دفتر خارجہ کے اتاشی، اعوان صاحب کو دیکھتے تھے۔ اعوان صاحب جواباً نازنین کے ابا کے ذوقِ باغبانی کو داد دے رہے تھے اور ان کے لان میں لگے بوتل پام کی عمر معلوم کر رہے تھے۔

سوال کرنے والی خاتون اب ایک صوفے پہ نڈھال سی بیٹھی تھیں اور پورے لان پہ صرف جنرل صاحب کی بھاری گونج دار آواز طاری تھی اور کیوں نہ ہوتی؟ میٹھی باتیں کرنے والے، سب کے سب ہار گئے تھے سالوں سے جس عذاب کو معاہدوں، مصلحتوں اور کانفرنسوں کے رسوں سے باندھ باندھ کر ہاتھ شل ہو گئے تھے ایک بار پھر سب رسے تڑا کر آزاد ہو گیا تھا۔

سب لوگ گھبرا گھبرا کر کہہ رہے تھے کہ جنگ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں اور جنرل صاحب ان کی باتوں پر اونچے اونچے قہقہے لگا رہے تھے۔ کسی نے غور بھی نہیں کیا کہ کب باباجی وہاں سے اٹھے اور کب گھر کے اندر چلے گئے۔

جنگ کی صورت میں آنے والی تباہی کے بارے میں جنرل صاحب کا ایک ہی موقف تھا کہ امن کے لیے جنگ ضروری ہے اور وہ جارح نہیں۔ لیکن اگر کسی نے للکارا تو بس نوے سیکنڈز۔ اعوان صاحب بوتل پام کو گھور رہے تھے اور ملک صاحب کی شیروانی کا کالر انہیں چبھ رہا تھا۔

اندر کمرے میں نازنین اکیلی تھی۔ باباجی نے دروازے پہ ہلکی سی دستک دی اور جواب کا انتظار کیے بغیر اندر آ گئے۔ نازنین کو ذرا ناگوار ہوا۔ لیکن اس کے کچھ بھی کہنے سے پہلے انہوں نے کھڑکی کا پردہ گرا دیا اور دروازے کا تالا جو دبانے سے لگ جاتا تھا، دبا دیا۔

نازنین حیران کھڑی تھی۔ باباجی بغیر اجازت لیے جیسے کمرے میں آئے تھے اسی طرح کرسی پہ بیٹھ گئے۔

''تمہیں معلوم ہے نا، جنگ ہونے والی ہے۔''

جب وہ بولے تو نازنین کو ان کی آواز بہت سنی سنی سی لگی مگر اسے یاد نہ آیا کہ کہاں سنی ہے۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ جو دو سال سے چپ شاہ کا روزہ رکھے ہوئے ہیں آج کیوں بول پڑے۔ بس خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔

''جنگ تو ہوگی، مگر جنگ سے پہلے زلزلہ آئے گا۔'' انہوں نے ادھر ادھر نظریں گھمائیں جیسے کسی کو تلاش کر رہے ہوں۔

''وہ باتھ روم میں ہے، پانی کے ٹب میں۔''

نازنین کے منہ سے بے ارادہ ہی نکل گیا۔

''مجھے معلوم تھا، یہ پیدا ہوگی۔ اس کا جوڑا بھی پیدا ہوگا، جو سامنے والے گھر میں پیدا ہوئی تھی، اس کا جوڑا بھی ہے اور نازنین، ہم آخری انسان ہیں۔''

وہ بہت افسردگی سے بولے۔ نازنین حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ گو اب اسے کسی بات پہ حیرت نہیں ہوتی تھی مگر پھر بھی۔

''ہاں! ہم آخری انسان ہیں اور یہ زمانہ آخری ہے، آخری زمانے کے انسانوں کے سر میں بھی پہلے زمانوں کے انسانوں، کی طرح بھوک، ہوس اور جنس کا سودا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ پہلا زمانہ نہیں ہے، آخری زمانہ ہے۔ انسان ایک دوسرے سے لڑتا ہے۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ دنیا میں وسائل تھوڑے ہیں اور جو تھوڑے بہت وسائل ہیں وہ اگر ختم ہو گئے تو کیا ہوگا؟ اس ہوس میں اس نے ہواؤں اور پانیوں میں زہر گھول دیا۔''

وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہے تھے جیسے انہیں بولنے میں دقت ہو رہی تھی۔

''میں نازنین! ایک عام آدمی ہوں، خدا کی قسم مجھے کچھ معلوم نہیں ہے، میرے قبضے میں کوئی خفیہ طاقتیں نہیں ہیں۔ صرف اتنا ہے کہ میں نے اپنے اندر کی بھوک پہ قابو پالیا ہے اور یقین کرو کہ انسان اپنے اندر کی بھوک پہ قابو پالے تو اسے سب کچھ نظر آ جاتا ہے۔ کیونکہ سب کچھ سامنے ہی دھرا ہے، کوئی بات پوشیدہ نہیں۔'' وہ سانس لینے کو رکے۔

''مجھے آپ کے کسی بھی قصے، کسی کہانی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں اور یہ رخسانہ اسے میں جلد ہی ان کے حوالے کر دوں گی، جو اس جیسے ہیں۔ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ پلیز!!'' نازنین نے بے حد رکھائی سے بابا جی کو دیکھتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔

بابا جی خاموش بیٹھے رہے۔ باہر روشنیاں جل رہی تھیں اور ہونے والی جنگ سے پہلے کا جشن منایا جا رہا تھا۔

''آپ لوگ، آپ، اسرار اور جو بھی ہیں۔ مجھ سے دور رہیں۔ مجھے آپ لوگوں کی باتوں اور شعبدوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ ہی بات میں نے اسرار سے کہی تھی مگر اس نے......''

بات کرتے کرتے نازنین کی آواز بھرا گئی۔ باتھ روم سے پانی کے چھپاکے سنائی دے رہے تھے۔

''نہیں نازنین! ہم کسی کے دشمن نہیں، نہ کسی کے دوست ہیں۔ ہم کون ہیں، ہمیں بھی نہیں معلوم۔ بس ہم وہ لوگ ہیں جن کے اندر سے انسان کی ہوس غائب ہو گئی۔ جو پرندے تم نے اس روز دیکھے تھے، وہ یہیں اڑتے پھرتے ہیں صرف آنکھ کی پکڑ میں نہیں آتے، جیسے یہاں چاروں طرف ہزار ہا جراثیم ہیں مگر خوردبین کے بغیر کوئی نہیں دیکھ سکتا...... تو سمجھو ایک ایسی ہی خوردبین خود بخود ہم لوگوں کی آنکھوں میں لگ جاتی ہے اور نازنین! ہم تو دوہرے عذاب میں ہیں، ہمیں ہر اس عذاب سے دوبار گزرنا پڑتا ہے جو اس زمین پہ اترے گا۔ ایک اس وقت جب وہ اترے گا اور دوسرا اس وقت جب ہمیں معلوم ہو گا۔''

بابا جی کی باتیں بے ربط تھیں۔ نازنین کو ان سے کسی بھی روایتی گفتگو کی توقع نہیں تھی۔ اب اسے کسی بات پہ حیرت نہیں ہوتی تھی۔ مگر وہ ان لوگوں سے خائف تھی۔ اسرار، بابا جی، رخسانہ یہ سب کوئی اور لوگ تھے۔ اس کے اپنے پیٹ کی اولاد بھی۔ جس قدر وہ ان لوگوں سے بھاگنا چاہتی تھی، اسی قدر پھنستی چلی جا رہی تھی۔ آج اس کا پکا ارادہ تھا کہ اسرار کے پاس جا کے، رخسانہ کو اس کے سپرد کر دیا جائے لیکن اب اسے لگ رہا تھا کہ یہ سب ممکن نہیں، یہ بابا جی کچھ سوچ کر آئے تھے۔

''آپ کیا چاہتے ہیں؟'' اس نے سیدھی بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے لیے کچھ کروں؟ کوئی شعبدہ دکھانا چاہتے ہیں؟ یا آپ کو یہ اُمید ہے کہ میں آپ لوگوں کے بسائے ہوئے کسی اجاڑ میں جا کے رہوں گی اور آپ لوگوں کے ابنارمل بچے پیدا کروں گی تو سوری! میں آپ لوگوں کے ساتھ نہیں ہوں۔'' وہ بابا جی کے بالکل سامنے پنجوں پہ تنی ہوئی کھڑی تھی اور اس کا تنفس بے قابو ہو رہا تھا۔

بابا جی خاموش بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے اس انداز پہ وہ چڑ گئی اور ان کے استری شدہ کوٹ کا کالر پکڑ کے چلائی۔

''یہ آپ لوگ، جو نور کو ولی، رشی، سادھو، جوگی اور پتا نہیں کیا کیا بتاتے ہیں، اصل میں آپ لوگ شدید قسم کے ذہنی دباؤ کا شکار ہیں اور اس ذہنی بیماری کے تحت عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔ وہ لوگ اور ہوتے ہوں گے جو آپ کی باتوں میں آجاتے ہیں۔ آپ لوگ بیمار ہیں، ذہنی بیمار اور یہ بچے یہ ابنارمل ہیں۔ لاکھوں میں کوئی ایک کیس ایسا ہو جاتا ہے۔ تین ہاتھوں والے، دو سروں والے، جڑے ہوئے بچے، پیدا ہو ہی جاتے ہیں۔ یہ جوڑے والی کیا بات ہے؟ یعنی آپ کے خیال میں یہ کوئی الگ نوع ہے؟ کس کو پاگل بنا رہے ہیں؟ مجھے؟ بابا جی! میں پاگل نہیں بنوں گی۔ اسرار کے ہاتھوں نہیں بنی تو آپ کے ہاتھوں کیسے بن جاؤں گی؟

''میں نے سائنس پڑھی ہے۔ میں جاہل نہیں ہوں، یہ سب پیری فقیری، سادھو مہنت، یہ کہانیاں، کمائی کے دھندے ہیں۔ رخسانہ میوٹیٹ ہے یا کسی وائرس کا شکار جس طرح، زکا وائرس سے چھوٹے سر والے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ آپ لوگ انہیں شاہ دو'لہ کے چوہے بتاتے ہیں۔ حالانکہ اب یہ بات سب کو معلوم ہے کہ یہ سب ایک بیماری ہے۔ آپ کی تھیوری کے مطابق تو شاہ دولا کے چوہے بھی ایک الگ نوع ہیں اور اگر کسی وجہ سے حالات ان کے مطابق سازگار ہو جائیں گے تو ہم ختم ہو جائیں گے اور ان کی نوع چلے گی، جیسے نیدرتھال ختم ہو گئے اور ہوموسیپنز کا دور شروع ہو گیا۔

تو آپ مجھے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ رخسانہ جیسے بچے بھی مستقل پیدا ہو رہے ہیں اور اگر حالات سازگار ہوئے تو اگلا دور ان کا ہوگا۔ یہ سب بل شٹ ہے بابا جی، بل شٹ! اور آپ کہاں کے بابے آگئے؟ یہ سوٹ، یہ بوٹ، یہ حلیہ، یو آر اے فراڈ، لائیک ایوری باڈی ایلس۔''

نازنین جلال کی شدت سے لرز رہی تھی۔ مگر بابا جی اسی طرح خاموش بیٹھے تھے اور ان کے چہرے پہ ایک مطمئن مسکراہٹ تھی۔

''یہ سب میں نے کب کہا؟ یہ سب تو وہ ہے جو تمہیں رخسانہ کے پیدا ہونے کے بعد خود ہی معلوم ہو گیا۔ ہر ماں چاہتی ہے کہ اس کا بچہ دنیا میں کامیاب رہے۔ کیا تم نہیں چاہتیں کہ رخسانہ بڑی ہو، اس کی شادی ہو، اس کی اولاد ہو اور اس کی نسل، جو اصل میں تمہاری ہی نسل ہے، پھلے پھولے؟''

نازنین جواب تک بڑی ہمت سے کھڑی تھی جیسے اپنے قدموں پہ ڈھیر ہو گئی۔ مشکل سے روکے ہوئے آنسو راہ پا گئے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بابا جی خاموش بیٹھے رہے۔ جب وہ جی بھر کے رو چکی تو انہوں نے جھک کے اسے کندھوں سے اٹھایا۔

نازنین کے کپڑوں سے دودھ کے پاؤڈر، چاول کے دلیے اور کیوٹی کورا پاؤڈر کی باسی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ شب بیداری اور گریے سے اس کی آنکھوں کے نیچے ہلکے ہلکے سائے سے پڑ رہے تھے۔ چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ مگر اس

کے انداز میں کچھ ایسا تھا جس سے بابا جی کو اپنا مطالبہ دہرانے کی ہمت ہوئی۔

''ہمیں تم سے کچھ نہیں چاہیے نازنین! ہم تو آخری انسان ہیں، تمہاری طرح، آخری زمانے کے آخری انسان، تم جو کچھ کرو گی اپنے لیے کرو گی، میں، عرفان صاحب، اسرار ہم تو آخری انسان ہیں۔''

وہ سانس لینے کو رکے۔ نازنین کا چہرہ چاند کی طرح زرد ہو رہا تھا اور وہ ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ بابا جی اسے لیے لیے بچھونے تک آئے اور اسے پشتے سے ٹکا کے بیٹھا دیا۔ خود پائنتی بیٹھ گئے۔ باہر رات خاصی ڈھل چکی تھی اور جنرل صاحب کے قہقہے اب کچھ بہکے بہکے سے لگ رہے تھے۔

''آپ اسرار کو کیسے جانتے ہیں۔'' نازنین شکی لہجے میں بولی۔ وہ مسکرائے اور مسکراتے ہوئے نازنین نے دیکھا ان کی دائیں آنکھ کے پاس گال پہ گڑھا سا پڑتا تھا اور وہ خود سے منسوب تمام کہانیوں کے برعکس ایک خوش شکل، سادہ دل نوجوان لگ رہے تھے۔

''ایک شہر میں کتنے ادیب ہوتے ہیں؟ یا ایک ملک میں، شاید، ساٹھ یا ستر۔ عام آدمی سے کسی سبزی فروش سے پوچھیں تو اسے معلوم بھی نہ ہوگا، لیکن وہ سب ایک دوسرے کو بھی جانتے ہوں گے اور جن کو ادب سے دلچسپی ہوگی، وہ بھی انہیں جانتے ہوں گے، تو نازنین ہم تو چند ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو کیسے نہیں جانیں گے؟''

''میرا کردار کیا ہے؟'' نازنین اب کی بار ذرا مضبوط لہجے میں بولی۔

''کردار تو کسی کا بھی کچھ نہیں، کون جانتا ہے کہ کس کا کیا کردار ہے؟ عرفان صاحب کو معلوم نہیں کہ اسرار کا کیا کردار ہے، مجھے معلوم نہیں میرا کیا کردار ہے، مگر مجھے اتنا معلوم ہے کہ اب سب ختم کر دینے کا وقت آ گیا ہے۔''

نازنین نے غور سے بابا جی کو دیکھا اور اس کے اندر کی سمجھ دار اور عام انسانی فہم رکھنے والی نازنین نے دکھ سے سوچا کہ اگر یہ شخص اسے اتنے پاگل کر دینے والے حالات اور واقعات کے دوران نہ ملا ہوتا اور اس کی شخصیت کے گرد توہمات اور بے یقینی اور اسرار کا جالا نہ تنا ہوتا تو شاید وہ اس سے دوستی کر لیتی۔ اتنی صاف مسکراہٹ اور اتنی بے ریا آنکھوں والے لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔ لیکن اس وقت حالات یہ تھے کہ اس کے ہاں ایک جل پری پیدا ہوئی تھی۔ سچ مچ کی جیتی جاگتی جل پری اور یہ پراسرار شخص جس کی پیش گوئیاں سچ ہو جاتی تھیں یوں بے اجازت اس کے بیڈ روم میں آ گھسا تھا اور ان لوگوں کی باتیں کر رہا تھا جن کا ذکر اس نے کبھی اس سے تو کیا اسرار کے علاوہ کسی سے بھی نہیں کیا تھا۔ یہ کون تھا؟ یہ سب کیا تھا؟ کیا باتھ روم کے ٹب میں واقعی جل پری تھی یا یہ سب اس کا وہم تھا۔

اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔

''آنکھیں میچنے سے کیا ہوگا نازنین؟ صرف اتنا کہ تھوڑی دیر کے لیے اندھیرے میں رہو گی، بس۔ تو کیا اندھیرے میں رہنا کسی بات کا حل ہے؟''

''میں کیا کروں؟'' وہ بے بسی سے پشتے سے سر ٹیک کر بولی۔

''تم پوچھ رہی تھیں نا کہ ہم کیا چاہتے ہیں؟'' نازنین نے آنکھیں کھول کر دیکھا بابا جی اس کے قریب کھسک

آئے تھے۔

''ہاں! کیا چاہتے ہیں؟''

''جنگ''۔ وہ بولے تو نازنین کو ان کی سانس اپنے چہرے پہ محسوس ہوئی۔

''جنگ؟ مگر جنگ کیوں؟'' وہ چونکی۔

''کیونکہ جنگ میں انسان مرتے ہیں۔ سینکڑوں نہیں، ہزاروں بھی نہیں، لاکھوں اور کروڑوں اور کھوپڑیوں کے مینار بنتے ہیں اور انسانوں کی چربی سے گلیاں پھسلواں ہو جاتی ہیں اور جنگ سے آتی ہے تباہی، بربادی، ویرانی، اجاڑ، بستیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ ویرانے بڑھ جاتے ہیں۔ انسان جنگل کے لیے، جانوروں کے لیے اپنے شہر خالی کر کے جنگلوں میں پناہ لیتے ہیں اور وہاں ان کو، بھوک، بیماری اور عناصر دبوچ لیتے ہیں۔'' وہ خاموش ہوئے۔

''جنگ، انسان کی پسپائی ہے۔ جب اس کے اعصاب پہ فطرت کو برباد کرنے کا احساس جرم حاوی آ جاتا ہے تو وہ اپنی نوع کو ختم کرنے نکل پڑتا ہے۔ اس کا اجتماعی لاشعور اسے جنگ پہ اکساتا ہے۔ جنگ ایک فرد نہیں کرتا، جنگ میں پوری انسانیت شامل ہوتی ہے۔ اصل میں انسان ازل ہی سے خود کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ اور جانتی ہو، بار بار تباہ کر چکا ہے پھر نئے انسان پیدا ہوتے ہیں۔ بچ رہنے والوں سے، لیکن ہم آخری انسان ہیں۔'' انہوں نے ہاتھ بڑھا کے نازنین کا ہاتھ تھام لیا اور جو بالکل یخ ہو رہا تھا۔

''رخسانہ کو میں لے جاؤں گا۔ مگر تمہیں میرا ایک کام کرنا ہے زلزلے سے پہلے۔''

''میں؟ میں جنگ کیسے کرا سکتی ہوں؟ یہ کوئی بازار میں بکنے والی چیز تو نہیں کہ میں خرید کے لے آؤں۔'' رخسانہ نے اپنا ہاتھ واپس نہیں کھینچا۔ اسے کسی کی ہمدردی چاہیے تھی کسی ایسے شخص کی جو اس کے بارے میں سب کچھ جانتا ہو۔

''تم جنگ کرا سکتی ہو نازنین۔ جانتی ہو تمہیں کیا کرنا ہے؟''

نازنین نے نفی میں سر ہلایا۔ تب بابا جی نے اس بتایا کہ اسے کیا کرنا ہے یہ اور بات کہ اسے جنگ ہونے اور زلزلے کے آنے تک یہ علم نہ ہو سکا کہ اس نے کیا کیا ہے؟ یہ ذکر ہے نازنین اور جنرل صاحب کی شادی سے ایک ہفتے پہلے کا۔

گھر میں ہڑ بونگ مچ گئی۔ نازنین کی عدت ختم ہو چکی تھی۔ مگر وہ بچی سمیت ہنوز کمرہ بند تھی۔ منصور صاحب خاموشی سے وقت گزرنے اور بینگن کا پانی بینگن میں مرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر بعض انتظار ایسے ہوتے ہیں کہ جب ختم ہوتے ہیں تو ان کے آگے کھائی ہوتی ہے۔

منصور صاحب بھی کھائی میں جا گرے۔ اس رات واپس جاتے ہوئے جنرل مظفر کی قیمتی گھڑی باتھ روم کے شیلف پہ رہ گئی تھی۔ مسز منصور نے سنبھال کے اپنی سنگھار میز کی دراز میں رکھ لی تھی۔

مظفر کی بیگم بہت عرصے پہلے مر گئی تھیں۔ وہ بے اولاد تھے اور مجلسی زندگی کے شوقین، ظاہر ہے اور کیا کرتے؟ دوسری شادی انہوں نے کی نہیں۔ اپنے شعبے میں ترقی کرتے گئے۔ چاروں طرف عورتیں منڈلاتی رہیں وہ بھی اس رنگین و سنگین زندگی سے راضی تھے۔ اس رات جب زرد چاند منصور صاحب کے لان پہ ٹنگا ہوا تھا اور ہوا میں اعلیٰ شراب اور لوبسٹر کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی تو اچانک انہیں لگا کہ یہ سب کیا ہے۔ کوئلوں پہ سکتے جھینگے، ڈرائی جن اور پرانے دوست۔ لان میں اعلیٰ پائے کی گھاس لگی ہوئی تھی، جس پہ پاؤں رکھتے ہی لگتا تھا دھنس جائیں گے۔ پرانے درخت، خزاں کی ہوا میں جھوم رہے تھے۔ سب کچھ ٹھکانے پہ تھا۔ ذرا دیر پہلے جنگ کا ذکر کر کے ان سے الجھنے والی خاتون بھی ایک صوفے پہ دراز بیٹھی تھیں۔

سب لوگ ادھر ادھر مصروف ہو گئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے سب ان سے نظر بچا رہے ہوں۔ ان سے خوفزدہ ہوں، جنرل مظفر کے دانتوں میں عجیب چل سی اٹھی۔ انہوں نے بانس کی تیلی میں پرا ہوا جھینگا اٹھا کر منہ میں رکھا۔ مگر انہیں اس کا ذائقہ محسوس نہ ہوا۔ یوں لگا جیسے پلاسٹک کا ٹکڑا چبا رہے ہوں۔ ان کا جی چاہا کہ اسے تھوک دیں۔

تب وہ معذرت کر کے باتھ روم گئے۔ وہاں انہوں نے وہ ادھ چبایا جھینگا ٹشو میں لپیٹ کے کوڑے دان میں پھینک دیا۔ اس کے باوجود انہیں لگ رہا تھا کہ منہ میں ایک عجیب سا ذائقہ گھل گیا ہے۔ عجیب جانا پہچانا۔ پھر انہیں یاد آیا یہ ذائقہ کیا تھا۔

71ء کی جنگ میں کرنافلی کے محاذ پر جب گھمسان کا رن پڑا تھا تو بارود، مٹی، خون اور لوہے کی گرم نالوں کا ایسا

ہی ذائقہ دانتوں تلے کچکچا رہا تھا۔

انہوں نے گھبرا کے منہ پہ پانی کے چھپکے مارے سر اٹھا کے آئینے میں دیکھا تو اپنے پیچھے ایک اور چہرہ نظر آیا۔ یہ نازنین تھی۔ وہ بچپن سے اسے جانتے تھے اب بھی اس کی طلاق کی خبر انہیں مل چکی تھی اور یہ بھی کہ وہ اپنی بیٹی سمیت کمرے سے نہیں نکلتی۔

حیرت تو انہیں ہوئی کہ اس طرح باتھ روم میں کیوں گھس آئی۔ لیکن پھر اخلاقیات کا مظاہرہ کرنے کے لیے مڑے۔ چہرے پہ پانی کے قطرے تھے جو پھسل پھسل کر ان کی مہنگی قمیض کو گیلا کر رہے تھے۔

''ہیلو نازنین!'' انہوں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ زبردستی اس لیے کیونکہ مڑتے ہی نازنین کی شکل دیکھ کر انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ غلط ہے۔ بہت غلط۔

نازنین نے عجیب سے رنگ کی لمبی عبادہ نما کافتان پہن رکھی تھی۔ جیسے فالسے کے شربت میں اتنی برف ڈالی جائے کہ شربت بس ذرا سا ہی رہ جائے اور باقی سب برف ہو اور اسے ہلکا سا ہلا دیا جائے تو جو رنگ بنے گا، کافتان کا رنگ ویسا ہی تھا اور اس کا کپڑا بادل کی طرح مہین تھا۔

نازنین نے آگے بڑھ کے تولیہ اٹھایا اور مظفر صاحب کا چہرہ پونچھ دیا۔ ایسے جیسے کسی بچے کا منہ پونچھا جاتا ہے۔ وہ بے چارے ہکا بکا رہ گئے۔

نازنین ان کے قریب آئی، ان کے کندھوں پہ دونوں ہاتھ رکھے اور اپنا منہ ان کے کان کے قریب لائی۔

''آپ جانتے ہیں، طلاق میں نے خود لی ہے اور کیوں لی ہے؟ آپ کی وجہ سے۔''

مظفر اگر بیسن کے سہارے نہ کھڑے ہوتے تو یقیناً لڑکھڑا تو جاتے ہی۔

''نازنین؟'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے نازنین نے اپنی لمبی مخروطی انگلی سے ان کا منہ بند کر دیا۔

''آپ پاپا سے بات کریں۔ بچی کو اس کی فیملی والے لے گئے ہیں۔ اگر آپ نے مجھ سے شادی نہ کی تو یاد رکھیے گا، میں اپنی اور آپ کی جان ایک کر دوں گی۔''

مظفر اپنی جگہ سن کھڑے رہ گئے۔ نازنین کی انگلی ایک دہکتے ہوئے بم شیل کی طرح ان کے ہونٹ پہ تھی اور انہیں یوں لگا ان کا جسم جو، بلوط کے تنے سے تراشا ہوا تھا بھڑ بھڑ جلنے لگا ہو۔

اس تپش اور سینک سے ان کا دل بند ہونے لگا، باتھ روم کی سب آکسیجن کم پڑ گئی اور وہ ساحل پہ پڑی ہوئی مچھلی کی طرح اکھڑے اکھڑے سانس لینے لگے۔

پھر جیسے خود کو بچانے کے لیے انہوں نے اپنے راستے میں کھڑی نازنین کو ہاتھ سے پکڑ کے پرے کیا اور قریباً لڑکھڑاتے ہوئے باہر لان کی طرف چلے گئے۔ جاتے جاتے انہوں نے مڑ کے دیکھا تو نازنین وہیں کھڑی تھی، وہی بادل کی وضع کا فالسئی کافتان پہنے۔ وہ تیزی سے وہاں سے نکلے اور لان میں ٹھہرنے کی بجائے سیدھے پورچ کا رخ کیا اور کسی سے بھی ملے بغیر اپنے گھر چلے گئے۔

سب کو حیرت ہوئی۔ دو ایک بار فون بھی کیے گئے۔ مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ اگلے روز مسز منصور کو ان کی گھڑی ملی۔

مسز منصور نے ان کے گھر کے نمبر پہ فون کر کے ان کی فلپائنی ملازمہ سے کہا کہ جنرل صاحب کی گھڑی ان کے ہاں رہ گئی ہے۔ تھوڑی دیر میں ان کا فون آیا کہ جنرل صاحب خود آرہے ہیں۔ ظاہر ہے سوائے اس دن اچانک غائب ہو جانے کے باقی سب کچھ معمول پہ تھا۔ ان کا آنا کوئی عجیب بات نہ تھا۔

مسز منصور نے ملازم سے کہہ کر برف کی بالٹی، ان کے پسندیدہ مشروب اور تلے ہوئے کاجو پہلے ہی ڈرائنگ روم میں بھجوا دیے۔ گھڑی انہوں نے منصور صاحب کے حوالے کر دی۔ خود انہیں ایک ٹی پارٹی میں جانا تھا۔ فٹافٹ تیار ہونے لگیں۔

ان کی عادت تھی کہ پہلے جوتے پہنتی تھیں، پھر شلوار، اس کے بعد قمیض، پھر میک اپ کر کے بال بناتی تھیں۔ آج انہوں نے عنابی جوتے نکلوائے تھے۔ انہیں پہنتے ہوئے کبھی کی پڑھی ہوئی "ریڈ شوز" یاد آگئی۔ غور سے اپنے پیروں کو دیکھنے لگیں۔ پھر ان کا دل چاہا کہ والز کے دو اسٹیپ لے جائیں اور اس خیال نے ان کو اتنا بے خود کر دیا کہ وہ کھلے دروازے سے بے پروا ہو کر ناچنے لگیں۔

ناچتے ناچتے وہ قد آدم آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔ اپنا سراپا دیکھتے ہوئے انہیں عرفان صاحب یاد آگئے۔

اُف توبہ! ان کے تصور سے ہی جھرجھری سی آگئی۔ کس قدر ڈیشنگ تھے۔ اور ان کی انگلیاں، اتنی لمبی مخروطی جب پیانو کے پردوں پہ پڑتیں تو مسز منصور کے دل میں جانے کون کون سے ساز بجنے لگتے تھے۔ مگر انہیں شاہدہ کی گرہستی عزیز تھی، اپنے گھربار سے زیادہ۔ اگر شاہدہ کی بات نہ ہوتی تو اس رات جب جم خانہ میں رقص کے لیے عرفان صاحب نے ان کا ہاتھ تھاما تھا، وہ منصور صاحب کو چھوڑ کر جا سکتی تھیں۔

اس رات کی یاد نے جیسے ان کے اندر کچھ پگھلا دیا۔ ایک خمار کے عالم میں وہ ایک کے بعد ایک قدم اٹھا رہی تھیں۔ عنابی جوتے پہن کے، اور انہیں کچھ خیال نہ تھا کہ دروازے کی چٹخنی نہیں لگی ہوئی۔

اس رات جب جم خانہ کے بھاری دروازوں اور اندھی دیواروں کے درمیان، مدھم روشنیوں میں رقص جاری تھا تو اس نے ان انگلیوں کو اپنے کندھے پہ اور پھر کمر کے خم پہ محسوس کیا تھا اور وہ آنکھیں، جیسے دو یاقوت اپنی ابدی آگ میں سلگتے ہوئے۔

اس رات شاہدہ نہیں آئی تھی۔ رات کتنی سیاہ تھی منصور صاحب پورٹ سعید گئے ہوئے تھے اور رقص کے بعد اس نے عرفان صاحب سے ہی گھر آنے کے لیے لفٹ مانگی تھی۔ مگر مدھو ساتھ چپک گئی تھی۔

مدھو کے ذکر سے وہ بدمزہ سی ہو گئیں۔ مدھو عرف زینب سے زیادہ نفرت انہیں دنیا میں کسی سے نہیں تھی۔ اس عورت کی شکل، جڑی ہوئی بھنوئیں اور ہونٹوں کا خم، اسے آج تک یاد تھا۔

نفرت کی ایک لہر نے مسز منصور کو مزید فعال کر دیا اور وہ تیز تیز ناچنے لگیں۔

اس رات جم خانہ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے عرفان صاحب نے انہیں سہارا دیا تھا اور انہوں نے بہت دل سے دعا کی تھی کہ اللہ کرے، ''پورٹ سعید'' سے آنے والا جہاز ڈوب جائے اور شاہدہ کو کوئی زہریلا جانور کاٹ لے۔ ساری دنیا برباد ہو جائے اور صرف وہ اور عرفان صاحب بچ جائیں۔ وہ ہلکے ہلکے کچھ گنگنا رہے تھے اور ''ایوننگ ان پیرس'' کی خوشبو پاگل سا کیے دے رہی تھی۔

عین اس وقت جب وہ اس کے لیے دروازہ کھولے کھڑے تھے اور وہ بیٹھ رہی تھی تو مدھو کہیں سے آن ٹپکی تھی۔ انہوں نے نفرت سے ہاتھ جھٹکے جو کسی سے ٹکرائے۔ گھبرا کے مڑیں تو سامنے نازنین کھڑی حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''ارے تم؟'' وہ گھبرا سی گئیں اور جلدی جلدی ڈریسنگ گاؤن پہننے لگیں۔

''آپ ڈانس کر رہی تھیں؟'' نازنین نے ان سے جرح کی۔

''نہیں۔'' وہ سختی سے بولیں اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔ ایسے جیسے لاروے سے تتلی بننے کے عمل میں کوئی چھیڑ دے تو لاروا اپنے آپ ہی میں گٹھری بن کے ٹھٹھر جاتا ہے۔ وہ بھی خود میں سمٹ گئیں صرف رقص کرنے کی گرمی سی رہ گئی۔ بازوؤں، رانوں اور پیروں کے تلوؤں میں رقص کا احساس اور اس سرد رات کا تصور ایک سست رو کی طرح آہستہ آہستہ جسم سے اب بھی گزر رہا تھا۔

وہ اس وقت خود میں اتنی گم تھیں کہ انہیں بالکل اندازہ نہ ہوا کہ نازنین جو اپنے کمرے سے نکلتی ہی نہیں ان کے سامنے کھڑی ہے۔

نازنین کا چہرہ بالکل سفید پڑا ہوا تھا اور وہ سر جھکائے انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ مسز منصور الماری میں سے کپڑے نکالنے لگیں۔ نازنین پہ انہوں نے سرسری نظر بھی نہ ڈالی۔

''مما!'' وہ بہت مدھم آواز میں بولی۔

''ہاں، بولو۔''

''رخسانہ کو اس کے ددھیال والے لے گئے۔''

مسز منصور بری طرح اچھلیں۔

''ہیں؟ کب؟ کب آئے تھے؟ مجھے تو پتا نہیں، میں ان سے پوچھتی کہ کیا شریفوں کے یہ انداز ہوتے ہیں؟ خود بھی تو عورت ہیں۔ اب کیوں لینے آئی ہیں؟ اسی کی وجہ سے طلاق دی تھی نا؟ تو اب، کیا ہو گیا؟''

''مما پلیز! طلاق میں نے خود لی تھی۔''

''کیا؟'' مسز منصور آنکھیں پھاڑ کے اسے دیکھنے لگیں جیسے کمرے میں اچانک دھواں بھر گیا ہو۔

''ہاں مما! میں نے خود طلاق لی تھی اور رخسانہ کا بھی میں نے خود ہی کہا تھا لے جانے کا، کیونکہ میں اسے اگلے گھر میں ساتھ نہیں رکھ سکتی۔''

''اگلا گھر؟'' دھواں اور گہرا ہو گیا اور مسز منصور ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

''ہاں مما! مجھے شادی کرنا ہے اپنی مرضی کی، جنرل مظفر سے۔''

اب کی بار مسز منصور، بھد سے بیڈ پہ گر گئیں ان کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی کچھ بولنا چاہ رہی تھیں مگر حلق سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ نازنین نے جلدی سے انہیں پانی پلایا، ان کی ہتھیلیاں ملیں، مگر اسے کیا معلوم تھا کہ اب مسز منصور نہیں بول پائیں گی۔ زلزلہ آنے تک۔ وہ گھبرا گھبرا کر انہیں پکارتی رہی اور اس شام جنرل مظفر نے منصور صاحب سے نازنین کا ہاتھ مانگ لیا۔ انکار کس منہ سے کرتے نازنین کی خواہش تھی اور یوں بھی مسز منصور کے خاموش ہو جانے کے بعد ان کی ساری ہمت جواب دے گئی۔

نازنین اور جنرل مظفر کا نکاح سادگی سے ہوا۔ ڈھول پیٹنے والا تھا ہی کون؟ مگر نازنین نے بیوٹیشن کو بلوا کر بازوؤں پر کہنیوں تک مہندی لگوائی تھی۔ باریک باریک جال اور پشت پہ عین گردن کے نیچے جہاں جالی کے لبادے کی زپ شروع ہو رہی تھی، بنانے والی نے شاید مور بنایا تھا مگر بن وہ سانپ گیا تھا۔ ایک کوڑیالا جو کسی مستی میں لہرایا ہوا پڑا تھا۔

نازنین کا لباس، مسز منصور کو ڈاکٹر کو دکھانا اور نکاح خواں کو لانا، یہ سب چند گھنٹوں میں ہوا اور رات سے پہلے پہلے مسز منصور کو خواب آور ادویات کے تحت سلا دیا گیا۔ نازنین مظفر کے ساتھ رخصت ہو گئی اور سامنے والے گھروں کے درخت سینہ تانے پہاڑوں کی طرح کھڑے رہے۔

مسز منصور نے اس رات تمام رات خواب دیکھے، عرفان صاحب کے، ان کے گھر کے اور اس جل پری کے جو منظور کے ہاں پیدا ہوئی تھی اور وہ سوتے میں بڑبڑاتی رہیں، کبھی انہیں عرفان صاحب نظر آتے اور کبھی شاہدہ۔ منصور ساری رات سگریٹ پھونکتے رہے اور یہ سوچتے رہے کہ آخر ان کے گھر کی عورتیں ایک ساتھ ہی کسی پاگل پن کا شکار کیوں ہو گئیں؟

مظفر سے شادی سوائے ذہنی خلل کے اور کیا تھی؟ ریٹائرمنٹ کے قریب پہنچا وہ شخص، جس نے ساری عمر بھی گھر نہ بسایا اس سے شادی کے لیے نازنین نے اپنا بسا بسایا گھر اجاڑا۔ دکھ کی اگر کوئی شکل ہوتی تو آج کا دکھ ایک کیکٹس کی طرح ان کے سینے پہ رکھا ہوتا۔ عمر رسیدہ داماد جو عمر میں ان سے بھی ایک سال بڑا تھا۔

اسی وقت مسز منصور نے سوتے میں کوئی بارہویں مرتبہ عرفان صاحب کا نام لیا۔ منصور نے تاسف سے اپنی بیوی کو دیکھا۔ انہیں وہ عجیب سا انجینئر یاد تھا جو بہت بنتا تھا۔ کھوئے کھوئے رہنا۔ عجیب سی آنکھیں بنا کے دیکھنا۔ پیانو بجانا اور باوجود ایک حسین ترین بیوی کا شوہر ہونے کے سب عورتوں میں بے حد مقبول تھا۔

کلب کے سارے مرد اندر ہی اندر اس سے جلتے تھے۔ اس کی قابلیت تو تھی ہی قابلِ رشک اصل بات کہ بغیر کسی کاوش کے عورتیں اس کی طرف کھنچی چلی جاتی تھیں اور ایسا کم بخت تھا، اخلاقیات کے نام پر عورتوں سے

مہذب فلرٹ کرتا تھا۔

ان سب کو تو وہ فلرٹ ہی لگتا تھا۔ سہگل اور ودت صاحب کے گانے جن کے بول بظاہر دکھی ہوتے تھے لیکن سن کر یوں دل میں ہوک سی اٹھتی تھی جیسے کسی نر پرندے کی پکار، جو کہیں جنگلوں میں کسی چشمے کے کنارے تنہا بیٹھا پکار رہا ہو۔

سب جانتے تھے کہ اندر اندر ان کی بیویاں عرفان صاحب پہ فدا ہیں مگر منہ سے کون کہتا؟ عرفان صاحب تو اپنی بیوی کے عاشق زار تھے۔ پھر جب شاہدہ کی موت ہوئی تو سب کے سب چوکنے ہو گئے۔ نرکونج اب اکیلی تھی۔ منصور صاحب بھی دیکھتے تھے اور پڑوسی ہونے کے ناطے زیادہ ہی دیکھتے تھے کہ شاہدہ کے غم نے عرفان صاحب کو پہلے سے بھی زیادہ پرکشش بنا دیا ہے۔ پھر وہ واقعات پیش آئے جن کی تاویلات گھڑنے بیٹھو تو عقل دنگ رہ جائے۔ دونوں گھر اجڑ گئے اور کلب کے سب مردوں نے سکھ کے سانس لیے۔

عورتوں نے نہ دوبارہ عرفان صاحب کا نام لیا اور نہ ہی مدھو کے گھر کے کسی فرد کا ذکر کیا۔ اندر ہی اندر اپنی محفلوں میں جانے کیا کیا باتیں کرتی ہوں گی۔ مگر منصور نے کبھی دوبارہ وہ ذکر نہ سنا۔

دفتر آتے جاتے ان گھروں کے کھنڈروں پہ نظر پڑتی تھی۔ بعض اوقات ذہن میں سوال ابھرتے تھے کہ ہوا کیا؟ اور کیا جو سنا گیا تھا، وہی ہوا؟

اور اب اتنے برسوں بعد وہ دیکھ رہے تھے کہ جو ہوا وہ اتنا سادہ نہ تھا۔ تابکاری کے اثرات کی طرح ان دونوں گھروں کی بربادی کا کوئی اثر ان کے گھر پر بھی تھا ورنہ نازنین یہ سب کیوں کرتی اور مسز منصور، آج بھی سوتے میں اس شخص کا نام کیوں پکارتیں جس سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا؟

مسز منصور نے سوتے میں سسکی سی بھری اور پکارا، ''عرفان! عرفان!'' منصور ہارے ہوئے سپاہی کی طرح اپنی کرسی میں بیٹھے رہے۔

Scanned with CamScanner

جنرل مظفر کو سخت خوف محسوس ہوا۔ نازنین کی موجودگی میں انہیں نیند تک نہ آئی۔ تب انہوں نے ضروری کام کے بہانے سے دوسرے کمرے میں پناہ لی۔ جہاں نیند کے جھونکوں میں وہ خود کو کبھی کرنافلی کے محاذ پر دیکھتے، کبھی افغانستان میں، کبھی کویت میں تو کبھی عراق میں۔

آخران ہی خوابوں میں انہوں نے ایک واضح خواب دیکھا۔ جس میں انہوں نے دیکھا کہ سفید روشنی کے بم پھینکے جا رہے ہیں اور ان کی روشنی میں جنگی جہاز گولے برسا رہے ہیں اور ان کا ہدف نیند اور خواب کے ملگجے اندھیرے میں بھی واضح تھا۔

وہ گولے ڈیم پہ گر رہے تھے۔ ایک کے بعد ایک ڈیم کو تباہ کیا گیا اور پھر انہوں نے دیکھا کہ پانی اپنی طاقت کے زور میں گھاں گھاں کرتا بہا جا رہا ہے اس کے ساتھ، درخت، گاڑیاں، مکان اور انسان خس و خاشاک کی طرح بہے جا رہے ہیں۔ ایک چیخ و پکار مچی ہوئی ہے۔ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔

ان کی آنکھ کھل گئی اور وہ اس قدر پر جوش تھے کہ بغیر جوتے پہنے نازنین کے کمرے کی طرف دوڑے۔ مگر وہاں اب نازنین نہیں تھی۔ اس کا سونفیا دوپٹہ، جس پہ روپہلی ٹنگ اور سلمہ جگمگا رہا تھا، پلنگ کے سرہانے پڑا تھا اور پائیدان پہ اس کے روپہلی سلیپرز رکھے تھے دونوں مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ بستر پہ اس کے لیٹنے کے نشان تھے۔ جنرل مظفر اسے ڈھونڈتے ہوئے باہر نکلے تو وہ لان میں لگے سنبل کے درخت نیچے بیٹھی تھی۔ سونفیا لباس میں بغیر دوپٹے کے۔

آخری راتوں کی چاندنی میں بیٹھی اس لڑکی سے جنرل مظفر ایک بار پھر ڈر گئے۔ اس نے بھی انہیں دیکھ لیا اور جیسے سانپ اپنے شکار کو مسمرائز کر کے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، وہ ایک ٹک انہیں دیکھتی رہی۔ قدم بہ قدم اپنی طرف بڑھتے، یہاں تک کہ وہ بالکل اس کے قریب آ گئے۔

''اندر چلو نازنین، ٹھنڈ لگ جائے گی، تم نے جوتے بھی نہیں پہنے ہوئے۔'' نازنین ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی رہی۔

''اندر چلو۔۔'' انہوں نے اسے کہنی سے پکڑ کر اٹھایا۔

''آپ جانتے ہیں میری بیٹی جل پری ہے''۔ مظفر کو نازنین سے اس قسم کے مذاق کی امید نہیں تھی۔ ذرا دیر سے دیکھتے رہے، مگر اس کے چہرے پہ سنجیدگی تھی۔ انہیں لگا کہ معاملہ کچھ گڑ بڑ ہے اور یہ ایک پدرانہ کشش کے تحت کی جانے والی کوئی فرائیڈین شادی نہیں۔ یہ لڑکی ان کے دوست کی وہ معصوم اور بے فکری لڑکی نہیں تھی، جسے وہ جانتے تھے۔ اس کے چہرے پہ بہت کچھ جان لینے کی عیاری اور اس علم کی دی سفاکی تھی۔

انہیں ایک بار پھر لگا کہ وہ کسی جال میں پھنس گئے ہیں۔ وہ جال کیا ہو سکتا تھا؟ ان کی ریٹائرمنٹ میں ایک ہی سال رہ گیا تھا۔ ان جیسے لاوارث شخص کی جائیداد اور مال وغیرہ تو یوں بھی خالصوں کے ہاتھ ہی لگنی تھی اور نازنین کو روپے پیسے کی کیا کمی؟ پھر یہ سب کیوں کیا گیا تھا؟ سالہا سال کی فوج کی نوکری نے خطرے کو وقت سے بھانپ لینے کی حس بہت مضبوط کر دی تھی۔ اس وقت بھی وہ ایک جناتی سائز کے خرگوش کی طرح اپنے نتھنے پھلا کر ہوا کو سونگھ رہے تھے۔ کیا تھا ہوا میں؟ بارود کی بو؟ نہیں، گلتی ہوئی کائی اور جل کھمبیوں کے تنوں کے گلنے اور مرغابیوں اور پھوں کے فضلے کی بو۔

سالوں پہلے، بیاس کے کنارے، اسی بیاس کے کنارے جو اب بالکل سوکھ گیا ہے، مظفر اور منصور شکار کرنے گئے تھے۔ سرکنڈوں کے جھنڈ میں کیموفلاج کیے کئے کتنی دیر گزر گئی تھی مگر کوئی مرغابی ہاتھ نہیں آئی تھی۔ اس شام ریسٹ ہاؤس لوٹنے پر جب اردلی نے ان کے ویڈرز اتارے تھے تو کمرے میں یہ ہی نامانوس سی بو پھیل گئی تھی اور ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے بتایا تھا کہ جب انسان، پانی کے کنارے گھات لگاتا ہے تو سرکنڈوں، جل کھمبیوں اور کائی کے سال بعد از سال ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گلنے سڑنے سے بنی کیچڑ میں سے ایک خاص بو اٹھتی ہے۔ اس کے بیان کے مطابق یہ بو سرکنڈے اور جل کھمبی بطور سگنل چھوڑتے ہیں اور پرندے ہوا میں اسے سونگھ کر چوکنے ہو جاتے ہیں۔

اسی بو کے باعث مرغابیاں اور دیگر جنگلی پرندے ان پانیوں میں نہیں اترتے۔ انسان خواہ مخواہ چھپنے کے لئے کیموفلاج کپڑے پہنتا ہے، منہ پہ کالک ملتا ہے، پرندے اتنے سیانے تھوڑی ہوتے ہیں؟ پھر یہ کہ انسانوں سے ڈریں گے، تو جائیں گے کہاں؟ یہ تو پودوں کے بھیجے سگنل ہوتے ہیں اور کچھ نہیں۔ منصور صاحب تو ایسے بھولے تھے کہ یقین کر گئے مگر مظفر جانتے تھے، یہ ٹکے ٹکے کے ملازم جن کے پاس کرنے کو کوئی بات نہیں ہوتی، اسی طرح لوگوں کو فطرت سے ڈرا کے گمراہ کرتے ہیں۔

اگلے ہی روز انہوں نے پوری تین ہزار مرغابیاں ماری تھیں۔ تین ہزار، بہت سی مرغابیوں پہ تکبیر بھی نہ پڑھی جا سکی۔ کچھ دریا کے درمیان موجود ٹاپوؤں پہ گر کے مر گئیں۔ مظفر پہ تو لگتا تھا خون سوار ہے۔ اڑتی ڈاروں پہ تاک تاک کے نشانے لگا رہے تھے اور حیرت اس بات کی ہے کہ مرغابی جیسا چالاک پرندہ، جیسے از خود مرنے کے لئے، جھلر کے جھلر دریا پہ اترے آ رہے تھے۔

مظفر انہیں مار مار کے ہانپ گئے، مگر وہ جوق در جوق اترتی رہیں، جیسے ٹھان کے آئی ہوں۔ اور جب مظفر تھک گئے تو انہوں نے دیکھا کہ دریا کی سطح پہ دور تک، جہاں تک نظر جاتی تھی، مرغابیاں ہی مرغابیاں تھیں۔ ان کی

آنکھوں میں ایک خوفزدہ کر دینے والی ڈھٹائی تھی اور وہ ایسے جم کے وہاں بیٹھی تھیں کہ مظفر کو لگا ان کی رٹ چیلنج ہو رہی ہے۔

انہوں نے دوبارہ بندوق اٹھائی مگر اس بار مرغابیاں ایک ساتھ بھرا مار کے اڑیں اور ایک عظیم الجثہ بادل کی طرح ذرا دیر ہوا میں معلق رہیں اور پھر شمال کی طرف اڑ گئیں۔ یہاں تک کہ آسمان ان کے کالے بھورے جسموں سے اور ہوا ان کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے بالکل خالی ہوگئی۔ تب ایک ست رنگا پر ہوا میں ڈولتا ہوا، مظفر کی بندوق کی نال میں آ اٹکا۔

بہت سی زخمی مرغابیاں کیچڑ میں گر کے مر گئیں۔ جو جمع کر لی گئیں، ان میں سے کئی تحائف میں ادھر ادھر بھجوائی گئیں اور درجنوں مرغابیاں، بکری کے دودھ اور دیگر مصالحوں میں بھون کر شراب کے ساتھ کھائی گئیں۔

اس رات، کچھ شراب کا نشہ تھا کچھ شکار کی کامیابی کی خوشی، مظفر اپنے آپے میں نہیں رہے تھے۔ کچے کے جس علاقے میں وہ شکار کر رہے تھے، وہاں کا وڈیرہ، نہ صرف اپنے دیگر ہم منصبوں کی طرح عیاش تھا بلکہ کچھ ایبنارمل بھی تھا۔ یہ ایبنارملٹی اس کے جنسی رویے میں تھی۔ اسے جانوروں کے ساتھ مباشرت کا شوق تھا۔

پہلے پہل جب مظفر نے یہ سنا تھا تو اسے بالکل یقین نہ آیا تھا، لیکن بعد ازاں، چند چشم دید واقعات کے بعد وہ بھی قائل ہوا اور اسے شدید گھن محسوس ہوئی۔ جس کا اس نے برملا اظہار بھی کیا۔ روفا سائیں، جو شائد عبدالرؤف ہوگا ڈھٹائی سے ہنستا رہا اور اپنے شوق کے حق میں ایک سے بڑھ کر ایک بودی دلیل دیتا رہا۔ قائل ہونے کے لئے دلیلوں کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ جس نے، جب قائل ہونا ہوتا ہے خود ہی قائل ہو جاتا ہے۔

شکار کی اس رات جب، مظفر مرغابیوں اور شراب کی گرمی سے بھلبھلا رہے تھے تو روفا سائیں نے انہیں بتایا کہ وہ پچھلی ملاقات پہ کی گئی ان کی تادیبی گفتگو سے بہت متاثر ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنا شوق پورا کرنے کو، ایک صاف ستھری بلھن، پال لی تھی۔ مظفر چونکہ اس کا مہمان تھا اور اچھے انسان مہمان نواز بھی ہوتے ہیں اس لئے لذتِ کام و دہن کے بعد اگر وہ بلھن کے ساتھ شب باشی کرنا چاہتے ہیں تو وہ بھی حاضر ہے۔

مظفر یہ کریہہ حرکت کر گزرے اور اس پر سالوں گزر گئے، مگر گلتے ہوئے سرکنڈوں، جل کھمبی اور دریا کنارے کی کیچڑ کی جو بو اس روز اس بلھن سے آ رہی تھی، وہی بو آج، نازنین کے سونفیا جوڑے سے پھوٹ رہی تھی۔

ڈرتے ڈرتے انہوں نے اس کا ماتھا چھوا۔

''کچھ نہیں ہوا ہے مجھے۔ میرے جسم کا درجۂ حرارت بالکل درست ہے۔ حالانکہ جو کچھ میں دیکھ چکی ہوں، اس کے بعد مجھے پاگل ہو جانا چاہیئے تھا۔''

''کیا، کیا دیکھ چکی ہو تم؟'' مظفر کے ماتھے پہ ٹھنڈا پسینہ پھوٹ نکلا، کہیں سے سمندر کے بساندھے پانی کی تیز بو اڑ کے آ رہی تھی۔

''میرے ہاں جو بچی پیدا ہوئی تھی وہ جل پری تھی، آدھی مچھلی، آدھا انسان''۔

مظفر نے نازنین کا بازو پکڑا اور کسی بوکھلاہٹ میں اسے اندر لے جانے کی کوشش کی۔ نازنین نے ان سے بازو چھڑایا اور نفی میں سر ہلایا۔

''آپ مجھے پاگل سمجھ رہے ہیں؟'' مظفر نے ہونٹ بھینچ کے نازنین کو دیکھا۔ برف میں لگی ٹراؤٹ کے ہاں جل پری ہی پیدا ہو گی۔ ان کے ذہن میں عجیب عجیب سوچیں آگے پیچھے، ٹرین کے ڈبوں کی طرح دوڑنے لگیں۔

پھر انہوں نے انکھیوں سے دیواروں کے کونوں پہ بنے مورچوں کی طرف دیکھا۔ گارڈ سب دیکھ رہے تھے۔ اس روز بھی تو اردلی ساتھ تھا۔ اس سوچ نے ایک بار پھر ان کی پیشانی عرق آلود کر دی۔

''میں تمہیں پاگل نہیں سمجھ رہا، مگر تم میرے ساتھ آؤ۔ اندر بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ یہاں سردی ہے اور تم نے کچھ گرم بھی نہیں پہن رکھا۔'' وہ بڑے تحمل سے اسے گھیر کر اندر لے جانا چاہ رہے تھے۔

''آپ کو میری باتیں سننا ہوں گی اور ان کا یقین بھی کرنا ہو گا مظفر'' مظفر نے اسے تسلی دینے کے لئے اپنا بازو اس کے کندھے پہ پھیلایا۔

''مجھے یقین ہے تم جو کہو گی، وہ سچ ہی ہو گا۔ مگر یہاں سے چلو'' نازنین وہیں گڑی رہی، جیسے اس کے پیروں سے ننھی ننھی جڑیں نکل کر زمین میں پیوست ہو گئی ہوں اور وہ برف میں لگی ٹراؤٹ کی بجائے دھتورے کا وہ پودا ہو، جس کے کافوری پھول چھٹکی ہوئی چاندنی میں اپنی طرف بلاتے ہوں۔

''نہیں میں اندر نہیں جاؤں گی، کسی قیمت پر بھی نہیں''۔ وہ اب لرز رہی تھی سردی یا پھر خوف سے۔

انہیں ایک بار پھر، روفا سائیں کی بلھن یاد آ گئی۔ اس کی آنکھیں بے نور تھیں، سیاہ ہیروں کی سی جھلملاتی آنکھیں اور اس کا سرمئی جسم، اسی طرح سرد تھا اور کپکپا رہا تھا۔ کراہیت کی ایک شدید لہر اٹھی اور معدے میں اینٹھن سی ہونے لگی۔ اس رات جو کچھ ان سے سرزد ہوا تھا، کبھی نہ ہوتا اگر چوکیدار انہیں جھوٹی کہانی نہ سناتا اور مرغابیاں انہیں چڑانے کو اس طرح یلغار نہ کرتیں اور پھر جب وہ ان کی ہڈیاں چبا رہے تھے تو انہیں کیچڑ اور جل کھمبیوں کی وہ بو، ہر لقمے میں محسوس نہ ہوتی تو وہ اس رات وہ سب نہ کرتے۔

آسمان پہ بادل تھے اور ان کے بیچ آخری تاریخوں کا چاند۔ کبھی کبھار یہ بادل چاند پہ چھا جاتے تھے۔ ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا اور لیموں کے پھولوں کی خوشبو، سارے میں پھیل گئی۔

مظفر نے اب کی بار نازنین کو غور سے دیکھا اور انہیں ایک بار پھر کسی گڑبڑ کا احساس ہوا، وہی گڑبڑ جو سالوں پہلے کچے کے علاقے میں ان کے آس پاس مچی تھی اور جس نے ان کو اتنا حواس باختہ کر دیا تھا کہ وہ گناہ پہ آمادہ ہوئے تھے اور اس گناہ نے ان کے اندر ایسی گانٹھ لگائی تھی کہ عمر بھر تبار ہے۔ گھر بار برباد ہوا۔ تنہائی، اکلاپا، جوگ، گناہ کی سزا شائد ہمیشہ ایسی ہی ہوتی ہے۔

انہوں نے نازنین کا بازو زور سے دبوچا اور اسے قریباً گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئے۔ لاؤنج میں بچھے صوفے پہ زبردستی بٹھا کے وہ دوسری کرسی گھسیٹ کے اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

''اب بتاؤ! تمہاری بیٹی جل پری تھی؟''

نازنین نے اثبات میں سر ہلایا۔

''صرف وہ ہی نہیں، پتا نہیں اور کتنے ہیں، سینکڑوں یا شائد ہزاروں یا پھر شائد لاکھوں اور وہ سب یہ چاہتے ہیں کہ ہم مر جائیں۔ ہم انسان، مظفر، ہم انسان مر جائیں۔'' مظفر سکتے میں بیٹھے تھے۔

اس رات جب وہ روفا سائیں کے ہاں بلھن کے پاس سے ہو کے آئے تو انہیں لگا کہ ان کے اندر کچھ بدل گیا ہے۔ جو حرکت وہ کر گزرے تھے اس پہ ندامت کی بجائے ایک خوف تھا، جو ان کی ریڑھ کی ہڈی میں کنڈلی مار کے بیٹھ گیا تھا، انہیں یوں لگ رہا تھا کہ کسی مقدس چشمے میں بول و براز ملا آئے ہیں۔ تب ہی روفے نے انہیں بتایا تھا کہ کسی زمانے میں لوگ بلھن کو سندھ کی روح سمجھتے تھے، دیوی ماں کے پوجا کرتے تھے۔ پھر اس نے ان پوجنے والوں کی ماں بہن کے بارے میں اپنے عزائم دہرائے اور ان کو بھی بلھن کی طرح اپنے گھر میں رکھنے کی حسرت کا اظہار کیا۔

تب مظفر کا خوف پسینے کی دھاروں کی صورت ان کے ہر بن مو سے بہنے لگا۔ روفے نے انہیں تسلی دی کہ یہ مرغابیوں کی گرمی ہے اور انہیں ٹھنڈے پانی سے نہانا چاہیئے۔ اس دن کے بعد سے مظفر کبھی گرم کپڑے نہ پہن پائے، نہ ہی لحاف، کمبل اوڑھ سکے ان کو ایک عجیب سی تپش گھیرے رکھتی تھی۔ جسم ہر وقت گرم رہتا تھا جیسے ایک سو دو بخار کے مریض کا جسم ہو۔

''آپ کو مجھ پہ یقین نہیں؟ اچھا یہ بتائیں کبھی شاہ دولہ کے چوہے دیکھے ہیں آپ نے؟''

مظفر نے اثبات میں سر ہلایا۔ بھلا شاہ دولہ کے چوہے کس نے نہیں دیکھے تھے؟ مظفر کو یاد تھا کہ اس کے بچپن میں ایک چوہا، عین صدر بازار کے چوک پہ بھیک مانگتا تھا۔ مظفر روز شام کو سائیکل پہ کلب جاتے تھے۔ راستے میں اس چوہے کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ دیتے تھے، پھر ان کی اس سے دوستی سی ہو گئی۔

ایک روز بڑے زور کی آندھی چل رہی تھی اور ان کی جیب میں چوہے کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا تو وہ چپکے سے وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ اپنے گھر کے موڑ پہ انہیں چوہا دوبارہ نظر آیا۔ انہیں حیرت بھی ہوئی کہ وہ بغیر سائیکل کے ان سے پہلے وہاں کیسے پہنچ گیا؟ مگر اس سے زیادہ انہیں یہ الجھن ہو رہی تھی کہ وہ چوہے کو کیا دیں؟

وہ اس سے بچ کے نکلنا چاہتے تھے کہ وہ ایک دم ان کے سامنے آ گیا۔ چھوٹے سے سر پہ گول گول معصوم آنکھیں، ذرا باہر کو نکلے ہوئے دانت اور چہرے پہ معصومیت اور حماقت کے ملے جلے تاثرات۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے کچھ کہتے اس نے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔ مظفر نے بے ساختہ ہی اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس نے کوئی چیز ان کی مٹھی میں دبائی اور ہنستا ہوا کشکول بجاتا گلیوں میں غائب ہو گیا۔

انہیں اچھی طرح یاد تھا، وہ ایک سانپ کی کینچلی کا ٹکڑا تھا، زردی مائل سفید سا۔ انہوں نے گھن کھا کر اسے وہیں پھینک دیا تھا دوبارہ وہ چوہا انہیں کبھی نظر نہیں آیا تھا۔

''دیکھا ہے، کبھی شاہ دولہ کا چوہا؟'' نازنین نے ان کا بازو ہلایا۔

''ہاں، ہاں کیوں نہیں دیکھا؟''

''اچھا، جانتے ہیں، یہ کون ہوتے ہیں؟ یہ چوہے؟''

''بھئی یہ ان لوگوں نے ریکٹ چلا رکھا ہے، بچوں کو اغوا کر کے ان کے سر پہ لوہے کی ٹوپیاں چڑھا دیتے ہیں، پھر ان ریٹارڈ بچوں سے بھیک منگواتے ہیں۔''

نازنین زور سے ہنسی۔ ''آپ اتنے بے وقوف ہیں مظفر؟ یہ سارے ملنگ، یہ چوہے، یہ جوگی، سنیاسی، ایبنارمل لوگ، یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ اتنا ایسوسی ایٹ کیوں کرتے ہیں؟ ایک دوسرے کی اتنی وکالت کیوں کرتے ہیں؟ آخر مائیکروسفالی کا شکار ان بچوں کو شاہ دولہ کس لئے بچاتے تھے؟ کبھی سوچا؟''

مظفر نے ہمدردی سے نازنین کو دیکھا۔ یہاں ان چار دیواروں کے درمیان، صوفے پہ بیٹھے ہوئے وہ ان کو بڑی بے چاری سی معمولی سی لڑکی نظر آئی اور انہیں خود پہ بہت شرم آئی۔ ان کے دوست کی یہ بیٹی یقیناً پاگل ہو چکی تھی اور انہوں نے ایک عیاش بڈھے کی طرح، اس کی ذہنی کیفیت کا فائدہ اٹھایا تھا۔ مظفر سے شادی اور اب جو کچھ وہ کہہ رہی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ پاگل ہے۔

وہ عدم تحفظ جو بابر لان میں مظفر کے کندھوں پہ پیر تسمہ پا کی طرح سوار ہو کے اس کا دم گھونٹ رہا تھا، غائب ہو گیا، اس کی جگہ ہمدردی نے لے لی، جو انسانوں کا ایک ایسا جذبہ ہے کہ کسی بھی کمزور کو دیکھ کر بیدار ہو جاتا ہے شائد اس طرح وہ اپنی نسل کی بقاء چاہتا ہے، مگر ہوتا اس کے الٹ ہے۔ کمزور کو، بیمار کو، بچا لینے سے، کمزور جین والے اپنی نسل آگے چلاتے رہتے ہیں اور مضبوط انسانوں کو جہد البقاء کے لئے ان سے بھی مقابلہ کرنا پڑتا ہے جو ان کے ہی بڑوں نے کبھی بچا لیے تھے، اُف! کس قدر احمق ہے انسان۔

''آج پوری دنیا میں مائیکروسفالی کا شکار بچوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں یہ ایک وائرس ہے، زیکا وائرس''۔

''نازنین! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں، تم کچھ دیر آرام کر لو، پھر میں تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں۔''

نازنین نے بے چارگی سے انہیں دیکھا گہرا سانس لیا اور جیسے آخری داؤ کھیلا، ''ان لوگوں نے کوئی پلاننگ کر رکھی ہے، وہ کہتے ہیں سب کچھ برباد ہو جائے گا اور دنیا ایسی ہو جائے گی کہ صرف میری بیٹی جیسے لوگ زندہ رہ پائیں گے اور یہ قیامت نہیں، سمجھ رہے ہیں ناں آپ؟ یہ قیامت نہیں، یہ ان لوگوں کا منصوبہ ہے اور آپ بھی اس منصوبے کا حصہ بن جائیں گے اگر آپ میرے ساتھ رہے''۔

وہ سانس لینے کو رکی۔ مظفر خاموشی سے اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے اور ان کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ انہیں نازنین کے ماں باپ سے بات کرنا تھی۔ اسے مدد چاہیے تھی۔ وہ کسی خوفناک ذہنی بیماری میں مبتلا تھی۔ طلاق کی وجہ سے وہ جس ذہنی دباؤ سے گزری تھی، لازمی تھا کہ اس کا نتیجہ کچھ ایسے ہی برآمد ہوتا۔ اپنی بیٹی سے اسے غالباً ایسی ہی نفرت

ہوگئی تھی جیسے، نامساعد حالات میں کتیا کو اپنے پلوں سے نفرت ہوجاتی ہے اور یا تو وہ انہیں چھوڑ دیتی ہے یا کھا جاتی ہے۔ نازنین کے بقول وہ اپنی بیٹی کو اس کے ددھیال کے حوالے کر چکی تھی لیکن مظفر کو اس کا یہ بیان مشکوک لگ رہا تھا۔

یا اس نے اسے جان سے مار دیا تھا، یا کہیں چھپا دیا تھا اور ظاہر ہے وہاں بھی اس کے بچنے کے مواقع بہت کم ہوں گے۔ ان کے پاس وقت کم تھا اور انہیں بہت کچھ کرنا تھا۔

''آپ کو یقین نہیں آ رہا نا؟ آپ میرے ساتھ چلیں، میں آپ کو دکھاؤں گی، انکل عرفان کا گھر اور وہاں اتنی عجیب چیزیں ہیں اور۔۔۔ جہاں اسرار رہتا ہے، وہاں سانپ ہیں، آدم خور مینڈک، زہریلے چوہے اور بہت سارے ابنارمل انسان، وہ انسان جو ہم لوگوں کو ختم کر دینا چاہتے ہیں، جو انسانی ترقی کے دشمن ہیں جو اجاڑ، ویرانے اور جنگل پسند کرتے ہیں۔ آپ ان کو مار دیں مظفر، ورنہ وہ ہمیں مار ڈالیں گے''۔

وہ مظفر کے بازو سے لپٹی ایک خوفزدہ بچی کی طرح بول رہی تھی۔ مظفر نے اثبات میں سر ہلایا اور بڑی محبت سے نازنین کا بازو تھپکا۔ ''میں ان کو مار دوں گا، صبح ہوتے ہی۔ اتنی بڑی بندوق سے، ڈشوں کر کے۔ ابھی تم چلو اور چل کے سو جاؤ''۔ بے چاری لڑکی، جانے کس ذہنی کرب سے گزر رہی ہوگی جو یہ سب کہانی گھڑ لی اس نے۔

''آپ اب بھی مذاق کر رہے ہیں، میں آپ کو بتاؤں کہ انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں آپ سے شادی کروں تاکہ آپ ایک خوفناک جنگ چھیڑ دینے میں کوئی تامل نہ کریں، جنگ، کیونکہ وہ ہی انسانوں کا خاتمہ کرے گی۔ آپ، آپ کو استعمال کرنے کے لئے مجھے بھیجا گیا ہے مظفر۔ یقین نہیں آتا، اچھا یہ بتائیں کیا آپ نے آج خواب میں جنگ نہیں دیکھی؟''

اب کے مظفر چونکے انہیں سفید روشنی کے گولے اور ان گولوں کی روشنی میں تباہ ہوتے عظیم آبی ذخائر اور ان ذخائر کی تباہی سے جنم لینے والا سیلاب یاد آ گیا جو انہوں نے خواب میں دیکھا تھا۔ خواب جو جینیاتی یادداشت ہوتے ہیں۔

''وہ یہ بھی کہتے ہیں مظفر کہ دریائے سندھ کا آبپاشی کا منصوبہ، اصل میں دنیا کی تباہی کا منصوبہ ہے، اسے بنانے والے بھی ان جیسے تھے۔ انہوں نے جان بوجھ کر یہ منصوبہ بنایا، جس سے پوری دنیا میں سمندروں کی سطح، موسم، درجہ حرارت، ہر چیز برباد ہوگئی۔ انسان کے لئے دنیا اب روز بروز تنگ سے تنگ ترین ہوتی جائے گی۔''

مظفر، نازنین کو دیکھ رہے تھے جو بالکل زرد پڑ چکی تھی۔ ''جنگ، سے یہ تباہی مزید نزدیک آ جائے گی اور یہ ہی ان کی خواہش ہے، جن کے پاس میری بیٹی ہے''۔

مظفر ایسے مسکرائے جیسے کسی بچے کی بات پہ مسکراتے ہیں۔ نازنین یقیناً جغرافیے میں بہت اچھی رہی ہوگی۔ یوں بھی آج کل انٹرنٹ اس قسم کی فلموں اور دستاویزی فلموں سے بھرا پڑا تھا جو دنیا کی یقینی اور قریبی تباہی کی وعید دیتی تھیں۔ نازنین کا بہانے باز دماغ عجیب کہانیاں گھڑ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی طرح پوری دنیا بھی برباد ہو

بے چارہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ جانے
جائے۔ خاصا خوفناک مرض تھا اس کا جیسے روفا سائیں کو زوفیلیا تھا اور وہ

نازنین کی اس ذہنی بیماری کا کیا نام تھا؟
"وہ کہتے ہیں کہ دریا کا راستہ کبھی بند نہیں ہو سکتا اور عقل مند آدمی کبھی سانپ کی لکیر اور دریا کے راستے پہ گھر
نہیں رکھتا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ پانچوں دریا پھر سے مل جائیں گے، سندھ کی وادی پھر سے ویسی ہو جائے گی
جیسی کہ یہ کبھی تھی، مگر انسان نہیں رہیں گے، کیونکہ آپ میری وجہ سے جنگ کرانے پہ مجبور ہو جائیں گے۔"
مظفر اسے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ جنگ ان کے اختیار میں کب تھی؟ یہ فیصلے تو کہیں اور ہوتے
تھے، مگر نازنین کی کہی سب باتیں انہیں بہت یاد آئیں، اس میٹنگ میں بھی، جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگلے چند ماہ
کے اندر جنگ ہوگی، تین پڑوسیوں سے ایک فیصلہ کن جنگ۔

تب انہیں نازنین بہت یاد آئی، اس کے بعد مرتے دم تک، جب تک کنکریٹ کی چھت ان پہ آ پڑی اور ان
کی پسلیاں ٹوٹ کر پھیپھڑوں میں پیوست ہو گئیں اور جگر پھٹ گیا اور خون ناک منہ سے بہنے لگا، اس وقت تک انہیں
نازنین بارہا یاد آئی، اپنے کٹے ہوئے ہونٹوں پہ اس کے سرد ہونٹوں کا لمس، برف میں لگی ٹروائٹ۔ تب انہوں نے جانا
، وہ سچ کہتی تھی جنگ کرانے والے انسان نہیں ہیں وہ جن ایجنڈا صرف تباہی ہوتا ہے۔
وہ انسان کو مار کے اپنے لئے جگہ بنانا چاہتے ہیں۔ جانے جنگ کون کراتا ہے؟ درخت ہوا میں کوئی ایسے
مادے چھوڑتے ہیں جن سے اعصاب پہ جنگ کا بھوت سوار ہو جاتا ہے؟ یا پرندے اور جانور؟ اگر یہ بھی نہیں تو کون
ہے جسے انسانوں کی تباہی سے دلچسپی ہے؟ یہ جواب انہیں مرتے دم تک نہ مل سکا اور جب جواب ملا تو وہ مر چکے تھے
اس بلھن کی طرح، جسے اس روز بدسلوکی کے بعد انہوں نے مار کے پھینک دیا تھا، کیونکہ انہوں نے یہ سن رکھا تھا کہ
اگر کسی مادہ جانور سے مباشرت کی جائے تو اس سے ایک ایسی مخلوق پیدا ہوتی ہے جو نہ انسان ہوتی ہے اور نہ ہی جانور،
مگر تباہی لاتی ہے۔ تباہی آئی اور وہ بلھن کی طرح مردہ اپنے ہی خون کے تالاب میں تیرتے رہے۔

(۴۷)

جب وہ دونوں وہاں پہنچے تو وہ سرکاری کھال میں چھلانگ لگانے ہی والا تھا۔ان دونوں کے قدموں کی چاپ کو سن کر پہلے تو اس نے سوچا کہ چھپ جائے پھر وہ وہیں جم کر بیٹھ گیا۔وہ ٹھان چکا تھا کہ اب وہ مزید یہاں نہیں رہے گا۔انسان اس کا جو بگاڑ سکتا تھا بگاڑ لے۔اب وہ مزید تنہا نہیں رہنا چاہتا تھا۔

ان دونوں نے چاندنی میں اسے دیکھا تو باوجود منظور کی بیٹی کو دیکھنے کے، وہ بھونچکے رہ گئے۔پھر عرفان صاحب آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھے۔جب اس نے کوئی تعرض نہ کیا تو اسرار بھی آگے بڑھا۔

وہ خاموش رہا، تو یہ انسان تھے۔ایک سوکھا سڑا، گہرے سانولے رنگ کا اور دوسرا بے حد حسین، اسی کا ہم عمر، یہ انسان تھے اس نے دلچسپی سے اسرار کو دیکھا اور پھر اسے یوں لگا کہ وہ انہیں جانتا ہے۔

''تم اسرار ہو۔'' وہ بولا تو اسرار چونک گیا۔منظور کی بیٹی بھی بولتی تھی مگر یہ، یہ تو اس نے سوچا ہی نہ تھا کہ اگر قدرت ایک مخلوق پیدا کرتی ہے تو اس کا جوڑا بھی ہوتا ہے۔مگر یہ ذخیرے میں کہاں سے آیا؟

''تم کون ہو؟ اور یہاں کیسے آئے؟'' اسرار نے اس سے پوچھا۔

''میں فضل ہوں، فضل الٰہی اور ہمیشہ سے یہاں ہوں۔'' تب اس نے اسرار کو اپنی تمام کہانی سنائی۔عرفان صاحب اور اسرار دنگ رہ گئے۔تو یہ تھی اصل کہانی۔اسرار کا کردار صرف اتنا تھا کہ وہ فضل کی جگہ میاں اللہ یار کے ہاں پلتا رہے تا کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ میاں اللہ یار کے ہاں کیا مخلوق پیدا ہوئی ہے؟

وہ تینوں سر جھکائے اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔عرفان صاحب کو یوں لگ رہا تھا کہ وہ کسی گہری دھند میں کھو گئے ہوں۔ان کا کام، کیا تھا؟ وہ کون تھے؟ عمر بھر اتنی سخت زندگی کیوں کاٹی؟ اگر اسرار وہ نہیں تھا جس کے لیے وہ یہاں آئے تو پھر اسرار کو کیوں پیدا کیا گیا؟

مدھو کا گھر، شاہدہ، ان کا گھر، وہ سب کیوں برباد ہوئے۔وہ جوگی ان کے پاس سانپ لے کر کیوں آیا اور ان کے دماغ میں یہ بات کیوں آئی کہ سندھ طاس کا منصوبہ تباہی ہے۔

سوالوں سے گھبرا کے انہوں نے پھر آسمان کی طرف دیکھا مگر آسمان سے کوئی اشارہ نہ آیا۔عرفان صاحب

بے بسی سے اسے دیکھ رہے تھے جو تالاب میں نیم دراز کنارے پہ کہنیاں رکھے انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

پھر جیسے انہیں کوئی جواب سوجھا۔ ''تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا، بھوریوں میں۔''

''مگر میں تو چل نہیں سکتا اور تیر کے وہاں تک کیسے جاؤں؟ پانی کہاں ہے؟''

باؤ اسرار اور عرفان صاحب فضل کو کندھے پہ اٹھا کے بھوریوں میں لے آئے۔ اس رات جنڈ کی کٹی میں کوئی نہ سویا۔ منظور کی بٹی والے تالاب کو کھود کر ذرا کشادہ کیا گیا، صبح سے پہلے پہلے فضل اور منظور کی بیٹی کو اس تالاب میں چھوڑ دیا گیا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور ان کی خوشی اور حیرت دیدنی تھی۔ اگلی صبح بابا جی بھی وہاں پہنچ گئے اور رخسانہ بھی۔

آنے والے دنوں میں بابا جی چار اور بچے لے کر آئے جو ایسے ہی تھے۔ جنڈ کی کٹی والا تالاب اب بہت پھیل گیا تھا۔ دو روز لگاتار ہونے والی بارش نے اسے منہ ہا منہ بھر دیا تھا پھر نازنین بھی آ گئی اور آخر میں شاماں آئی۔

(۳۸)

لاہور کے اس اسپتال میں ایک گہما گہمی جاری تھی کریپ سول کے جوتے پہنے ڈاکٹرز بے آواز چل پھر رہے تھے گائینی کی ڈاکٹرز پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک دوسری کو دیکھ رہی تھیں اور جیسے بار بار کچھ بولنے کو منہ کھولتی تھیں اور بول نہ پاتی تھیں۔

دور سے دیکھنے پہ وہ کسی شیشے کے مرتبان میں رکھی مچھلیاں لگ رہی تھیں جو منہ کھولتی تھیں اور بند کرتی تھیں اور اپنی کبھی نہ جھپکنے والی آنکھوں سے سب کو دیکھتی تھیں۔ جو راز وہ بتانا چاہتی تھیں وہ کانٹے کی طرح ان کے حلق میں اڑا ہوا تھا۔ ان کے جسموں میں ایک ایسی پھڑکن منجمند تھی جو پانی سے نکلنے سے پہلے مچھلیوں کے جسم میں ہوتی ہے۔

زچہ بچہ وارڈ کی آیائیں اور جمعدارنیاں، نرسیں، ہاؤس جاب کرنے والیاں، سب کی سب، ایک خوف اور افتادگی کے عالم میں ادھر سے ادھر بھاگ رہی تھیں۔ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ کوئی بھی دوسرے سے آنکھ نہیں ملا پا رہا تھا۔

دونوں سرجنز، ڈیوٹی ڈاکٹر، رجسٹرار اور ہیڈ نرس، نرسنگ سٹیشن کے پیچھے سٹولوں پہ خاموش بیٹھی تھیں۔ ایک انہونی کے خوف نے انہیں اسی طرح دبوچا ہوا تھا جیسا اس رات نباں کو میاں اللہ یار کے ڈیرے پہ گھیرا تھا۔ نباں ان پڑھ تھی مگر تجربہ کار تھی۔ یہ تجربہ کار بھی تھیں، تعلیم یافتہ بھی تھیں مگر انسان بھی تو تھیں۔

انسان ہر نوع کی طرح، کھانے پینے، پناہ لینے اور اپنی نسل کو بڑھتے پھلتے پھولتے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ تعلیم کا مقصد اسے اس کی جبلت سے دور لے جاتا ہے۔ تہذیب کے جال میں پھنس کر انسان اپنی حیوانی خصوصیات سے محروم تو ہو جاتا ہے، لیکن جسے وہ اپنی چھٹی حس کہتا ہے، جن کیفیات کو پاگل پن اور مجذوبیت سے تعبیر کرتا ہے وہی اصل میں اسے اپنے ماحول اور دوسرے جانوروں سے منسلک کئے ہوئے ہیں۔

کل رات چھ عورتوں کے ہاں ولادت ہوئی۔ چھ کے چھ بچے، جن میں پانچ لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا، انسان نہ تھے۔ یوں سمجھ لیں لانسان تو تھے مگر مچھلی بھی تھے، یعنی جل پری، ویسی ہی جیسی منظور کے ہاں پیدا ہوئی تھی اور فضل بی بی نے جنا تھا۔

ایک آدھا واقعہ ہوتا تو شائد اسے کسی ابنارملٹی کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا مگر ایک ساتھ اتنے واقعات؟
ڈیوٹی ڈاکٹرز نے پروفیسرز کو بلایا اور جونیئرز نے سینئرز کو۔ وارڈ میں میلا لگ گیا۔ مگر بجائے شور وشغف کے، سب پہ ایک سناٹا چھا گیا۔ ایک انجانے خوف نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اجتماعی لاشعور نے انہیں ایک پیغام دے دیا تھا۔

مگر وہ سب کے سب نفی کی کیفیت سے گزر رہے تھے۔ ایک دوسرے سے آنکھ بھی نہیں ملا رہے تھے۔ آیاؤں نے میکانیکی انداز میں ان بچوں کو نہلایا، کپڑوں میں لپیٹا اور نرسری میں لگے جھولوں میں لٹا دیا۔ وہ ان کی گول چمکدار آنکھوں سے خائف تھیں وہ آنکھیں جو بظاہر معصوم اور حیران تھیں ان کی تہہ میں انہیں وہ سفا کی نظر آ رہی تھی جو ایک ہار جانے والی نسل کو فاتح نسل کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔

ایک پروفیسر کو بیٹھے بیٹھے جانے کیا خیال آیا اور اپنے بھورے رنگ کے بالوں پہ ٹکے چشمے کو اتارتے ہوئے وہ جیسے سامنے والی دیوار سے مخاطب ہوئی۔

''یہ کوئی وائرس ہے۔ زکا کی طرح، ہے ناں؟''

دوسری پروفیسر جو پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں، اثبات میں سر ہلانے لگی۔ ذرا سی دیر میں اسے احساس ہوا کہ وہ کیا کر رہی ہے؟ سر کی جنبش اس کے اختیار میں نہیں تھی۔ اسے کوئی تاویل چاہیئے تھی اور شائد یہ سب سے بڑی تاویل تھی۔

''ہاں! یہ وائرس ہے، جس نے حاملہ عورتوں کو متاثر کیا۔ مگر ان سب کی الٹرا ساؤنڈ رپورٹ میں یہ بچے نارمل ہیں۔ یہ دیکھیں۔۔۔'' اس نے فائلوں کو کاؤنٹر کی سرد پتھریلی سطح پہ کھسکایا۔

بھورے بالوں والی پروفیسر فائلیں کھول کھول کر دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پہ خوف تھا۔

''یعنی یہ نارمل ہیں۔ اس دھڑ کے نیچے ان کا ڈھانچہ وہی ہے، صرف ٹانگیں الگ بننے کی بجائے ان پہ مچھلی نما کھال اور چانے بن گئے اور یہ جڑ گئیں۔ اس کا مطلب ہوا یہ ٹھیک بھی ہو سکتی ہیں۔''

دوسری پروفیسر نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسی وقت ایک ڈیوٹی ڈاکٹر گھبرائی ہوئی داخل ہوئی۔ اس نے شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی اٹھا رکھی تھی، جیسے فتح کا نشان بناتے ہیں اور اس کا رنگ پیلا پڑا ہوا تھا۔

وہ تیزی سے ان کے قریب آئی۔ ''دو'' پھولے سانسوں کے درمیان اس نے بمشکل کہا۔

بھورے بالوں والی پروفیسر اچھل کے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''دو بچے اور ویسے ہی، یعنی آج جتنے بچے پیدا ہوئے وہ سب''

جوان ڈاکٹر کے بالائی ہونٹ پر پسینے کے قطرے تھے اور وہ خوفزدہ بلی کی طرح اپنے پنجوں پہ تنی کھڑی تھی۔

''وائرس، زکا وائرس کی طرح''۔ دوسری پروفیسر اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے چلائی۔

تینوں ڈاکٹرز ایک دم خاموش ہو گئیں۔ ایک ہی بات تینوں کو بیک وقت سوجھی تھی۔ مگر بولنے کی ہمت کسی میں

نہ تھی۔

چند لمحوں کے توقف کے بعد، بھورے بالوں والی پروفیسر جیسے نیند میں بولی۔ ''اس کا مطلب ہے صرف ہمارے ہسپتال ہی میں نہیں، اور سب جگہ بھی ایسے کیس آئے ہوں گے، یعنی اب کوئی بچہ نارمل پیدا نہیں ہوگا؟'' نرسنگ سٹیشن پہ موجود لوگوں کے چہرے نچڑ گئے۔ انہیں لگا کہ یہ سب ایک خواب ہے، کسی سائنس فکشن فلم کا حصہ۔ وہ سب جانتے تھے کہ بہت سے بچے نارمل پیدا نہیں ہوتے۔

دو روز قبل ہی ایک عورت کا آپریشن کیا گیا تھا کہ اس کے ہاں اولاد نہ ہو۔ کیونکہ اس کے ہاں جو بھی بچہ پیدا ہوتا تھا، اس کا دماغ اور کاسۂ سر مکمل نہیں ہوتا تھا۔ پیدائش کے چند گھنٹوں بعد یہ بچہ مر جاتا تھا۔ اب ڈاکٹروں نے مشترکہ طور پہ یہ فیصلہ کیا تھا کہ اسے مزید اذیت سے گزارنے کی بجائے، بیضہ دانیوں کی نالیاں بند کرنے کا آپریشن کر دیا جائے۔

اسی طرح دو بچے ایسے پیدا ہوئے تھے جن کی تین ٹانگیں تھیں اور ایک بچے کی تو تین آنکھیں تھیں اور اس کے باریش نانا جی نے طیش میں اسے دجال کا جنم تک کہہ دیا تھا۔ وہ بے چارہ تین دن کے اندر اندر مر گیا۔

یہ بچے لمبی عمر نہیں پاتے، مینگولین، ٹرنر، موسیک، مائیکرو سفالی، جو سب کے سب بظاہر ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، مگر سائنسی لحاظ سے فرق۔ ایسے بچوں کی پیدائش سے ڈاکٹرز نہیں گھبراتے۔ مگر یہ بھی تو ہے کہ یہ بچے کوئی ہزاروں میں ایک پیدا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر نے سامعین کو دیکھا اور اسے لگا ان سب کی آنکھوں میں ایک سی مجرمانہ چمک تھی۔ ایسی چمک جو غار کے انسان کی آنکھ میں اس وقت ابھرتی ہوگی جب وہ کسی دوسری نوع کے جانور پہ جھپٹنے کو تیار ہوتا ہوگا۔

''لیبر روم میں اب کتنے کیس ہیں؟'' اس نے جوان ڈاکٹر سے پوچھا۔

''پانچ''۔

''دیکھو اگر وہاں بھی یہ بچے پیدا ہوئے تو ہمیں محکمۂ صحت کو انفارم کرنا پڑے گا۔ یہ یقیناً کوئی وائرس ہے اور شائد پہلے سے موجود تھا صرف رپورٹ نہیں ہوا۔ اب اس قسم کے موسمی حالات ملے کہ پھیل گیا''۔ ڈاکٹر کی آواز ہموار تھی۔ اس کی جبلت نے اسے ایک بار پھر سہارا دیا تھا۔ وہ اور اس جیسے انسان، ان نئے پیدا ہونے والوں کو شکست دے سکتے تھے۔

جنگ سے پہلے کا خوف زائل ہو چکا تھا اور جنگ کی وحشت اس کے بھورے بالوں سے لے کر اس کے پورے وجود پہ چھا رہی تھی۔

تب ہی وہ دونوں باتیں ہوئیں۔ لیبر روم سے آنے والی آیا نے بتایا کہ ابھی جو بچہ پیدا ہوا وہ نارمل ہے اور اس کے ساتھ ہی اس زور کا زلزلہ آیا کہ ہسپتال کی عمارت ہل کر رہ گئی۔ اسی زلزلے میں نرسری کی چھت سے سیمنٹ کا بلاک پنکھے سمیت ان نومولود جل پریوں پہ گرا اور جب ملبہ صاف کیا گیا تو وہاں صرف کچلا ہوا گوشت تھا۔ ان کی بات

کا کوئی ثبوت کسی کے پاس نہ تھا اور پھر جنگ تک، بلکہ اس کے بعد بھی کوئی جل پری پیدا نہ ہوئی اور نہ ہی کوئی ابنارمل بچہ پھر کبھی پیدا ہوا۔

بھوریوں والا علاقہ اب ویران نہیں رہا تھا۔ لوگ اپنے ابنارمل بچے یہاں چھوڑ جاتے تھے۔ دو سروں والے بچے، چار آنکھوں، پانچ ہاتھوں اور جڑے ہوئے سروں والے جڑواں۔ ہوتے ہوتے یہاں رہنے والے، ان نئے انسانوں سے (جو اپنی انواع کے آخری تھے کہ اس کے بعد عجیب الخلقت بچے کبھی پیدا نہیں ہوئے) سخت پریشان رہنے لگے۔ ان کو ہر وقت کھانے کو چاہیے تھا۔

یہ روتے تھے، حلق پھاڑ پھاڑ کے اور رینگتے تھے، چلنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہوا میں ہاتھ چلاتے تھے۔ مدھو، مسز بترا اور شاماں ان کے لئے انتظامات کر کر کے عاجز آ گئے تھے۔ شاماں کے ہاں مرا ہوا بچہ پیدا ہوا۔

وقت نہائت بے حیائی اور ڈھٹائی سے ایک مخنث گوانسان کی طرح دنیا کے سب کونوں میں بڑے دھڑلے سے گزرتا گیا۔ دن پر دن، موسموں پہ موسم اور سالوں پر سال۔

شاماں کا مردہ بچہ بالکل مینے جیسا تھا۔ کانا بچہ۔ ایک آنکھ پہ سفید جھلی چڑھی ہوئی تھی۔ شاماں اسے یاد کر کر کے روتی تھی۔ اگر وہ زندہ رہتا تو شائد کوئی گتھی کھول سکتا۔ شاید اس الجھن کے سرے اس کے ہاتھ لگ جاتے۔ مگر پیدائش کے وقت اس کی آنول نال، سانپ کی طرح اس کے گلے کے گرد کس گئی اور ہر درد کے دورے کے ساتھ مزید کستی گئی۔ یہاں تک کہ اس بیچارے کا دم گھٹ گیا۔ اس کی آنتوں میں موجود کاہی مواد جسم سے خارج ہوا اور منہ کے ذریعے دوبارہ اس کے جسم میں چلا گیا۔ رحمِ مادر میں موجود سفیدی مائل مائع اس مواد سے زہریلا ہوا اور آنول کے گلا گھونٹنے سے مرنے والے جینین کی موت کو یقینی بنا گیا۔

اس مرے ہوئے بچے کو، آنول، پلیسینٹا اور پانی کی اس تھیلی (جس میں اس نے اپنی زندگی کے نو ماہ گزارے تھے) کی باقیات سمیت بھوریوں میں دفن کر دیا گیا۔

یہ پہلی قبر تھی جو بھوریوں پہ بنی اور مینے کا بچہ وہ پہلا فرد تھا جو یہاں مرا۔

یہاں کے رہنے والے ابھی تک موت سے نابلد تھے۔ عرفان صاحب نے انہیں بتایا نہیں تھا مگر وہ جانتے تھے، ان کی آدھی ادھوری باتوں سے وہ جانتے تھے کہ یہ جنگ جو انسان صدیوں سے عناصر کے خلاف لڑتا آ رہا ہے، آخر کار اس نے ہارنی ہے۔ وہ ہارنے والا ہے اور اس جنگ کے خاتمے پہ ہر فاتح کی طرح، وہ بھی انسانوں کو ختم کر دیں گے۔

نازنین، اسرار، مدھو، مسز بترا، دادی، عرفان صاحب، بابا جی، شاماں، یہ سب لوگ یا تو ان کے ہاتھوں یا پھر بھوریوں میں رہنے والے دوسروں کے ہاتھوں، ایک دردناک موت مرنے والے تھے۔ وہ سب جو، سالہا سال سے ان کو پال رہے تھے، ان کے کھانے پینے، رہنے سہنے اور آرام کا خیال رکھ رہے تھے۔ ان سب کو مرنا تھا۔ ایک لازمی اور یقینی موت۔ جس کے بعد دنیا ایک نئے دور میں داخل ہونے والی تھی۔

اس کے باوجود، شاماں کے بچے کی موت نے ان کو دکھی کر دیا۔ ایک عجیب سے خوف نے ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کون تھا وہاں؟ بھوریوں کی اس قلمرو میں، جو اپنے کسی عظیم منصوبے کی تکمیل میں لگا ہوا تھا؟

ریت پہ بننے والی لکیریں، اجنبی زبان میں لکھے گئے صحیفے بن گئیں، جن کو کوئی نہیں پڑھ پاتا تھا۔ درخت اپنی اپنی جگہوں پہ خاموش کھڑے رہتے تھے اور اس موت کی نحوست، بھوریوں پہ ایک سرمئی دھند کی طرح چھا رہی تھی۔

سب اکتا چکے تھے۔ اپنے ہاتھوں اپنی موت کا اہتمام کرنا، اتنا خوشگوار عمل تو نہیں تھا۔ گو انسان جانتا ہے، ہر صحیفے میں یہ ہی لکھا ہے کہ انسان کو ختم ہونا ہے۔ جلد، وہ دن آئے گا جب پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی طرح اڑیں گے اور سورج سوا نیزے پہ آ جائے گا۔ لیکن ان کا کردار کیا تھا؟

اب تو کسی نے بھی کسی سے بھی سوال کرنا چھوڑ دیا تھا۔ پھر وہ رات آئی جب وہ زلزلہ آیا، جس نے زمین کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس رات بھوریوں پہ موجود سب انسان مر گئے۔

سوائے نازنین اور اسرار کے۔ نازنین اور اسرار بڑی مدت زندہ رہے۔ بھوریوں پہ رہنے والوں کے لئے خوراک کا بندوبست کرتے رہے۔

پھر ایک دن انہوں نے سوچا کہ جا کے دیکھا جائے ہوا کیا ہے؟ سب کو مار دینے والے اس زلزلے کے باوجود وہ سیلاب نہیں آیا، جس کی وعید عرفان صاحب نے دی تھی۔ وہ بڑا سیلاب، جو سب کو نگلنے والا تھا۔

جنگ، زلزلے اور باقی سب عذاب پورے ہوئے کبھی دھند آئی، کبھی بے موسم بارشیں، کبھی سانپوں کی نسل ختم ہونے کا غلغلہ اٹھا اور کبھی شہد کی مکھیاں ناپید ہوئیں۔ لیکن وہ سیلاب نہ آیا۔

جل پریاں جوان ہوئیں، فضل الٰہی اور منظور کی بیٹی بوڑھیا گئے، مگر کچھ نہ ہوا۔ دنیا ویسی کی ویسی رہی۔ ایک بھی ڈیم میں بال تک نہ آیا۔

نازنین اب اکثر زمین میں پڑنے والی اس دراڑ کے کنارے بیٹھ کر بڑی بھیانک آواز میں رویا کرتی، جس میں اس روز بھوریوں میں رہنے والے سب انسان گر کے مر گئے تھے۔

پھر ایک دن جب نازنین اپنے معمول کے مطابق بین کر رہی تھی تو اسرار نے اس سے کہا کہ انہیں خود جانا ہوگا، یہ دیکھنے کہ ہوا کیا ہے؟ آخر عذاب کیوں نہیں آ رہا؟

لیکن اس سے پہلے یہ بتا دوں کہ زلزلے والی رات کیا ہوا تھا؟ زمین پھٹنے اور سانپوں کی بانبی سے خزانہ نکلنے سے پہلے ہوا کیا تھا؟

(۴۰)

اس رات، بھوریوں کی ریتلی زمین پہ ہوا کے بنائے نقش ونگار تیزی سے بدل رہے تھے۔ جنوری کی راتوں کا چاند آسمان پہ ننگا تھا اور درخت اپنی منہ زوری میں تنے کھڑے تھے۔ وہ سب جنھوں نے یہاں پناہ لے رکھی تھی ایک سکوت کے عالم میں اپنے اپنے ٹھکانوں میں سو رہے تھے، سوائے عرفان صاحب کے۔

فضل الٰہی، بابا جی، نازنین، رخسانہ اور شاماں کے آجانے کے بعد انہیں اپنا آپ ایک فالتو پرزے کی طرح لگتا تھا۔ وہ کون تھے؟ صرف آلۂ کار؟ انہیں اپنا آرام دہ بنگلہ یاد آتا تھا، فرانسیسی پرفیوم، جالی دار پردے، اطالوی ٹائیلیں اور شاہدہ۔ کلب کی شامیں اور وہ تمام حسین عورتیں جوان کے ساتھ مباشرت کی شدید خواہش رکھتی تھیں مگر تہذیب کے رسوں نے انہیں کس کس کے اپنے کھونٹوں سے باندھ رکھا تھا اور یہ صورتحال کتنی دلچسپ تھی۔

کاش وہ منحوس دن ان کی زندگی میں نہ آیا ہوتا۔ کاش انہوں نے اس انگریز کے ساتھ جو نا جانے کیوں اس معاملے میں اتنی دلچسپی لیتا تھا اس جگہ کا معائنہ کرنے سے انکار کر دیا ہوتا۔ یہ وہی جگہ تھی، جہاں آج کل منگلا ڈیم کی جھیل ہے۔

اس جوگی کو انہوں نے وہیں دیکھا تھا۔ منگلا دیوی کے قلعے میں اور پھر مندر میں اور پھر دوبارہ قلعے میں اور پھر ان کی چھولداری میں۔ جھٹپٹے کا سماں تھا اور ان کا باورچی علی محمد راولپنڈی سی۔ ایس۔ ڈی سے خریدی ہوئی ٹن میں بند مچھلی اور توس کے ساتھ کافی بنا کر لایا تھا۔ عرفان صاحب نے وہ مچھلی جوگی کو بھی دی۔ تب اس نے ایسی پھریری لی جیسے اس کے سامنے اس کے ہی کسی سگے کا گوشت رکھ دیا گیا ہو۔

ڈبل روٹی البتہ اس نے بڑی رغبت سے کھالی۔ دور منگلا کے گاؤں میں چند ایک چولہے اور چراغ اب بھی ٹمٹما رہے تھے۔ کتنے ہی گھر خالی ہو چکے تھے۔ یہ گاؤں اب دریا برد ہونے والا تھا۔ انسان وشوامتر کی طرح اپنی طاقت کے نشے میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ بھی آبادیوں کی قسمتیں لکھ سکتا ہے۔ دریاؤں کا رخ موڑنے پہ قادر ہے اور چاہے تو ایک نئی سورگ بنا سکتا ہے۔

جوگی بڑے تأسف سے گاؤں کی روشنیوں کو دیکھ رہا تھا۔ عرفان صاحب کو بھی دکھ ہوا۔ شائد وہ اسی گاؤں کا

رہنے والا تھا۔ مگر عرفان صاحب نے ہجرت کی تھی۔ بڑی خونی ہجرت۔ ان کا دل پتھر کا ہو گیا تھا۔ وہ بڑی سفاکی سے سوچا کرتے تھے کہ ان لوگوں کو تو ایک ایک شے یہاں سے اٹھا کر لے جانے کا موقع مل رہا ہے، انگلینڈ میں نوکریاں مل رہی ہیں، اور کیا چاہئے انہیں؟ اور پھر پانی۔ آخر پانی کو بھی تو کہیں جمع کرنا تھا۔ تاکہ جن تین دریاؤں کو سوکھنا تھا ان کی کمی پوری کی جا سکے۔

یہ سب باتیں انہوں نے جوگی سے بھی کیں۔ جوگی کے چہرے پہ تشویش کے بڑے بڑے کالے کوے اڑنے لگے۔ مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ چپ چاپ بیٹھا ڈبل روٹی چباتا رہا اور ایسا کرتے ہوئے وہ ایک بڑی سی انسانی جسامت کی مچھلی لگ رہا تھا وہ مچھلی جو پانی سوکھنے پر کیچڑ میں رہتی ہے۔ کالی، بڑے سے منہ والی، ڈمرا مچھلی۔ جب سورج کی تمازت سے کیچڑ بھی خشک ہونے لگتی ہے تو یہ ڈمرا مچھلی بالکل اس جوگی کی طرح بڑے بڑے منہ کھول کے سانس لیتی تڑپتی نظر آتی ہے اور آخری ڈمرے کے مرنے تک یا تو بارش ہو جاتی ہے یا سیلابی پانی کا کوئی بھولا بھٹکا ریلا ان تالابوں، پوکھروں، دریا کی شاخوں اور جوہڑوں کو لبریز کر دیتا ہے جہاں یہ ڈمرا رہتا ہے۔

ڈمرا بچ جاتا ہے ساری مچھلیوں کے مرنے کے بعد بھی اور پھر پتا نہیں کہاں سے ان تالابوں، پوکھروں، دریا کی شاخوں اور جوہڑوں میں ہزار ہا طرح کی رنگ برنگی انواع واقسام کی مچھلیاں آجاتی ہیں اور ان مچھلیوں کو کھانے کو آبی پرندے اور ان پرندوں کا شکار کرنے کو عقاب اور باز اور مومولے اور ان عقابوں، بازوں اور مومولوں کو کھانے کو باگڑ بلے اور گیدڑ اور لومڑیاں۔

جوگی اس شام اندھیرا پڑنے تک کیمپ فائر کے پاس بیٹھا دور جھلملاتی منگلا گاؤں کی آخری روشنیوں کی دیکھتا رہا تھا۔ پھر جاتے جاتے ان سے ان کے گلبرگ والے گھر کا پتا لے گیا۔

اس دوپہر وہ ان کے بنگلے پہ آیا تو اس کی چال میں وہ وقار تھا جو خوب ڈٹ کر لڑنے کے بعد ہار جانے والے راجہ کی چال میں اس وقت ہوتا ہے جب وہ ہتھیار ڈالنے آتا ہے۔ لیکن جب وہ بولا تو اس کی آواز میں وہ عیاری تھی جو گوریلا جنگ شروع کرنے والے کمانڈر کے لہجے میں ہوتی ہے۔ اس نے وہ سانپ انہیں سونپ کر ان کی بربادی کا آغاز کیا تھا۔

جس دن سے وہ سانپ ان کے پاس آیا تھا عجیب وغریب واقعات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ مگر جانے کیوں انہیں یقین تھا کہ جو کچھ بھی ہو گا، جس ڈرامے کا پردہ بھی اٹھے گا، اس کا ہیرو، ان کا بیٹا باؤ اسرار ہو گا۔ منظور کی بیٹی کو جن دقتوں سے وہ یہاں لائے تھے اور پھر جن جتنوں سے وہ اس قطعے پہ قابض رہے تھے ان کا سوچ کر ہی خون کھول اٹھتا تھا۔

اتنی قتل وغارت اتنی ڈرامہ بازی کے بعد جس میں قدرت بھی ان کا ساتھ دیتی رہی تھی اب جا کے یہ معلوم ہوا کہ کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں؟ ظہور کی بیٹی اور فضل الٰہی، بس ان ایک جیسے دو جانداروں کو آپس میں ملانے کا ڈرامہ تھا یہ؟ وہ نرم ریت پر، جس پہ بھوریوں میں رہنے والوں کے چلنے کے نشان ہوا نے مٹا دیے تھے پشت کے بل

لیٹ گئے۔

اوپر ماگھ کا آسمان جگمگا رہا تھا۔ سارے تارے، کہکشائیں، جن میں جانے ہم جیسی کتنی دنیائیں آباد ہیں اور ان پہ جانے کتنے دریا بہتے اور کیسے کیسے عظیم الشان پہاڑ ہیں اور ان کے دیوی دیوتا اور خدا۔ جانے وہ بھی اس طرح کے زعم میں مبتلا ہوں گے یا نہیں؟ جانے وہ ہوں گے بھی یا نہیں؟

عرفان صاحب نروان کی کسی منزل تک نہ پہنچ سکے۔ آسمان سے کوئی اشارہ نہ آیا۔ سواء اس کے کہ اب ان پاس کچھ عجیب الخلقت بچے اور چند جل پریاں تھیں۔ ان سے وہ زیادہ سے زیادہ ایک سرکس کھول سکتے تھے اور باؤ اسرار کو اس سرکس کا منیجر بنا سکتے تھے۔ جہاں وہ سرکس میں کرتب کرنے والی عورتوں کے ساتھ خرمستیاں کر کے اپنی باقی زندگی گزار دیتا۔

مارے دکھ کے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ان آنسوؤں میں کہکشاؤں کا عکس ڈبڈبانے لگا، تارے ٹوٹ کر پھیل گئے اور سرد ہوا کا جھونکا، ریت کی باریک سی تہہ ان کے بالائی جسم پہ پھیلا گیا جو برہنہ تھا اور سورج کی تمازتیں سہہ سہہ کر سیاہ پڑ چکا تھا۔

اگر وہ اس ولد الحرام جوگی کے کہے میں آ کر اپنی پرسکون زندگی تج کے یہاں نہ آتے تو آج یقیناً وہ کسی بہت بڑی پوسٹ پر ہوتے۔ قیمتی سگار، شراب، عورتیں، اختیارات، وہ سب کچھ جس کا وعدہ خدا نے جنت میں کر رکھا ہے انہیں میسر ہوتا۔ خدا غارت کرے اس جوگی کو۔

تب انہیں یاد آیا کہ جوگی نے کیا کہا تھا؟ کیا جوگی نے ان کو یہ سب کرنے کو کہا تھا جو انہوں نے کیا؟ اس نے تو صرف انہیں وہ سانپ دیا تھا اور اسے بچانے کو کہا تھا کیونکہ منگلا کا گاؤں، انسانوں کے حکم سے زیرِ آب آ گیا تھا اور جوگی وہاں سے یہ سانپ بطور یادگار اٹھا لایا تھا۔

یہ سوچ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور باوجود سردی کے انہیں پسینہ آ گیا کہ باقی سب کچھ جو ہوا اور انہوں نے کیا اس میں قطعاً کسی کا ہاتھ نہ تھا وہ سب ان کے اپنے فیصلے تھے۔

اس شام مدھو کے آنے پہ جو کچھ ہوا اور اس کے بعد یہاں آنے کا فیصلہ اور بعد کے سب فیصلے کس کے تھے؟

انہیں میاں اللہ یار یاد آیا۔ جسے وہ ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ تو وہ اللہ یار نہیں جس سے میں ملا تھا۔ اللہ یار ایک خوف میں مبتلا رہا۔ اپنی طرف آنے والی ہر مشکل اسے اپنی بدنیتی کا پھل لگتی تھی۔ وہ بھوریوں سے ڈرتا تھا کیونکہ وہاں عرفان صاحب کی عملداری تھی۔

وہ اپنی جگہ پہ اٹھ بیٹھے۔ درخت اپنی اپنی جگہوں پہ ان سپاہیوں کی طرح کھڑے تھے۔ جنہوں نے بوجوہ اپنی جگہ سے تا دمِ مرگ نہ ہلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ عرفان صاحب نے غور سے دیکھا کوئی ان کی طرف چلا آ رہا تھا، یہ جنگ سے پہلے کی رات تھی۔

بابا جی ریت پہ چلتے ہوئے ان کے قریب آ بیٹھے۔ عرفان صاحب نے دیکھا ان کے چہرے پہ وہ بے نیازی

اور سکون تھا جوان کے چہرے پہ اس وقت ہوتا تھا جب وہ شروع شروع ان بھوریوں میں آئے تھے۔ انہیں بڑے زور کی ہنسی آئی اور ہنسی کے اس دورے میں وہ پشت کے بل ریت پہ جا گرے اور ہاتھ پاؤں پٹخ پٹخ کے اتنے زور سے ہنسے کہ درختوں پہ سوئے پرندے پریشان ہو گئے۔

جب ہنسی تھمی تو انہیں ایک بار پھر وہی خیال آیا کہ جوگی نے تو انہیں بس سانپ دیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا وہ تو سب ان کی مرضی سے ہی ہوا۔ وہ ایک بار پھر اٹھ کر اکڑوں بیٹھ گئے اور ان کے بازو درخت کی شاخوں کی طرح ان کے گھٹنوں سے آگے نکلے ہوئے تھے۔

ہنسنے اور دوبارہ سوچ میں کھو جانے کی اس ساری کیفیت کے دوران باباجی خاموش بیٹھے رہے۔ کیا بولتے؟ علم تو ان کے پاس بھی کوئی نہ تھا۔ انہیں صرف ایک اندازہ تھا اور وہ یہ کہ ایک جنگ ہوگی۔ یہ انہیں کیونکر معلوم ہوا، اس کا جواب ان کے پاس بھی نہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہوا میں سرن تھی، دو روز پہلے برسنے والی بارش کی خنکی اور وہ دونوں دو بے بس جانداروں کی طرح کھلے آسمان کے نیچے ریت پر بیٹھے تھے۔

اچانک باباجی نے بولنا شروع کر دیا۔ جیسے سرد راتوں میں کوئی گیدڑ نا قابلِ فہم آواز میں چلاتا ہے۔ اسی طرح بغیر تمہید کے وہ بولنے لگے اور بتانے لگے کہ جنگ بہت اچھی چیز ہے اور زلزلے اور سیلاب بھی، کیونکہ ان آفتوں میں انسان مر جاتا ہے۔ بولتے بولتے وہ ہانپنے لگے اور پھر چاند کی طرف منہ اٹھا کے کسی جن گزیدہ انسان کی طرح ہنسنے لگے۔ انہوں نے بھوریوں کی تعریف کی۔ ذخیرے کی ویرانی پہ خوش ہوئے اور اعلان کیا کہ نازنین کے ساتھ رات گزارنے کے بعد جنرل فہیم ضرور جنگ کے لئے آمادہ ہو جائیں گے۔

عرفان صاحب کے استفسار پہ وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگے۔ پھر جیسے اچانک انہوں نے بولنا شروع کیا تھا، اسی طرح اچانک وہ خاموش ہو گئے۔

جانے کتنی دیر وہ اسی طرح ایک دوسرے کے سامنے خاموش بیٹھے رہے شائد رات کا پورا پہلا پہر گزر گیا۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ جنڈ کی کٹی سے دو سائے سے اس طرف آ رہے ہیں۔ آنے والے نازنین اور اسرار تھے۔ ڈھیلے ڈھیلے قدم رکھتے، ہاری ہوئی انقلابی فوج کے جوان، جو فائرنگ اسکواڈ کے سامنے جا رہے ہوں۔ ان کا ہر قدم جیسے ان کے ٹوٹے ہوئے خوابوں پہ پڑ رہا تھا اور کیا انہوں نے کوئی خواب دیکھے بھی تھے؟

قصہ چہار درویش کے درویشوں کی طرح وہ دونوں بھی ریت پہ بیٹھ گئے۔ آسمان پہ چاند ٹنگا ہوا تھا اور ان سب کے پاس کہنے کو کوئی بات نہ تھی۔ یہ چاروں جو تہذیب کے اعلیٰ ترین مظاہروں، انسانی ترقی کے سب فوائد سے بہرہ مند ہونے والوں میں سے تھے۔ اس وقت برہنہ پا ژولیدہ مو، ریت پہ بیٹھے تھے اور خود کو صوفیوں، اولیاؤں، جہاں گرد جوگیوں اور فنافی الذات مجذوبوں کی صف میں شامل سمجھ رہے تھے۔

مگر وہ تھے کیا؟ اور اب تک جو کچھ ہوا تھا، جو کچھ ان سے سرزد ہوا تھا اور جو کچھ ان کے ساتھ پیش آیا تھا اس میں وہ خود کہاں تھے؟ چاروں کو اپنی اپنی کمتری، اپنی اپنی لاعلمی کا یقین تھا۔ ساتھ ہی ساتھ باقی تینوں پہ رشک آتا تھا

کہ یقیناً یہ ہم سے زیادہ باشعور ہے اور وہ چوتھی سمت جس کا ہمیں علم نہیں، اس پہ آشکارا ہے۔

کتنی ہی دیر چاروں خاموش بیٹھے رہے پھر نازنین گویا ہوئی۔ اس کی آواز میں بھوریوں میں رہنے والے شکر خوروں کی نغمگی تھی۔

''جنگ ہوگی، مجھے معلوم ہے۔ فہیم کے چہرے پہ وہ خوف تھا جو ہر اس شخص کے چہرے پہ ہوتا ہے جسے اجتماعی بھوک اور موت سے ڈر لگتا ہے۔ اجتماعی خوف کے تحت وہ لڑتا ہے۔ چنگیز خان، امیر تیمور، ہلاکو خان، تاریخ کے سب سے بڑے جنگجو تھے اور انسانیت کے محسن۔'' وہ ایسے بولی جیسے یہ سبق اسے کسی نے یاد کرایا ہو۔

نازنین کے بعد بھی بہت دیر تک کوئی نہیں بولا اور ایک پہر گزر گیا۔ جس میں صرف ہوا کی سائیں سائیں اور جھینگروں، مکوڑوں کی تن تن دب دب کے کوئی آواز نہ تھی۔

رات کے تیسرے پہر اسرار بولا اور اتنی دیر تک بولا کہ وہ پہر ختم ہوگیا اور جل پریوں کی موت کا سبب بننے والے زلزلے کے جھٹکوں کا اثر بھوریوں تک آگیا اور وہ چاروں ایسے اچھلے جیسے بھٹیاری کی بھٹی میں مکئی کے دانے بھنتے ہوئے اچھلتے ہیں اور پھر یوں منہ کے بل گر گئے جیسے قدیم انسان ان دیکھے خداؤں کے آگے جھکتے تھے، خدا جو ہر چیز پہ قادر ہے، جو بے نیاز ہے، جس نے ان گنت کہکشائیں اور ان دیکھی دنیائیں تخلیق کر رکھی ہیں اور جو شہ رگ سے بھی نزدیک ہے اور سات آسمانوں کے پار، کئی پردوں میں نہاں ہے، جو 'اناالحق' کہنے والے منصور کا رب بھی ہے اور عرفان صاحب جیسے ملحد کا بھی۔

وہ چاروں سجدے میں پڑے رہے اور انہوں نے گاؤں کی طرف سے چیخ وپکار کی آواز سنی، تب وہ جان گئے کہ یہ وہی آواز ہے، جس کا ذکر اسرار نے کیا تھا اور انہیں معلوم ہوگیا کہ اسرار کون ہے، لیکن اب مہلت ختم ہو چکی تھی۔

زلزلے سے پہلے جب اسرار نے بولنا شروع کیا تو ان تینوں کو یقین تھا کہ وہ کوئی اہم بات ہی کرے گا۔ نازنین جو اس سب تماشے کا حصہ بننے پہ شدید ناخوش تھی، چاہتی تھی کہ اس ڈرامے کا جلد ڈراپ سین ہو۔ جنرل فہیم کے ساتھ گزاری اس رات کی لجلجی اور ٹھنڈی یادیں، کینچوؤں اور جونکوں کے سرد اور چپچپے لمس کی طرح اس کے حواس پہ سوار تھیں یوں تو اسے اپنے گٹھے اور کم عقل شوہر سے بھی کوئی خاص انس نہ تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اسرار پہ عاشق تھی۔

اسے واپس جانا تھا اور وہ چاہتی تھی، جو ہونا ہے ہو جائے تا کہ وہ رخسانہ اور اسرار اور ان سب لوگوں سے تا عمر کے لئے مکت ہو جائے۔

عرفان صاحب کو یقین تھا کہ وہ خواہ مخواہ اپنی ہی سوچ اور توہم پرستی کے پھندے میں گرفتار ہو کر اپنی زندگی کے سونے جیسے دن ضائع کر چکے ہیں۔

بابا جی ایک 'کلک' تھے جو صرف دو چار پیش گوئیوں کی وجہ سے مشہور ہو گئے تھے۔ اب ان سب کی نظریں اسرار پہ لگی ہوئی تھیں کہ وہ کیا کہتا ہے۔

''مجھے دکھ ہے کہ ہم عام انسانوں کے لئے تکلیف کا باعث بنے۔ جہاں ہم جاتے ہیں، اجاڑ لاتے ہیں۔ چاہے وہ آپ ہوں عرفان صاحب، یا آپ بابا جی، یا تم نازنین۔ ویرانے، جنگل، کھنڈر یہ سب ہم جیسوں کی وجہ سے ہیں کیونکہ ہم انسانیت کے دشمن ہیں۔''

وہ سانس لینے کو رکا اور اپنا ہاتھ بہت ڈرامائی انداز میں عرفان صاحب کی طرف اٹھایا۔

''سچ کہیے، آپ کے دل میں مدھومتی کے ساتھ وقت گزارنے کی خواہش تھی یا نہیں؟ اور آپ نے صرف اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لئے باقی ڈھونگ رچایا۔ چونکہ آپ دونوں مروجہ، اخلاقی معیاروں تلے دبے ہوئے تھے۔ اس لئے آپ نے اور مدھومتی بترا نے خواہ مخواہ ایک اسرار کا تانا بانا بنا۔

یہ زندگی جو آپ نے اختیار کی، کسی آسمانی اشارے کی وجہ سے نہیں کی بلکہ آپ کا احساسِ جرم آپ کو کھا گیا۔

جہاں اللہ یار کو بھی اس کے احساسِ جرم سے [illegible]
[illegible] ۔۔۔''

یہاں پہنچ کر وہ بے بسی سے عرفان صاحب کو دیکھنے لگا۔ [illegible]
نے [illegible] کے گلا صاف کیا اور کہا: ''نور کو بیٹی سمجھنے [illegible]
میں اور نازمین، ایک فطری مگر معاشرے کی نظر میں غلط تعلق کے مرتکب ہوئے۔ [illegible]
چمکتی ہوئی آنکھیں اور وہ سب کچھ جو ہم نے وہاں دیکھا، ہمارے تخیل کی پیداوار تھا۔ کیونکہ ہم نے فطرت کو [illegible]
تم اور میں، عرفان صاحب اور مدھوتی، شاماں اور جیا۔ ہم تینوں نے قدرت کے اصولوں کو پورا کیا [illegible]
تھی۔ مگر ہم پر ہماری سوچ اور معاشرے کے اصول اتنے حاوی تھے کہ ہم نے اسے ایک گورکھ دھندہ بنا دیا۔ [illegible]
اسرار کا ایک پردہ منڈھ دیا۔''

نازمین جو بڑی دیر سے اسرار کی بات سن رہی تھی، دانت کچکچا کر اس پہ چیخی۔

''اگر تمہارے ہاں ایک آنکھیں نہ جھپکنے والی جل پری پیدا ہوتی اور تمہارا شوہر اسے مارنے کے لئے بلاوہ لئے اس کے پیچھے پھر رہا ہوتا اور اگر تم نے اس بچی سے چھٹکارہ پانے کے لئے ایک پوری رات سیلن زدہ بستر پہ بچھوؤں اور جونکوں کے سرد لمس کے ساتھ گزاری ہوتی تو اسرار! تم بھی اسے بکھیڑا نہ کہتے۔ یہ جل پریاں کون ہیں؟ کون ہیں؟''

تب عرفان صاحب کو لگا الفاظ کا ایک گولا سا ان کے حلق میں پھنسا ہوا ہے جسے نکال پھینکنا لازمی ہے۔

''اسرار! بات یہ نہیں ہے، بات یہ ہے کہ دریا پلٹ کر آئے گا، سمندر اپنا حق مانگے گا، پہاڑوں کے جو پتھر جہاں جہاں سے کاٹے گئے ہیں، واپس جائیں گے۔ ایک ایک نوع، جسے انسان نے ختم کیا ہے، دوبارہ پیدا ہوگی۔ یہ زمین پھر سے ویسی ہو جائے گی جیسی روزِ ازل تھی مگر انسان نہیں ہوگا۔ انسان ختم ہو جائے گا۔''

وہ خاموش ہوئے تو اسرار پھر سے بولنے لگا۔

''یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، ہر صحیفے میں، ہر الہامی کتاب میں قیامت کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے جس طرح یہ دنیا اچانک بنی، اسی طرح اچانک ختم ہو جائے گی۔ اس میں اس قدر حیران ہونے کی کیا بات ہے؟''

''بات ہے، مگر تم بتا نہیں رہے۔'' اب کی بار باباجی بولے۔ ''اسرار تمہیں پتا ہے، بات کیا ہے؟ اسی طرح، جیسے مجھے معلوم تھا کہ جنگ ہوگی مگر اس کے لئے نازمین کو نعیم سے شادی کرنا ہوگی۔

مجھے اس بات کی کوئی تاویل سمجھ نہیں آئی۔ مگر یوں ہی تھا۔ اسی طرح تمہیں معلوم ہے کہ یہ سب کیا ہے۔ نہ شاماں جانتی ہے، نہ میں، نہ عرفان صاحب اور نہ مدھوتی۔''

اسرار جیسے خوفزدہ ہو گیا، اس بچے کی طرح جس نے گھر کی کوئی قیمتی چیز چھپائی ہو اور اب اسے واپس کرنے کی بجائے وہ ادھر ادھر کی لاتیاں پوتیاں لگا رہا ہو۔

پھر سب کی گھورتی نظروں کے سامنے وہ ٹھہر نہ سکا اور بڑے شکستہ انداز میں اس نے وہ سب بتا دیا جو اسے

معلوم تھا۔

''قیامت وہ وقت ہے جو قدرت نے انسانوں کے خاتمے کے لئے رکھا تھا۔ مگر جب انسانوں نے بند بنائے سد مارب کا قصہ سنا ہے آپ نے؟ ہاں اس سے بھی پہلے سے انسان بند بنا رہا ہے اور ہمیشہ ان ہی بندوں کے پانیوں میں ڈوب کر مرا۔ طوفانِ نوح میں سب انسان مر گئے، کئی انواع صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ پانی ہی زندگی ہے اور پانی ہی موت۔ تمام بڑے شہر، آبادیاں، تہذیبیں، دریاؤں کے کنارے پھلے پھولے۔ پرانے انسان دریا سے ڈرتے تھے۔ جانتے تھے کہ دریا سے چھیڑ چھاڑ اچھی نہیں۔ وہ اسے بھینٹ چڑھاتے تھے، جوان خوبصورت لڑکیوں کی، پھولوں کی، ناریلوں اور پھلوں کی اور اپنے مردے ان کو سونپ دیتے تھے۔ وہ ان کو دیوتا مانتے تھے۔ ان سے خائف رہتے تھے۔ پانی، پانی، پانی۔۔۔'' وہ مضطرب ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور دیوانہ وار ایک خطِ مستقیم پہ ٹہلنے لگا۔ دس قدم ادھر اور پھر ان ہی قدموں پہ ادھر، جیسے چڑیا گھر کے پنجرے میں قید بھیڑیا اضطراب میں ٹہلتا ہے۔

''زم زم بھی تو پانی ہے نا؟ قدر کرتے ہو نا؟ کھڑے ہو کر پیتے ہو، تعظیم سے۔ بوتلوں میں تبرکاً بھر بھر کے ایک دوسرے کو دیتے ہو اور جانتے ہو کہ اس کے لگائے سے زخم ٹھیک ہو جاتے ہیں، بیماروں کو شفا ملتی ہے، اندھوں کی بینائی لوٹ آتی ہے، ایسا ہے نا؟''

تینوں سر جھکائے بیٹھے رہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایسا ہے۔

''گنگا جل ہو یا ہولی واٹر، سب پانی پاک ہیں، بڑی سے بڑی غلاظت، بڑے سے بڑا گناہ، پانی میں دھل کر پاک ہو جاتا ہے۔ پانی، پانی، پانی۔۔۔''

وہ اپنے وضع کردہ راستے کے عین درمیان کھڑا ہو گیا۔ وحشت اور دیوانگی اس کے ہر ہر عمل سے ظاہر ہو رہی تھی۔

''پھر کیا ہوا؟ اس پانی کے لئے، تم نے پانی ہی کو برباد کر دیا؟ بس مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں پتا کہ یہ تباہی جو آئے گی یہ قیامت نہیں۔ صرف پانی ہے جو اپنی گزرگاہ واپس مانگتا ہے۔

یہ جنگل نہیں، جسے تم جلا دو گے، کاٹ دو گے اور وہ مٹ جائے گا۔ یہ پانی ہے۔ کیا وہ کوئی تارک الدنیا صوفی تھا، جس نے سندھ طاس کے معاہدے میں یہ لکھوایا کہ دریاؤں کی گزرگاہ میں کوئی تعمیرات نہیں کی جائیں گی، چاہے وہاں دریا بہے یا نہ بہے؟ وہ تو کوئی انجینئر تھا کوئی صاحبِ عقل، کوئی ڈگری یافتہ۔

کیونکہ اسے معلوم تھا کہ دریا واپس آئے گا اور انسان ابھی ختم نہیں ہوگا، اسی لئے یہ جل پریاں پیدا ہوئیں۔ اسی لئے انسان صدیوں سے ان کا منتظر تھا اور کون جانتا ہے کہ پہلے بھی اسی طرح جب جب انسانی تہذیبوں کو پانی نے برباد کیا تو اس سے پہلے ایسی ہی جل پریاں پیدا ہوئیں جنہوں نے نسلِ انسانی کا تسلسل قائم رکھا۔ پانی کے اترنے پہ، جنگلوں پہ ان ہی سے دوبارہ انسان پیدا ہوئے، جیسا کہ پہلے انسانوں سے یہ پیدا ہوئے۔

انسان زندہ رہے گا۔ جنگ ہوگی، زلزلہ آئے گا۔ زلزلے سے بچنے والے جنگ میں مارے جائیں گے،

جنگ سے بچنے والوں کو دریا ہڑپ جائیں گے اور جب سب کچھ مٹ جائے گا اور پانی اتر جائے گا۔ دریا اپنے معمول پہ بہنے لگیں گے اور سوکھی زمین نظر آنے لگے گی۔ تب ان جل پریوں کے ہاں اولاد پیدا ہوگی۔ جیسے یہ جل پریاں انسانوں سے پیدا ہوئیں، ویسے ہی ان کے ہاں انسان پیدا ہوں گے اور پھر، پھر دنیا بسے گی، سب کچھ ویسا ہو جائے گا، ہاں آنے والا نیا انسان دریا سے خائف ہوگا۔ اس کی موروثی یادداشت میں، جو مجھ سے، عرفان صاحب سے، مینے سے، ان تک منتقل ہوگی، ڈر ہوگا، دریا کا خوف۔

مگر۔۔۔ باقی جن کے ماں باپ کو یہ سب معلوم نہ تھا، وہ سب دریا۔۔"

اسرار کی بات یہاں تک پہنچی تھی کہ باباجی اپنی جگہ سے اٹھے اور دیوانہ وار، جنڈ کی کٹی کی طرف بھاگے۔ ان تینوں کو لمحے کی چوتھائی میں اندازہ ہو گیا کہ وہ کس ارادے سے بھاگ رہے ہیں۔ سوائے رخسانہ اور فضل الٰہی کے وہ باقی سب جل پریوں کو مارنے جا رہے تھے۔ وہ تینوں اپنی جگہ سن بیٹھے تھے اور باباجی اپنی نسل کی بقاء کی خاطر ہاتھ میں اکانہہ کی ٹوٹی ہوئی نوکدار شاخ لئے کٹی کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔ اس لمحے انہیں معلوم ہوا کہ ان کا کام کیا تھا۔ قدرت اپنا کام پورا کر چکی تھی، ان کا کام باقی تھا۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

تب ہی وہ زوردار گڑگڑاہٹ ابھری اور وہ منہ کے بل ریت پہ جا گرے۔ روز ازل سے لے کر اب تک مانے جانے والے سب خداؤں کی عظمت کے آگے انسان کا آخری سجدہ کرنے کے لئے۔ پھر زمین تڑخنے کی آواز آئی اور میاں اللہ یار کے ڈیرے میں، گھپی کوٹھڑی میں جہاں سانپوں کی بانبی تھی تڑاخا سنائی دیا اور زمین نے اپنے خزانے اگل دیئے، سونے چاندی اشرفیاں، موٹے ان گھڑ زیور اور صدیوں سے چھپایا ہوا، مال اسباب جو زمین ہی سے نکالا گیا تھا اور زمین ہی کی ملکیت تھا اس بانبی کے پھٹنے سے عیاں ہو گیا۔

محسن جو ایک مہین سی دھوتی باندھے کمر اور کولہے دبوا رہا تھا، ابھی کچھ سمجھ ہی پایا کہ بانبی سے پانی پھوٹنا شروع ہو گیا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے پوری کوٹھڑی پانی سے بھر گئی، جس میں سونے کا وہ ڈھیر ڈوب گیا۔ اپنی جان بچانے کو وہ باہر بھاگا اور اس نے دیکھا گاؤں کے لوگ، ڈیرے کے ملازم سب افراتفری میں جس کا منہ جدھر اٹھ رہا ہے، دوڑ رہے ہیں۔ بکریاں رسے تڑا رہی ہیں اور بھینسیں اپنے کلے تڑوا کر بڑی سڑک پہ بگٹٹ ہو چکی ہیں۔ نہ کسی کو کسی کی خبر تھی نہ ہوش۔

صرف ایک پکار سنائی دے رہی تھی کہ بڑی نہر کا بند ٹوٹ گیا ہے اور گاؤں میں پانی بھرنے والا ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ سرخی مائل مٹیالا پانی کھیتوں کی مینڈھیں اجاڑتا، کھڑی فصلوں کو گراتا، جانوروں، ٹریکٹروں اور درختوں کو اکھیڑتا، ادھیڑتا اپنے ساتھ بہاتا، ایک دیوار کی طرح چلا آ رہا ہے۔ یہ بڑی نہر کا پانی نہیں ہو سکتا تھا۔

ابھی وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا کہ اس نے گدلی آنکھوں والے ایک جسیم کچھوے کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس کی مہین آنکھوں میں وہ بھوک تھی جو غار کے انسان کی آنکھ میں کسی چوپائے کو دیکھ کر ابھرتی تھی۔ اگلے جانے کتنے روز اس نے انسانوں کو کھانا تھا؟ یہ وہی کچھوا تھا جس نے پہلے پہل انسانی خون چکھا تھا۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ مٹیالے پانی کی وہ دیوار میاں اللہ یار کے ڈیرے کو بھی بہا کر لے گئی اور اپنے پیچھے زرخیز مٹی کی ایک تہہ چھوڑ گئی۔

کہنے والوں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ زلزلے سے پہلے، مسز منصور جب غسل خانے گئیں تو ان کی نظر جنوبی دیوار پہ پڑی، جس پہ سیلن سے روغن کی پپڑیاں سی ابھر آئی تھیں۔ شائد کوئی پائپ لیک کر گیا تھا۔

وہ جو سالوں سے بول ہی نہیں رہی تھیں۔ حلق کے بل چلائیں اور اتنا چلائیں کہ ان کی آواز، عرفان صاحب کے تہہ خانے میں تیرنے والے آبی جانوروں نے بھی سنی۔ وہ ایک آواز پکارے جا رہی تھیں، ''پانی مر رہا ہے، پانی مر رہا ہے۔ اس دیوار میں پانی مر رہا ہے۔''

(۴۲)

جب نازنین اور اسرار بھوریوں سے نکل رہے تھے تو چاند آسمان پہ کھجور کی ٹہنی کی طرح خم دار نظر آ رہا تھا جو ثمروں کے بوجھ سے جھکی جا رہی ہو۔

سب طرف سناٹا تھا۔ وہ سب سو رہے تھے۔ رات کو جاگنے والے اپنے اپنے شکار کی تلاش میں جا چکے تھے، انہوں نے ان دونوں سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

دونوں وہاں سے نکل کر سوچتے رہے کہ آخر ان کو جانا کہاں ہے؟ ان کو بھوریوں پہ رہتے اتنے سال ہو چکے تھے کہ اب انہیں اس دنیا کی، جو ان کے چاروں طرف اتنی تیزی سے آباد ہو چکی تھی کہ میاں اللہ یار کے کھیت صرف ایک پٹی سے رہ گئے تھے، کچھ سمجھ نہیں آتی تھی۔

نہ وہاں وہ ڈیرہ رہا تھا اور نہ ہی گاؤں۔ اس زبردست زلزلے سے بڑی نہر میں شگاف پڑا تھا پورا گاؤں زلزلے اور سیلاب سے نابود ہو گیا تھا۔ کوئی ایک فرد بھی نہیں بچا تھا۔ لیکن یہ پانی ذخیرے کی طرف بہہ گیا تھا۔ زمین کی قدرتی ڈھال اس طرف تھی۔

اس زمین کے مالکان اب کون تھے؟ نہ اسرار کو اس بات سے غرض تھی اور نہ ہی نازنین کو۔ اب ایسا تھا کہ اس زمین کے عین درمیان سے ایک سڑک گزار دی گئی تھی اور سڑک کے دونوں طرف دکانیں اور پختہ مکان بن گئے تھے۔ ان دکانوں اور مکانوں کے پیچھے عجیب بے ڈھب سی آبادی بن گئی تھی۔ جس کی تنگ گلیوں میں گندی کھلی نالیاں تھیں اور ان پہ ہگتے موتتے، میلے ناک بہاتے بچے۔

ان نالیوں کی کالی کیچڑ میں بطخیں چونچیں مارتی تھیں اور آنے جانے والوں پہ گردن لمبی کر کے حملہ آور ہوتی تھیں۔

اس بے ڈھنگی آبادی کے پیچھے چند ایکڑ زمین کاشت ہوتی تھی اور پھر بھوریوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ میاں اللہ یار کا خواب کہ یہاں سوا یکڑ کا ایک بڑا مزرعہ بے شرمندۂ تعبیر نہ ہو پایا۔ زندگی بڑی حیران کن شے ہے اور وقت اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز کیفیت۔

نازنین اور اسرار جب بھوریوں سے نکلے تو ان کے جسموں پہ چند چیتھڑے تھے اور روپے پیسے کے نام پہ ایک ٹکا بھی نہ تھا۔ دونوں سڑک کے کنارے حیران پریشان کھڑے تھے۔ تب ہی ایک راہ گیر نے ان کی طرف ایک سکہ اچھالا۔ تانبے کا سکہ کھن سے اسرار کے پیر کے قریب گرا۔

شام تک کئی نوٹ، سکے اور ریزگاری جمع ہوتی گئی۔ اگلے روز صبح، وہ سارے نوٹ اور سکے لے کر بس میں سوار ہوئے جو انہیں سیدھا بکر منڈی اتار گئی۔ یہاں سے رکشہ لے کر جب وہ نازنین کے ماں باپ کے گھر پہنچے تو رات ڈھلنے والی تھی۔

اتنے برس بیت جانے کے باوجود نازنین ان دونوں کوٹھیوں سے اسی قدر خوفزدہ تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ اب وہ کس حال میں ہیں۔ اسرار نے ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور اس نظر کی دہشت سے وہ کانپ گیا۔ جنگل اپنے پورے جاہ وجلال اور تمکنت کے ساتھ وہاں کھڑا تھا۔ درخت آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور ان کی شاخوں پہ اتنے بڑے بڑے گھونسلے تھے۔

جانے بئیوں، فاختاؤں، کبوتروں، توتوں، میناؤں، چیلوں اور کن کن پرندوں کے۔

اسرار نے نظر جھکا لی، اس سے دیکھا نہ گیا۔ جب یہ سب تھا تو وہ دن جس کا وعدہ تھا، وہ دن کیوں نہیں آ رہا؟ دونوں جھکے، جھکے کوٹھی میں داخل ہوئے۔ روشوں کی اینٹوں پہ ہلکا ہلکا کلر تھا اور لان کی گھاس جگہ جگہ سے گنجی کھدری ہو چکی تھی۔ بوتل پام کے درخت غائب تھے اور گھر کی بیرونی دیواروں کی سفیدی جگہ جگہ سے جھڑ رہی تھی۔

صاحب مر چکے تھے اور مسز منصور بہت ضعیف ہو چکی تھیں۔ مگر ان دونوں کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئیں۔ نظر بہت دھندلی ہو چکی تھی یا شائد وہ جان بوجھ کر ان کے حلیوں کو نظر انداز کر گئیں۔ نہ کوئی سوال کیا نہ کچھ پوچھا۔ گھر میں اب بھی دو ملازم تھے۔ منصور صاحب بہت اندوختہ چھوڑ کر گئے تھے اس لئے زندگی چل رہی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد وہ نازنین کو اپنے کمرے میں لے گئیں۔ اسرار بے مقصد پورے گھر میں گھومتا رہا۔ کمرے، راہداریاں، بالکونیاں۔ نازنین بہت امیر ماں باپ کی لڑکی تھی۔ اسے تأسف ہوا۔ اس کے ساتھ ہونے کی وجہ سے اس نے بھی عجیب مصیبتیں بھوگیں۔ زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ یہ تکلیفیں برداشت کرنے کا کوئی نتیجہ بھی سامنے نہیں آ رہا تھا۔

وہ ایک راہداری سے چلتا ہوا ایک پچی نما جگہ پہنچا تو اس نے دیکھا کہ نازنین اور مسز منصور کھڑی ہیں اور مسز منصور اپنی شہادت کی انگلی سے دیوار کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

''وہ دیکھو نازنین!'' ان کی آواز کسی سرگوشی سے مشابہہ تھی، ''پانی مر رہا ہے۔ یہ گھر کسی بھی وقت گر جائے گا، میں نے منصور صاحب کو بھی بتایا، اس رات جب زلزلہ آیا، اس رات بھی بتایا اور بعد میں بار ہا۔ مگر انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ دیکھو یہ ساری دیوار پہ سیم چڑھ آئی ہے، پلستر بھی جھڑ گیا ہے اور یہ اینٹیں، یہ بھی کب تک کھڑی رہیں گی؟ عرفان صاحب کے تہہ خانے میں جو پانی کھڑا ہے نا، وہ ہی پانی ہے یہ۔''

اسرار خاموشی سے دیکھتا رہا۔ دیوار واقعی گرنے والی تھی اور اگر یہ دیوار گرتی تو اس سے ملحقہ دیواریں، چھتیں سبھی گرتے۔ کیا تب یہ کوٹھی بھی عرفان صاحب کی کوٹھی کی طرح جنگل بن جائے گی؟

پھر اسے میاں اللہ یار کی زمین یاد آئی، کیا وہ جنگل بنی؟ وہاں تو انسان ہی انسان بس گئے تھے۔

کلبلاتے ہوئے کیڑوں جیسے انسان۔ناک بہاتے، روتے پیٹتے انسان اور ان انسانوں کے فضلے اور بول وبراز سے اور ان کی پھیلائی آلودگی سے سب کھیت برباد ہو گئے۔لیکن کیا ان کھیتوں کا ہونا بھی بربادی نہ تھی؟ تو پھر وہاں کیا ہونا چاہیے تھا؟ صرف اللہ یار کے کھیت اور بھوریاں؟ کیا تب توازن قائم تھا؟

سوچتے سوچتے اس کا دماغ چکرا گیا۔ چونکہ پلنگ بستروں پہ سونے کا وہ عادی نہیں رہا تھا اس لئے وہیں ایک خالی سی جگہ دیکھ کے فرش پہ سو گیا۔

صبح جب نازنین نے اسے جگایا تو دن خوب چڑھ آیا تھا۔ نازنین نے اس سے پوچھا کہ اب کیا کرنا ہے؟ شہر جیسا تھا ویسا ہی ہے۔ رات بھر اس نے ٹیلی ویژن پر پوری دنیا کی خبریں دیکھی ہیں۔ سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا وہ چھوڑ کر گئے تھے۔

اگر کوئی فرق پڑا تھا تو اتنا کہ اس گھر کی جنوبی دیوار میں پانی مر رہا تھا اور یہ تو اکثر گھروں میں درست چنائی نہ ہونے کے باعث ہو ہی جاتا ہے۔

کئی دن وہ دونوں اس گھر کی آسائش میں بولائے بولائے پھرے۔ پھر آہستہ آہستہ ان کے آرام کوش جسموں نے اچھی خوراک، نرم لباس اور آرام دہ بستروں کی راحت پائی اور چند ہی دنوں میں وہ شکم سیر بلونگڑوں کی طرح انجر پنجر پھیلا کر خرخرانے لگے۔

نازنین کے بال جو بھوریوں میں رہتے رہتے جونا بن گئے تھے، پھر سے ریشم کے ڈھیر کی طرح سرسرانے لگے۔ ہاتھ پاؤں، ناخن سب چمک اٹھے اور جب رات کو وہ اپنے پرانے کپڑے پہن کر کھانے کے کمرے میں آتی تو اسے اور اسرار کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی دونوں ہیں جو چند ماہ پہلے ژولیدہ مو، برہنہ پا، افتاں وخیزاں ایک رکشے سے برآمد ہوئے تھے۔

مسز منصور کے مشورے سے انہوں نے شادی کا بھی سوچا۔لیکن نازنین کا خوف اب بھی دور نہیں ہوا تھا۔ وہ ان بچوں کو، جن میں اس کی رخسانہ بھی شامل تھی اور جانے اب وہ بھوریوں میں کیسے رہ رہے تھے، رہ بھی رہے تھے یا نہیں؟ بھول نہیں پائی تھی۔

اکثر راتوں کو چیخ مار کے وہ اٹھ بیٹھتی تھی۔ اسے رخسانہ، منظور کی لڑکی، فضل الٰہی اور وہ سب یاد آتے تھے۔ اسرار اسے سمجھاتا تھا کہ وہ سب ایک گورکھ دھندہ تھا۔ ایک ایسی گتھی، جسے سلجھانا ان کے بس سے باہر تھا۔ جو کچھ وہاں ہو رہا تھا اور جو کچھ مزید ہونا تھا اس کا منصوبہ، جس نے بنایا تھا وہ ہی جانتا تھا کہ اس نے ان جانداروں کا کیا کرنا ہے؟ یا وہ جو زلزلے سے پیدا ہونے والی دراڑ میں گر کر مر گئے تھے، وہ جانتے تھے کہ اب آگے کیا ہونے والا ہے مگر ان میں

سے کوئی بھی باقی نہیں رہا تھا اور اسرار کے اندر وہی اسرار سر اٹھا رہا تھا جو سالوں پہلے، جب میاں اللہ یار زندہ تھا تو بھوریوں کو آباد کرنے کے ارادے سے، ہنستا اٹھا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ اس گھر کے پر آسائش ماحول میں وہ اور نازنین دو عام اور معمولی انسانوں کی طرح عام زندگی گزاریں۔ اس کے فوطوں میں آنے والی نسلوں کے اربوں جرثومے کلبلا رہے تھے اور وہ اپنے ہونے کا تسلسل قائم رکھنا چاہتا تھا۔

جب وہ بھوریوں کو آباد کرنا چاہتا تھا تب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ عرفان صاحب کی اولاد ہے۔ چونکہ وہ عرفان صاحب سے، ان کے سب نظریوں سے اور ان کی جمع کی ہوئی مخلوقات سے ایک بار پھر منحرف ہو چکا تھا تو نہیں چاہتا تھا کہ اس کے اور نازنین کے درمیان ویسا ہی تعلق بنے جیسا کہ عرفان صاحب اور مدھومتی بترا عرف زینب بترا کے درمیان بنا تھا۔

یہاں رہتے رہتے بھی انہیں بہت عرصہ ہو گیا۔ نازنین رخسانہ کو یاد کر کر کے روتی تھی اور اسرار اپنے اندر بھرے اپنی بقاء کے جذبے سے بولایا بولایا، سارے گھر میں ہراساں سا پھرتا تھا۔

ان ہی دنوں مسز منصور کی دور پار کی رشتے دار اپنی شادی کا بلاوا دینے آئیں۔ یہ شادی عجیب تھی۔ ساری دنیا چھوڑ کے مالدیپ کے ایک افتادہ غیر آباد جزیرے پہ منعقد کی جانے والی شادی۔ جس میں کوئی شے ایسی نہیں ہوگی جس سے فطرت کو نقصان پہنچے۔ لباس، خوراک، آرائش، تزئین، سنگھار، سب کا سب ایسا رکھا گیا تھا کہ اس میں سب کچھ دوبارہ زمین کا جزو بن سکتا تھا۔

دعوت نامہ بھی ایک عجیب سے پتے پہ لکھا گیا تھا اور دولہا دلہن دونوں بالکل عرفان صاحب کی سی بہکی بہکی باتیں کر رہے تھے۔ دولہا کو مونگے کی ان چٹانوں کی فکر تھی جن پہ مالدیپ کے ہزاروں جزیرے بنے ہوئے تھے۔ وہ اپنی بیٹھی بیٹھی آواز میں مسلسل بتا رہا تھا کہ چند سال قبل یہ مونگے مرنے شروع ہو گئے تھے، پھر ان میں خاص طرح کے برقی سیل لگائے گئے تھے جس سے یہ دوبارہ تندرست ہو گئے۔

یہ بتاتے ہوئے وہ بار بار اپنے پنجوں پہ آگے کی طرف جھومتا تھا اور اس کی قمیض اس کے مدور پیٹ پہ سے اچک جاتی تھی۔ پاجامہ جو کہ سن کے ریشوں سے بنا ہوا تھا، بار بار کھسک کر اسے بے طور عریاں کر رہا تھا۔

نازنین بہت دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھی، اسی نے بتایا کہ پچھلے دنوں قطب شمالی میں موجود ایک بہت بڑا ابر فانی تودہ الگ ہونا شروع ہوا ہے اور چند ہی سال میں وہ ٹوٹ کر بالکل ہی الگ ہو جائے گا اور قطب شمالی پر جمی ساری برف کا وجود ختم ہو جائے گا۔

اسرار کو اس شخص سے سخت نفرت محسوس ہو رہی تھی، یہ سب باتیں وہ سن چکا تھا، سہم بھی چکا تھا اور جانے اس سے پہلے کتنوں نے سنی تھیں۔ لیکن ان دونوں کے جانے تک نازنین تہیہ کر چکی تھی کہ وہ اور اسرار اس شادی میں شرکت کریں گے۔

اسرار نے اسے بہت سمجھایا لیکن اسے ایک ہی دھن سوار تھی کہ وہ ان لوگوں کی شادی میں جائے گی۔ اسرار کا اس دنیا میں نازنین کے سواء کون تھا؟ کالج، یونیورسٹی وہ سب بھول چکا تھا۔

اسے بس یہ یاد تھا کہ بس وہ اور نازنین اس گھر میں رہ رہے ہیں۔ اس گھر کے باہر کی دنیا اور وہ دنیا جس سے کبھی اس کا بڑا گہرا ناطہ تھا، اس کے لئے بالکل اجنبی ہو چکی تھی۔

وہ نازنین کے ساتھ گھسٹتا گھسٹتا اس ویران جزیرے پہ پہنچا تو خوف کے مارے اس کے سر میں سے پسینہ بہہ نکلا۔ یہ جزیرہ جو آدھے کلومیٹر سے بھی کم عریض اور شائد اتنا ہی چوڑا تھا، بالکل بھوریوں جیسا تھا۔ ویسے ہی درخت، پیپل، برگد اور جل کنبھی سے ملتی جلتی کسی چوڑے پتوں والی بیل سے بھرا ساحل، گرگٹ، چھپکلیاں، گوہیں، عجیب عجیب پرندے اور ایک کوئل، جو نا جانے کہاں چھپ کر ایک ساں بولے جا رہی تھی۔

سفید کیکڑے جو ساحل پہ بنے ہزار ہا سوراخوں سے نکل کر ایک بیگانہ حیرت میں انسانوں کی طرف دوڑ رہے تھے اور عرفان صاحب جیسے بے وقوف انسانوں کا گروہ، جو عجیب، غریب لباس پہنے حیرت اور خوشی سے، ان مخلوقات پہ فدا ہوا جا رہا تھا۔ یہ لوگ سبزی خور تھے اور ان کے کپڑے جوتے، کسی بھی چیز کے بننے میں کسی بھی جانور کو نقصان نہیں پہنچایا گیا تھا اور نہ کسی طرح کا کیمیائی عمل ہوا تھا۔

ان کے بال سمندری گھاس کی طرح بے ترتیب تھے اور ان میں سے اکثریت بھنگ بھی پیتی تھی۔ اسرار کو انہیں دیکھ کے ہپی یاد آئے۔ وہ ان کی باتیں سن کر بہت ہنسا۔

شادی بھی کیا تھی؟ دونوں نے اس وقت تک ساتھ رہنے کا عہد کیا جب تک ان کا دل چاہے گا اور ان میں سے جو جب چاہے گا راستہ بدل سکتا تھا اور اس سے ان کے باہمی انسانی تعلق پہ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

اسرار کو یہ سب قطعاً حرام کاری اور عیاری لگ رہا تھا۔ یہ لوگ لازمی کسی مار پہ تھے۔ نازنین سادہ تھی اسے خبر نہیں تھی لیکن اسرار جانتا تھا کہ یہ گروہ کسی لمبی شیطانی میں ملوث تھا لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ نازنین مکمل طور پہ ان لوگوں کے کہے میں آ چکی تھی۔ ان سب کا خیال تھا کہ انسان ماحول کے ساتھ بہت ناروا سلوک کر چکا ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ اس کا مداوا کیا جائے۔

اسرار دل ہی دل میں قہقہے لگا رہا تھا۔ ایک اور ڈھکوسلا ایک اور فریب، انسان بڑا شاطر ہے۔ کسی نہ کسی بہانے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ صدیوں کی ناانصافیوں کا ازالہ کر دے گا؟ فطرت اسے معاف نہیں کرے گی!!

اس رات آسمان پہ اتنے تارے دکھائی دیئے کہ اسرار بھی چکرا گیا۔ پھر اس نے کئی ٹوٹتے تارے دیکھے۔ آتش بازی کی پھلجھڑی کی طرح آسمان پہ ٹوٹتے ہوئے شہابیے اور سمندر کے ہلکے نیلے پانی میں بڑی بڑی رے مچھلیاں دیکھیں، جو بالکل ذخیرے کی بڑ ہا نگوں کی طرح تیر رہی تھیں۔ خاموش، اداس، کسی سوچ میں گم اور چھوٹی چھوٹی مچھلیاں جن کی دمیں فرانسیسی جالی کی بنی ہوئی لگ رہی تھیں اور ان کے جسموں پہ آڑی ترچھی رنگین لکیریں اور

نقطے اور جانے کیا کیا نمونے بنے ہوئے تھے۔

اسرار کے پیروں کے پاس سفید کیکڑے دوڑے پھر رہے تھے اور سمندر کی ساکن سطح کے نیچے ہلکی نیلی روشنی سی ابھر رہی تھی۔ ناز نین اس کے قریب سفید ریت پہ آ کے بیٹھ گئی۔ تب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ ریت نہیں، یہ تو مونگے کی چٹانوں اور سیپیوں کا چورا ہے۔ ناز نین اسے بتاتی رہی کہ یہ لوگ جنگلی حیات کو بچانے کے لئے کیا کیا کر رہے ہیں۔ ناپید ہونے والی نسلوں کے بچے کھچے جانوروں کو دوبارہ بسانے کے لئے دنیا کے دور دراز علاقوں میں جا رہے ہیں۔ مچھلیوں کی نایاب نسلیں، کچھوے، کیکڑے، حتیٰ کہ سانپوں میں پھیلنے والی ایک پھپھوندی نما بیماری سے لڑ رہے ہیں کیونکہ یہ ماحول کو بچانا چاہتے ہیں۔

اسرار ناز نین کو کیا کہتا؟ ناز نین کے ہاں ایک جل پری پیدا ہوئی تھی جسے وہ عرفان صاحب کے وعدے پہ بھوریوں میں لے گئے تھے۔ پھر کیا ہوا؟ اس جزیرے کی طرح، آج رات ان بھوریوں پر بھی وہ سب، جوان گنت ہیں، منتظر ہوں گے، انسان کی موت کے۔ جیسے یہ سمندر، یہ مچھلیاں، مونگے کی چٹانوں میں رہنے والے تمام آبی جانور اور وہ جن کے رینگنے اور دوڑنے سے جزیرے کی ریت پہ جھریاں اور لکیریں سی بن گئی تھیں، وہ سب منتظر تھے کہ کب یہ خود غرض مخلوق جس نے ان سے ان کی دنیا چھین لی، ناپید ہو جائے۔

اسرار نے ناز نین کا ہاتھ تھاما تو اس نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اسرار نے غور سے دیکھا، آگے سمندر تھا۔ سمندر جانتا ہے۔ سارا پانی دو فٹ پیچھے چلا گیا تھا اور ہوا پھونک مارنے کو ایک لمبی سانس لے کے ساکت ہوئی بیٹھی تھی۔ جزیرے کی ریت پہ رینگنے والے درختوں کے تنوں سے چمٹ گئے تھے۔ سمندر اپنی آخری جنگ لڑنے کے لئے تیار تھا اور ساحل پہ انسان، پانچ فٹ کا بونا، سر پہ سمندری گھاس جیسے بال بکھرائے اپنی بقاء کے لئے نہتا کھڑا تھا۔

اسرار کو لگا سمندر خشکی پہ چڑھ آئے گا۔ ناز نین کو بھی ایسا لگا اور شائد سمندر نے خود بھی کچھ ایسا ہی سوچا ہو لیکن اس رات ٹوٹتے ہوئے تاروں کی روشنی میں اسرار کو معلوم ہوا کہ سب بے فائدہ ہے۔ برہنہ جسم پہ ٹوٹی ہوئی سیپیوں اور گھونگھوں کی کرچیاں چبھ رہی تھیں اور آسمان کے سب دروازے بند تھے۔ فرشتے شیطان پہ آگ کے گولے پھینک رہے تھے کہ کہیں وہ اس بڑے منصوبے کے بارے میں نہ سن لے، جس پہ بات جاری تھی۔

بھوریوں میں، ذخیرے میں، اس جزیرے پہ اور جہاں جہاں بھی مخلوقات منتظر تھیں، منتظر رہیں۔ اس رات اسرار اور ناز نین رات گئے تک ساحل پہ بیٹھے رہے۔

پھر رات کے دوسرے پہر ناز نین نے اس کا ہاتھ پکڑا اور وہ سمندر میں اتر گئے۔ پیروں کے نیچے مونگے اور سیپیوں کا سفید چورا تھا اور ننھی ننھی مچھلیاں حیرت اور خوف سے ان کے جسموں کے قریب آتی تھیں اور پھر اپنی دموں کو زوردار جنبش دے کر مخالف سمت تیر جاتی تھیں۔

پانی ہلکا کوسا، کنکنا سا تھا۔ اسرار جو کب سے ناز نین کا قرب چاہتا تھا جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ اس کے جسم کے سب مساموں سے پسینہ پھوٹ بہا تھا اور نمکین پانی اس کی جلد کو جلا رہا تھا۔

" کچھ دیر پہلے ایسا لگ رہا تھا طوفان آئے گا، بے ناسرار؟ نازنین کے دل کے کسی گوشے میں بار بار یہ خواہش ابھر رہی تھی کہ کاش وہ رخسانہ کو بھی ساتھ لے آتی اور اسے یہاں ان پانیوں میں چھوڑ دیتی۔ وہ سب جاری جو بھوریوں کی سرمئی ریت میں میٹھے پانی کے اس ذرا سے ٹوبے میں ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھی رہتی تھی، اس سے کنار سمندر میں کیسے مزے سے تیرتی۔

تب اسے خیال آیا کہ کیا واقعی اس کے گھر کوئی جل پری پیدا ہوئی تھی؟ جس کا نام اس نے رخسانہ رکھا تھا، یا یہ بھی ایک وہم تھا؟ کیا واقعی یہاں سے ہزاروں میل دور، ریت کے ٹبے، ٹیلوں اور ٹیکریوں کا کوئی سلسلہ موجود تھا، جس میں ہزار ہا شکر خورے اور پرندے، ہریل، فاختائیں، چنڈور، نیل کنٹھ، مینائیں اور بلبلیں اور عجیب عجیب حشرات الارض اور میٹھے پانی کی مخلوقات بستی تھیں؟ جنھیں ایک نیم دیوانے انسان نے صرف اس لئے بچایا تھا کہ وہ سوچتا تھا کہ دریا واپس آئے گا۔

اس کے خیال میں سیانا آدمی کبھی سانپ کی لکیر اور دریا کے راستے پہ پاؤں نہیں دھرتا اور وہ ساری عمر انتظار کرتا رہا کہ دریا پلٹ کر آئے گا۔ یہاں تک کہ ایک زور کا زلزلہ آیا اور زمین میں ایک بڑی دراڑ نمودار ہوئی جس میں وہ اور اس کی باتوں کو ماننے والے سب لوگ زندہ درگور ہو گئے۔

نازنین یہ سب سوچ کر چکرا گئی۔ اس نے اپنے چاروں طرف پھیلے سمندر کو دیکھا، جو اتنا نیلا، اتنا صاف، اتنا پاکیزہ تھا، جیسا روزِ ازل خدا نے بنایا تھا۔ اس کا دل چاہ کہ اس نیلے پانی کی چادر پہ لیٹ جائے، ایک جل پری کی طرح۔ پھر اسے خیال آیا کہ شائد واقعی اس کے ہاں جل پری پیدا ہوئی تھی اور شائد انسان پہلے کسی عہد میں جل پری رہا تھا ورنہ اسے یہ خیال کیوں آتا کہ وہ اس نیلے سمندر میں لوٹ جائے، جینیاتی یادداشت؟

ان پاگل کر دینے والی سوچوں کے درمیان اس نے چاہا کہ اسرار کو تھام لے مگر اسرار سمندر سے خوفزدہ، اپنے پیروں سے لپٹتی سفید مونگے کی کرچیوں اور ذروں سے گھبراتا، کیکڑوں اور مچھلیوں سے ڈرا، ساحل کی طرف فرار ہو رہا تھا۔ اسے کس بات کا خوف تھا؟

نازنین اس کے پیچھے دوڑی تا کہ اسے پانی میں واپس گھسیٹ لائے۔ اب اسرار کو کس بات کا خوف تھا؟

مگر وہ دیوانہ وار ساحل کی طرف دوڑا اور جب وہ پانی کی حد سے دور نکل گیا اور ساحل پہ سر پٹختی، ننھی سے ننھی سفید لہر بھی، اس کے پیروں کو نہ چھو سکتی تھی تو وہ اوندھے منہ ساحل پہ جا گرا۔ اسی طرح جیسے زمانہ قدیم سے انسان اپنے ان دیکھے خداؤں کے سامنے گرتا آیا ہے اور جیسے اس رات زلزلے کے صدمے سے وہ سب گرے تھے اور پھر اس دراڑ میں گر کے نابود ہوئے تھے۔

اسرار ساحل پہ گرا، کسی مچھلی کی طرح منہ کھول کے گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ ہوا چلنی شروع ہو گئی تھی اور مغرب کی طرف سے کالے بادلوں کا ایک دل، آسمان کو اور اس پہ فروزاں تاروں کو ڈھانپنے، چلا آ رہا تھا۔ کیکڑے، گھبرا گھبرا کے، اسرار کے ٹانگوں اور بازوؤں پہ سے ہوتے ہوئے اپنے اپنے بلوں کی طرف، دیوانہ وار، دوڑ

رہے تھے۔

نازمین پانی سے نکل کر جھلائی ہوئی تھی، مگر اسرار کی حالت دیکھ کر چونک گئی۔ اسرار کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور وہ ایسے کانپ رہا تھا جیسے اس کے دل پہ ازل سے نظر آنے والی تجلیوں میں سے کسی ایک آگہی کا نزول ہو گیا ہو۔ وہ سچ، جسے عرفان صاحب سالہا سال بھوریوں کی ٹیکریوں پہ چڑھ چڑھ کے، آسمان کی طرف، سر اٹھا اٹھا کر کھوجتے رہے تھے، آج اسرار پہ کھل گیا تھا اور اس کے خوف سے وہ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ اس کے پھیپھڑے اور دل اس بات کے وزن کے تلے پس گئے تھے اور اس کے ہونٹ کے کنارے سے خون کی ایک پتلی سی لکیر جزیرے کی سفید ریت میں جذب ہو رہی تھی۔ آخر انسان کے زمین سے جو بھی رشتے ہیں، ان میں سب سے مضبوط رشتہ قبر ہی کا تو ہے۔ وہ جب کسی جگہ کو آباد کرنا چاہتا ہے تو اس مٹی میں اپنی ہڈیاں بو دیتا ہے اور پھر اس کی نسلیں، ان ہڈیوں سے بندھ کر وہیں کی ہو رہتی ہیں۔

اسرار بھی شائد مر رہا تھا۔ نازمین نے قریب ہو کر سنا وہ بڑبڑایا تھا،'' نازمین! سچ، جسے عرفان صاحب نہ پا سکے اور خود کو ہم سب کو دھوکا دیتے رہے، انسان کے اندر قائم اس اُمید کو پالتے رہے کہ وہ سب بگاڑ دے گا اور خدا ایک عذاب لا کے اسے ختم کر دے گا اور کسی طرح اس کی نسل کو بچا لے گا۔ دھوکا تھا، ایک طفل تسلی۔ جو انہوں نے خود کو بھی دی اور ہم کو بھی۔ سچ یہ ہے نازمین کہ پانی مر رہا ہے مسز منصور سچ کہتی ہیں، پانی مر رہا ہے!''

اسرار اس رات نہ مرا۔ اس کے بعد آنے والی کئی راتوں میں بھی نہ مرا۔ اس ویران جزیرے پہ اس کی نسل، گرگٹ کے بچوں کی طرح، پلی بڑھی اور آباد ہوئی۔ وہاں سے نکل نکل کر، کہاں کہاں گئی اور جانے کیا کیا کیا؟

اندر ہی اندر سب منتظر ہیں کہ ایک دن یہ سب ٹھیک ہو جائے گا، پانی لوٹ آئے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا اور ان کے بعد بھی ان کی نسل چلتی رہے گی۔ اسرار اور نازمین نے اپنے منہ سی لئے اور کسی کو بھی نہیں بتایا کہ پانی مر رہا ہے۔ اور صدیاں گزر گئیں۔ پانی آج بھی مر رہا ہے!!

(رات ڈیڑھ بجے، مالدیپ، ۲۷ دسمبر ۲۰۱۷ء)

○○○

8:30 PM
[illegible]

"پانی مر رہا ہے" ایک ایسی کہانی ہے جس میں ہماری مٹی کی باس بھی ہے اور ہمارے مرتے دریاؤں کا عکس بھی۔ اس میں قیامت کی وہ نشانیاں ہیں جو قیامت گزر جانے کے بعد ہی نظر آتی ہیں۔

زہر اور شہد کا ذائقہ لئے اس ناول کو پڑھ کر آپ اپنے ماحول، ارد گرد پھرتے انسانوں اور چرند پرند کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

محمد حنیف